شمارہ ۳۴، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۷ء

ترتیب: حسنین سیالوی

شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی، جامشورو

فہرست مشمولات

ABSTRACTS

Urdu Tazkarey and Religious Scholars of 19th Century.

Tazkarey are one of the main sources for gathering basic information about literary history. These pieces of information are so important for the researchers.

In 19th Century, there were many religious scholars who had flair for poetry and they played their role to promote the tradition of Urdu poetry. Many of these religious scholars came two light because of the tazkaras of 19th Century. This article provids information about these religious scholars who have been mentioned in different tazkaras of 19th Century.

ڈاکٹر شذرہ شر

انیسویں صدی کے اردو تذکرے اور علمائے دین

(ا)

تذکرہ عربی زبان کا لفظ ہے۔اس کے لغوی معنی یادداشت، بیان، یادگار، ذکر یا چرچا، افواہ، بات چیت، اجازت نامۂ سفر پروانۂ راہ داری، پاسپورٹ اور اس سے متعلق رسید وغیرہ کوئی نشانی یاد رکھنے کے لیے جیسے رومال کو گانٹھ دینا وغیرہ کے ہیں۔[۱] لغت کی رو سے اصطلاح شعر وادب میں احوالِ شعرا سے متعلق کتاب کو تذکرہ کہا جاتا ہے۔[۲] شعر وادب کے سیاق وسباق سے ہٹ کر اس لفظ کا استعمال علما، فضلا، صوفیا، اطبا، اولیا اور حکما کے احوال کے لیے بھی کیا جاتا ہے۔ اصطلاحی معنی میں، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، تذکرے سے مراد ایسی کتاب ہے جس میں شعرا کے مختصر احوال اور منتخب کلام بطور نمونہ درج کیا گیا ہو۔ سوانحی حالات کی ذیل میں شاعر کا نام، تخلص، جائے پیدائش وقیام، علمی وفنی استعداد، شاگردی واستادی کے سلسلے وروابط، افتادِ طبع، تصنیفی وتالیفی کارنامے، کلام کے معیار ومذاق کے بارے میں ابتدائی قسم کی ضروری معلومات درج کی جاتی ہیں۔[۳] یعنی تذکرے کے دو بنیادی عناصر ہیں۔ ایک مختصر حالات اور دوسرا منتخب کلام۔ عام طور پر تذکروں میں بہ لحاظ حروف تہجی شعرا کے تخلص مرتب کیے جاتے ہیں۔ نمونۂ کلام کے ذیل میں اکثر متفرق غزلوں کے منتخب اشعار اور کبھی دیگر اصناف سخن کے منتخب نمونے بھی دیئے جاتے ہیں۔ انتخابِ اشعار تذکرہ نگار کے شعری مذاق کا عکاس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے تذکرہ نگاری کے محرکات کے ذیل میں جن امور کو بیان کیا ہے اس میں اپنی یادگار چھوڑنے کا فطری جذبہ، بیاض نگاری اور انتخاب اشعار کا شوق، شعرا کی معاصرانہ چشمک، مشاعروں کا رواج اور اردو شاعری کی مقبولیت شامل ہیں۔

شعرائے اردو کے تذکرے کئی وجوہات کی بنا پر اردو ادب میں اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو میں ادبی تنقید کی داغ بیل تذکرہ نگاروں کے ہاتھوں پڑی۔ ۴ بقول پروفیسر نورالحسن نقوی ''اردو میں تنقید کے اوّلین نقوش تذکروں میں ملتے ہیں۔ اگرچہ انھیں باقاعدہ تنقید نہیں کہا جاسکتا لیکن ان کی ادبی، تاریخی، تنقیدی اہمیت مسلم ہے۔'' ۵ ادبی سوانح نگاری کے ابتدائی نقوش بھی تذکروں میں ملتے ہیں بقول فرمان فتح پوری ''ولی کے عہد سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر تک شعرا کے متعلق جو واقعات و حالات سامنے آئے ہیں ان سب کا سرچشمہ یہی تذکرے ہیں۔'' ۶ اردو زبان و ادب کے کئی ارتقائی مدراج و مراحل کا سراغ بھی انھیں تذکروں میں ملتا ہے۔ یوں یہ تذکرے ادبی تاریخ نگاری کے لیے بنیادی معلومات کی فراہمی کا ایک ذریعہ ہیں۔ بقول مولوی عبدالحق:

''ہمارے شعرا کے تذکرے گو جدید اصول کے مطابق نہ لکھے گئے ہوں تاہم ان میں بہت سی کام کی باتیں مل جاتی ہیں جو ایک محقق اور ادیب کی نظروں میں جواہر ریزوں سے کم نہیں۔'' ۷

تذکروں کی عمرانی و تاریخی اہمیت بھی ہے۔ متعدد تذکروں میں شعرا کی آشفتہ حالی، ترک وطن، نئی پناہ گاہوں کی تلاش میں سرگردانی کا ذکر ملتا ہے۔ ایسے واقعات و بیانات مختلف زمانوں کے سیاسی و اقتصادی مسائل، تہذیب و معاشرت اور رسوم و رواج کے مطالعے میں بھی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ۸

تذکروں کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ ان کی بدولت بہت سے ایسے شعرا گم نام ہونے سے بچ گئے جن کے کارنامے مدون نہ ہو سکے یا پھر مدون ہونے کے بعد ضائع ہو گئے۔ ایسے شعرا میں مصطفیٰ خاں یک رنگ، خان آرزو اور مظہر جانِ جاناں جیسے اساتذہِ فن بھی شامل ہیں، ان کا شعری سرمایہ تذکروں سے ہی حاصل ہوا ہے۔ ۹

انیسویں صدی کے کئی علمائے دین شاعری کا ذوق رکھتے تھے اور صاحب دیوان اردو شاعر تھے انھوں نے شعری روایت کو پروان چڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ ان میں سے بیش تر علمائے کرام انیسویں صدی کے اردو شعرا کے تذکروں کی بدولت بحیثیت شاعر گم نام ہونے سے بچ گئے۔ آئندہ صفحات میں ان علمائے دین کا ذکر کیا جائے گا جن کا ذکر انیسویں صدی کے اردو شعرا کے تذکروں میں کیا گیا ہے۔

(۲)

غلام جیلانی رفعت: (۵۴-۱۱۵۳ھ/۱۲۳۴ھ-۱۸۱۸ء)

مولوی غلام جیلانی نے اردو اور فارسی میں شاعری کی۔ پہلے ''بیدم'' تخلص تھا بعد میں ''رفعت'' تخلص اختیار کیا۔ ۱۰ قدرت اللہ شوق سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۱ محمد عبدالحیٔ بدایونی نے ''تذکرہ شمیم سخن'' میں لکھا ہے کہ: ''بعض تذکرہ نویسوں نے آپ کو مولوی قدرت اللہ شوق کا شاگرد لکھا ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ فنِ شعر میں آپ کو کسی سے تلمذ نہ تھا مولوی قدرت اللہ شوق اور حضرت رفعت باہم دیگر جلیس و رفیق تھے۔'' ۱۲ تذکرہ ''سخن شعرا''، تذکرہ ''انتخاب یادگار'' اور تذکرہ ''شمیم سخن'' میں مولوی غلام جیلانی رفعت کے درج ذیل اشعار میں موجود ہیں۔

لباس صبر مرے دل پہ اس روش ہے تنگ　　کہ جیسے تیری قبا میرزا منش ہے تنگ

بہتی ہے زور و شور سے اپنی مدام چشم　　اک بحر ہے عظیم کہ جس کا ہے نام چشم ۱۳؎

ہوں میں وہ مرغ چمن بعد اسیری　　بال و پر توڑ کے کرتا نہیں صیاد پسند

گرچہ پامال کیا تھا مجھے رفتار نے لیک　　کر دیا عشق نے اس قد کے مرا نام بلند

کچھ نہیں ہم ہیں بغیر از دل سوزاں رفعت　　پیرہن صورت فانوس نظر آتا ہے

مدت ہوئی کہ نالۂ موزوں نہیں سنا　　کوچے سے تیرے رفعت کدھر گئے ۱۴؎

''انتخابِ یادگار'' میں مولوی غلام جیلانی کے واسوخت کے درج ذیل دو بند بھی موجود ہیں:

کیا عجب دن تھے کہ وصلِ یار حاصل تھا ہمیں　　بے خلش اغیار کے دیدار حاصل تھا ہمیں

سیر گل اور جامِ مل ہر بار حاصل تھا ہمیں　　ساز عیش و نغمۂ سرشار حاصل تھا ہمیں

یاد آن روز یہ کہ درمیخانہ منزل داشتیم　　جامِ مے بردست و جاناں در مقابل داشتیم

اب وہ صورت ہے جدائی اور تنہائی سے آہ　　پیش و پس کوئی نہیں ہے یاں بجز ذات الہ

مونس و غم خوار بھی اپنے ہوئے اک اک تباہ　　اب نہیں آتا نظر کوئی جدھر کیجیے نگاہ

آں کہ می سوزد بدرومن دلش جانِ من است　　وآں کہ می گرید بحالم چشم گریان من است ۱۵؎

الٰہی بخش کاندھلوی نشاط:(۱۱۶۲ء۔۱۲۴۵ء)

مفتی الٰہی بخش صاحب دیوان شاعر تھے۔اردو، عربی، فارسی تینوں زبانوں میں شاعری کی، تخلص نشاط تھا۔نعتیہ شاعری کے علاوہ عشقیہ اشعار بھی کہے۔علم قرأت کے اصول وفروع اور نماز کے فرائض وواجبات، سنن ومستحبات کو دو منظوم اردو رسالوں میں بیان کیا۔۱۶؎ اس کے علاوہ مثنوی معنوی کے دفتر اوّل کے ایک ہزار اشعار کا منظوم اردو ترجمہ کیا۔ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے مولوی ابوالحسن نے مزید ایک ہزار اشعار کا منظوم اردو ترجمہ کر کے دفتر اوّل کو مکمل کیا۔۱۷؎

مفتی الٰہی بخش کا کلام آورد سے پاک ہے۔انھوں نے قلبی واردات کو سادگی ودل کشی سے بیان کیا۔بیش تر اشعار میں سہل ممتنع کی خوبی بھی پائی جاتی ہے۔نصر اللہ خویشگی نے اپنے تذکرے ''گلشن ہمیشہ بہار'' میں مفتی الٰہی بخش کا ذکر کیا ہے اور مثنوی کے درج ذیل اشعار درج کیے ہیں:

بشنواز نے چوں حکایت می کند　　وز جدائی با حکایت می کند

سنیو نے سے کیوں حکایت کرتی ہے　　اور جدائی سے شکایت کرتی ہے

کز نیستان تا مرا ببریدہ اند　　از تفیّرم مردوزن نالیدہ اند

جب سے کی ہے کاٹ کر تن سے جدا | جس کے منہ لگتی ہے نالاں ہے صدا
سینہ خواہم شرح شرح از فراق | تا بگویم شرح دردِ اشتیاق
پارہ پارہ کر یہ سینہ اے فراق | تا کہوں بے خود ہو دردِ اشتیاق
ہر کسے کون دورماند از اصل خویش | باز جوید روزگار وصل خویش
جس کو ہووے شوق اپنی اصل کا | کیوں نہ ڈھونڈے وہ زمانہ وصل کا
سرّ من از نالۂ من دور نیست | لیک چشم و گوش راآں نور نیست
راز دل نالے سے میرے دور نہیں | پر ترے کانوں کے تئیں وہ نور نہیں
تن ز جان و جاں زتن مستور نیست | لیک کس رادید جاں دستور نیست
جان و تن میں گو نہیں ظاہردوئی | دیکھ کب سکتا ہے ہر جی کو کوئی
آتش است اس بانگ نائی نیست باد | ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد
آگ ہے آواز نے کی نے کی باد | جس کو یہ آتش نہیں ہے نامراد ۱۸

شاہ رؤف احمد رافت: (۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء۔۱۲۴۹ھ)

شاہ رؤف احمد نے اردو اور فارسی میں شاعری کی، تخلص رافت تھا، شاعری میں جراُت کے شاگرد تھے۔۱۹ شاہ رؤف احمد عروض وقوافی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔۲۰ صنائع لفظی کے شائق تھے۔۲۱ عبدالغفور نساخ اور مولوی محمد عبدالحیٔ بدایونی نے شاہ رؤف احمد کے سات دواوین کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک فارسی اور چھے اردو میں ہیں۔ شاہ رؤف احمد کے درج ذیل مخطوطات بقول ڈاکٹر محمد ایوب قادری سینٹرل لائبریری بھوپال میں موجود ہیں۔

(۱) دیوانِ رافت: ۴۲۰ صفحات پر مشتمل اس دیوان میں پانچ ہزار سے زیادہ اشعار ہیں۔
(۲) کلیاتِ رافت: ۳۰۰ صفحات پر مشتمل اس کلیات میں تقریباً چار ہزار اشعار ہیں۔
(۳) مثنوی زلیخائے ہندی: دو ہزار اشعار پر مشتمل یہ مثنوی نواب معزمحمد خاں کی فرمائش پر لکھی گئی۔
(۴) مثنوی قصہ یہودی: اس میں ایک ہزار اشعار ہیں۔
(۵) رسالہ مولود: اس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار اشعار ہیں۔
(۶) فقہ ہندی: اس میں چھے سو اشعار ہیں۔
(۷) مثنوی اسرارِ غیب۔۲۲

قدرت اللہ قاسم، نساخ، عبدالحیٔ بدایونی، امیر مینائی اور لالہ سری رام نے اپنے تذکرے میں شاہ رؤف احمد کا ذکر کیا ہے رافت کے چند اشعار، جو ان تذکروں میں موجود ہیں، درج ذیل ہیں:

یہ کس کے مژگاں کے آہ یارب بھرے ہیں برمے ہمارے بر میں
کہ شکلِ غربال پڑ گئے ہیں ہزاروں روزن دل و جگر میں
ادا و انداز ، نازوعشوہ، جو کچھ ہے اس شوخ فتنہ گر میں
نہ وہ پری میں ، نہ حور میں ہے ، نہ ہے وہ غلماں میں نے بشر میں
لگانہ جراح اس پہ مرہم کہ داغ جائے تو جائیں مرہم
یہ رکھتے ہیں سوختہ جگر ہم چراغ اجڑے ہوئے نگر میں
جس نے بالوں میں ترے عطر بسا دیکھا ہے
اس پر آئی ہے بلا ہم نے بسا دیکھا ہے
ترا مجنوں ہوں اے پیارے اگر تو رشک لیلیٰ ہے
گیاجنگل کو تھا وہ میں‌نے بھی صحرا کی لے لی ہے ۲۳

گرمی رخساروں کی دیکھے جو وہ یار آئینے میں
جوہر آئنہ ہو جاوے شرار آئینے میں
ارفت اچپل وہ بھلا کب میرے گھر ٹھہرے کہ آہ
عکس کو جس کے نہ آتا ہو قرار آئینے میں

غضب تو یہ ہے ، سنو تو یاروٹک آنکھ اٹھا کر جو دیکھیں اس کو
تو ہائے چتون میں یوں کہے ہے بھلا ہماری ہے تو نظر میں
جو کچھ ہے اس میں اداو شوخی سو کب ہے حوروپری میں ایسی
خدا ہی جانے ہوا ہے مخفی یہ کون آ قالب بشر میں ۲۴

سیاہیٔ مو خوابِ ہمبراں ہوئی ہر اک زلف خواب پریشاں ہوئی ۲۵

نسبت عاشق و معشوق دیکھ تو رافت کے دل پسواغ ہےاس گل کے منہ پہ تل
پھوٹ کر روئے ہم ان سے مل کے پر نہ پھوٹے یہ پھپھولے دل کے ۲۶

شاہ نیاز احمد نیاز: (۱۱۷۳ھ۔۱۲۵۰ھ)

شاہ نیاز احمد اردو اور فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ تخلص ''نیاز'' ہے وہ صوفی بزرگ تھے ان کے کلام میں فلسفۂ وحدت الوجود بنیادی اہمیت کا حامل ہے اس کے ساتھ ساتھ عظمت انسان کو بھی بیان کیا ہے۔ ان کی شاعری میں عشق کی اثر انگیزی اور والہانہ پن پایا جاتا ہے۔ عشق حقیقی کے ساتھ ساتھ عشق مجازی کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ اگر چہ انھوں نے واضح الفاظ میں معاملاتِ عشق کو بیان نہیں کیا لیکن محبوب کے جور و جفا، ہجر، بے چینی و بے قراری کی کیفیت اور عاشق کی امنگوں، آرزوؤں کا بیان پایا جاتا ہے۔

مصحفی نے ''ریاض الصفحا'' میں نساخ نے ''سخن شعر'' ا اور شیفتہ نے ''گلشن بے خار'' میں شاہ نیاز احمد کا ذکر ہے۔ ۲۷

نمونہ کلام درج ہے:

وہ جو نقش پا کی طرح رہی تھی نمود اپنے وجود کی ۔۔۔ سو کشش نے دامن ناز کی اسے بھی زمین سے مٹا دیا
مجھے چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال ۔۔۔ یہ جگا کے شورِ ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

میر وشکیب طاقت و تاب و تواں ۔۔۔ اور تو سب چل بسے رہ گئی ایک جان تو

ہجر کی جو مصیبتیں عرض کیں اس کے روبرو ۔۔۔ ناز و ادا مسکرا کہنے لگا جو ہو سو ہو ۲۸

قاضی محمد سعید الدین کاکوروی سعید: (۱۱۸۰ھ۔۱۲۶۱ھ)

قاضی محمد سعید الدین اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ''سعید'' تخلص تھا، نواب مصطفے خان شیفتہ نے تذکرہ ''گلشن بے خار'' اور نواب علی حسن خان سلیم نے تذکرہ ''صبح گلشن'' میں ان کا ذکر کیا ہے ۲۹ ان کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

بے دماغی اسے ملنے سے نہ ہو کیونکر مرے ۔۔۔ کہ پری کو نہیں خوش آتی ہے انسان کی بو ۳۰

قفس سے اڑ کے یہاں تک تو ننگ و عار رہا ۔۔۔ کہ رنگ کے بھی میں اڑنے سے سرمشار رہا
ہمارے ہاتھ نہ آیا کبھی ہزار افسوس ۔۔۔ ہمیشہ وقف حنا پنجۂ نگار رہا

زہد میں بھی یاں تلک رغبت مجھے صہبا سے ہے ۔۔۔ رشتۂ تسبیح میرا پنبۂ مینا سے ہے

جلوت میں تجھے ہے عار کیونکر ملے ۔۔۔ خلوت میں کسے ہے بار کیونکر ملے
کھویا رونے نے خواب کا بھی ملنا ۔۔۔ دریا حائل ہے یار کیونکر ملے

حبیب النبی رقت: (۱۲۰۸ھ۔۱۲۶۱ھ)

مولوی حبیب النبی اردو میں شاعری کرتے تھے۔ رقت تخلص تھا۔ امیر مینائی، محمد عبدالحئ بدایونی، نساخ نے اپنے تذکروں

میں مولوی حبیب النبی کا ذکر کیا ہے۔۳۲ رقت کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

گر ہاتھ سے تو اپنے مجھے زہر کا دے جام — اس جام کو میں ساغر کوثر سے نہ بدلوں
کیا ظلم ہے اغیار مجھے آنکھیں دکھائیں — میں تیوری بھی اے یار ترے ڈر سے نہ بدلوں ۳۳

شوقِ گردش جو ہو تجھے گردوں — باندھ دامن ہمارے دامن سے
آئی گر روبرو شب ہجراں — صبح کر دیں گے داغ روشن سے
اپنی آہوں سے یا نگہ سے تری — سینے میں پڑ گئے ہیں روزن سے ۳۴

زندگی گر عذاب ہے تجھ بن — موت بھی تو خراب ہے تجھ بن ۳۵

عبداللہ دہلوی علوی: (م ۱۲۶۴ھ)

مولوی عبداللہ اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ تخلص ''علوی'' تھا۔ امام بخش صہبائی مولوی عبداللہ کے شاگرد تھے۔ حکیم عبدالحئی نے ''گل رعنا'' میں دہلی کی مجالسِ شعر و ادب کے سخنورانِ باکمال کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عبداللہ کا بھی ذکر کیا ہے۔۳۶ قادر بخش صابر نے تذکرہ ''گلستانِ سخن''۔۳۷ میں علوی کے درج ذیل اشعار درج کیے ہیں:

مضمون کی فکر کیا کریں اس کے سخن میں ہم — گم ہیں خیال تنگیٔ کنج دہن میں ہم
کیا دم تھا کل جو دیکھی یارب نسیم صبح — غنچہ کی طرح پھول گئے پیرہن میں ہم
دل غم سے تنگ، سینہ سراپا الم سے خون — لائیں ہیں بخت غنچہ مگر اس چمن میں ہم
دامن سے ڈہانک جیسے کوئی لے چلے چراغ — جاتے ہیں سوز عشق لیے یوں کفن میں ہم
مت پوچھ ہم نشیں کہ یہ راتیں فراق کی — کس طور سے ہیں کاٹتے رنجن و محن میں ہم
چھوٹی کمر کے فکر کی جو پیچ و تاب سے — اولجھے خیالِ زلف شکن در شکن میں ہم

حبیب احمد حبیب: (۱۲۲۱ھ۔۱۲۶۳ھ)

مولوی حبیب احمد اردو، عربی، فارسی تینوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ رویت اور حسیب تخلص تھا۔۳۹ تذکرہ ''آثار الشعرا'' میں محمد ممتاز علی نے مولوی حبیب احمد کے فارسی اشعار درج کیے ہیں۔ مولوی حبیب احمد کو عروضی و قوافی میں کمال حاصل تھا۔۴۰ ان کے چند اردو اشعار درج ذیل ہیں:

گاہ گریہ، گاہ نالہ، گاہ شورش ، گہہ طپش — آپ کے غم میں یہ ہے حالت ہماری ان دنوں ۴۱

سحر کہتے ہیں جس کو، چاک ہے اپنے گریباں کا　　جسے کہتے ہیں بجلی، لمعہ ہے اک آہِ سوزاں کا
تصور یہ بندھا ہے مجھ کو اس رشکِ گلستاں کا　　نظر آتا ہے دنیا ہی میں عالم باغ رضواں کا
مزار ایسی جگہ کیجو، نہ ظاہر تا کسی پر ہو　　کہ میں کشتہ ہوں اے یارو کسی کے نازِ پنہاں کا
کیا غضب ہے مل کے بیٹھوں تو کہے وہ دور ہو　　اور اگر ہوں دور تو کہتا ہے کیوں مغرور ہو ۴۲

ابوالحسن بدایونی حسن:

مفتی ابوالحسن بدایونی اردو میں شاعری کرتے تھے۔ ''حسن'' تخلص تھا۔۴۳ آپ کے دو اردو اشعار درج ذیل ہیں

تیری زلف کے ہاتھ جاں بیچتا ہوں　　میں سودے میں جنس گراں بیچتا ہوں
حسن جس جگہ پر ہو وہ شمع محفل　　تو واں جان پروانہ ساں بیچتا ہوں ۴۴

ابوالحسن کاندھلوی: (م ۱۲۶۹ھ)

مولوی ابوالحسن کو شعر وسخن کا ذوق تھا۔ اردو میں شاعری کرتے تھے۔ تخلص ''حسن'' تھا۔ ان کے اشعار شستہ اور فصیح و متین ہوتے تھے۔ متعدد قصیدے اور مثنویاں کہیں جن میں مثنوی ''بحرالحقیقت'' بہت مقبول ہوئی۔۴۵ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، نساخ اور علی حسن خاں نے اپنے تذکروں میں مولوی ابوالحسن کا ذکر کیا ہے۔۴۶ ان کے چند اردو اشعار درج ذیل ہیں:

گو تو نے لپٹ کر نہ کیا ہم کو ذرا گرم　　رہتی تھی ترے عشق میں چھاتی یہ سدا گرم
جواب لائیو قاصد شتاب نامے کا　　جواب نامہ نہ ہووے جواب نامے کا ۴۷

منفعل ہوں دست و پا بھی مارنے سے وقت ذبح　　کیوں میں تڑپا جو ترے دامن پہ چھینٹا پڑ گیا ۴۸

غلام رسول مہر اور احتشام الحسن کاندھلوی نے مولوی ابوالحسن کے اردو قصیدے کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں۔۴۹

شیخ جلال الدین باقر: (م ۱۱۷۲ھ)

شیخ جلال الدین فارسی میں اکثر اور اردو میں کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔ ''باقر'' تخلص تھا۔۵۰ نمونہ کلام درج ذیل ہے:

باقر دماغِ شعر و سخن اب کہاں ہمیں　　وہ ولولہ وہ جوش طبیعت نہیں رہا
ہمہ تن ضعف ہو گیا باقر　　وہ حال اور وہ جمال ۵۱

امین اللہ پیام:

مولوی امین اللہ سید احمد بریلوی کے لشکر میں شامل تھے۔ انھوں نے فرضیت جہاد کے بارے میں عربی زبان میں رسالہ لکھا بعد ازاں اس کا اردو میں ترجمہ کیا، آپ اردو میں شاعری بھی کرتے تھے۔ تخلص ''پیام'' تھا۔۵۲ نساخ اور قادر بخش صابر نے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر کیا ہے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے:

جبکہ اپنی خبر نہ ہو اس کو — اس کو اوروں کی کیا خیر ہووے
پھونکتا ہے مجھی کو نالۂ دل — یار میں بھی تو کچھ اثر ہو وے ۵۳

نسیم اللہ نسیم:(م۱۸۵۷ء)

مولوی نسیم اللہ فارسی اور اردو میں شاعری کرتے تھے۔نسیم تخلص تھا۔بقول قادر بخش صابر:

''کمالاتِ علمی کی قوت سے اشعار ریختہ اور فارسی کو نہایت متانت اور غایت رزانت کے ساتھ کہتا ہے جو کہ نظر ہمت ان مقاصدِ عالیہ پر مقصور ہے تدوین سخن کی طرف اصلاً التفات نہیں ہے وگرنہ ہر صنفِ شعر سے کئی دفتر مدون ہو جاتے۔'' ۵۴

مولوی نسیم اللہ کی زبان میں سادگی و لطافت اور شستگی پائی جاتی ہے۔۵۵ چند اردو اشعار ملاحظہ ہوں۔

بے سبب ہر کس و ناکس سے لڑا کرتی ہیں — اپنی آنکھوں کو ذرا او بت پر فن سمجھا
گن گن کے روز کرتے ہیں وہ عاشقوں کو قتل — ہر روز ان کے کوچے میں روزِ شمار ہے

جو لذتیں ہیں قناعت میں حرص میں کب ہیں — نشہ جو کم ہو اسی کو سرور کہتے ہیں
پھرتا ہے چشم تر میں ہماری قد نگار — یہ قد ہے یا کہ سرولب جوئبار ہے

زمانے کو بندہ کیا چاہتے ہو — بتوں کیا خدا تم بنا چاہتے ہو
نسیم اس سے کہتا ہوں کر بات کوئی — تو کہتے ہیں کیا کچھ سنا چاہتے ہو ۵۶

اشرف علی بدایونی نفیس:(م۱۸۵۸ء)

مولوی اشرف علی قادر الکلام شاعر تھے۔تخلص ''نفیس'' تھا۔نواب ظہور اللہ خاں ''نوا'' بدایونی سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ اردو، فارسی اور عربی میں صاحبِ دیوان شاعر تھے۔شعرائے اردو کا تذکرہ ''انتخاب دہر'' بھی لکھا۔۵۷ نفیس کے چند اردو اشعار بطور نمونہ درجِ ذیل ہیں:

تم اگر جنبشِ ابرو کی دکھادو گے ادا — ایک بے جرم پہ چل جائیں گی شمشیریں دو
دونوں زلفوں میں تری ہے دل وحشی میرا — ایک دیوانے کی گردن میں ہیں زنجیریں دو
چاہنے والے کو رسوا کرو یا قتل کرو — ہے گناہگار جو جی چاہے وہ تعزیریں دو ۵۸

امداد صابری نے اپنی تصنیف ''۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا'' میں اشرف علی بدایونی کے مندرجہ بالا اشعار کے علاوہ ۱۲۳ اشعار درج کیے ہیں۔۵۹

کفایت علی کافی:(م۱۸۵۸ء/۱۲۷۴ھ)

مولوی کفایت علی کو نعتیہ شاعری میں خاص مقام حاصل ہے۔ آپ کا تخلص ''کافی'' ہے۔ شاعری میں شیخ مہدی علی خاں کے شاگرد تھے۔٦٠ مولوی کفایت علی کی بیش تر تصانیف منظوم ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا طبعی میلان شعر و شاعری کی جانب زیادہ تھا۔ مولوی عبدالحیٔ بدایونی نے تذکرہ ''شمیم سخن'' اور نساخ نے تذکرہ ''سخن شعرا'' میں مولوی کفایت علی کا ذکر کیا ہے۔٦١ نساخ نے کافی کے درج ذیل نعتیہ اشعار تذکرہ ''سخن شعرا'' میں دیئے ہیں:

عرش بریں ایوان محمد صلی اللہ علیہ وسلم — خلد سرا بستان محمد صلی اللہ علیہ وسلم
آپ کفیل کار امت آپ شفیع روز قیامت — ہیں بے حد احسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم
مظہر رحمت، مصدر رافت، مخزن شفقت، عین عنایت — ذات محمد جانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
رحمتِ عالم اس کا لقب ہے، خلقتِ عالم کا وہ سبب ہے — ہے کیا عالی شان محمد صلی اللہ علیہ وسلم
بہر شفائے درد و مصیبت اور برائے رنج و فلاکت — کافی ہے درمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم ٦٢

رشید النبی وحشت: (م۱۲۷۴ھ)

مولوی رشید النبی اردو، عربی اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ''وحشت'' تخلص تھا۔ حافظ اکرام احمد ضیغم کے شاگرد تھے۔ عبدالغفور نساخ مؤلف تذکرہ سخنِ شعرا ان کے شاگرد تھے۔٦٣ وحشت کے اردو اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

مہتابی پہ جلوہ ہے جو اس رشک پری کا — عالم ہے رخ مہ پہ چراغ سحری کا
چشم آہو کے انداز قدم کبک دری کا — رخ مہ کا ہے قد سرو کا، نقشہ ہے پری کا
لب خشک ہیں تر آنکھیں ہیں فرقت میں شب و روز — یہاں زیرِ نگیں ملک ہے خشکی و تری کا
آنکھوں سے دکھا دیتے ہیں مفہوم عدم کو — لکھتے ہیں جو وصف آپ کی نازک کمری کا
اس کانِ ملاحت کی یہ الفت کا مزا ہے — ہے شور جہاں میں مری شوریدہ سری کا
یادِ ابرو سے تمھاری کٹ گئے ایام غم — ہجر میں ہر دم ہمیں شمشیر کا دم ہو ہو گیا
آب حیواں اپنے حق میں شربت سم ہو گیا — خنجر سفاک زخم دل کو مرہم ہو گیا
مشتری کون ہوا اس مہ کا جو بے مہری سے — نقد جان لے کے یہ کہتا کہ ہے بیعانہ ہوا ٦٤

احمد حسن قنوجی عرشی: (۱۲۳۶ھ-۱۲۷۷ھ/۱۸۲۰ء-۱۸۶۰ء)

مولوی احمد حسن اردو، عربی اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ''عرشی'' تخلص تھا۔ ابتدا میں مولوی فیض احمد رسوا بدایونی سے مشورۂ سخن کیا۔٦٥ بعد ازاں فارسی اور اردو میں غالب سے مشورہ سخن حاصل تھا۔٦٦ جیسا کہ عرشی ایک شعر میں کہتے ہیں:

مغلوب ہیں سب اہل جہاں میرے سخن سے — ہوں زلہ ربا غالب اعجاز رقم کا ٦٧

مالک رام عرشی کی شعر گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بہت پرگواورزوردنویس تھے۔ایک ایک نشست میں طولانی قصیدے اور ہرطرح کی نظم لکھنے پر قادر تھے۔اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔اس کے باوجود سچ تو یہ ہے کہ نسبت شاعری ان کے دون مرتبہ ہے۔ وہ علم و فضل اور ظاہری اور باطنی خوبیوں کے باعث اپنے اقران و اماثل سے کہیں بڑھ کر تھے۔افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی۔''۶۸

مولوی احمد حسن کے چند اردو اشعار درج ذیل ہیں:

حاضر ہوں آج مجمع دیوان عام میں　　پھر کچھ کسی کو حوصلۂ امتحان نہ ہو

کیا اِک بات میں جامہ سے باہر　　شب وصل اس نے جب مجھ سے حیا کی

سحر جو میں نے کہا ہو قصور شب کا معاف　　تو ہنس کے بولے کہ چل دور ہو ہوا سو ہوا
سنتا ہی نہیں کوئی دردِنہاں کو　　قلقل نہیں کہتا کبھی مینا مرے آگے

جولاں کہاں پہ کیجیے گر لامکاں نہ ہو　　ہمت کسے دکھائے گر آسمان نہ ہو
اے وضع احتیاط یہ فصل بہار ہے گل بانگ　　شوق زمزمہ سنج فغاں نہ ہو
اتنی ہی آرزو ہے ہمیں تجھ سے اے فلک　　یہ ان کی اک نہیں بھی نہ ہووے جو ہاں نہ ہو

مجھے خوشی ہے ترے عشوہ ہائے پیہم کی　　نہ کوئی ستم عذرِ امتحان کے لیے

شعلۂ عشق وہ ہے جس سے زمانہ جل جائے　　یوں تو پتھر کے بھی سینے میں شرر ہوتا ہے
خود آرائی نہ چھوڑیں گے یہ کافر　　خدائی یوں تو برحق ہے خدا کی ۶۹

ہادی علی لکھنوی اشک:(م ۱۲۸۱ھ)

مولوی ہادی علی اردو، عربی اور فارسی تینوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔تخلص ''اشک'' تھا۔عبدالغفور نساخ مؤلف ''تذکرۂ سخن شعرا'' ان کے دوستوں میں سے تھے۔۷۰ مولوی ہادی علی کا نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

چاند سورج تیرے بالوں میں نہیں بالائے سر　　ہو گئے ہیں مہر و مہ شب کو قریں بالائے سر

چلے وہ چال کہ دل سیکڑوں ہوئے پامال　　نکالے آپ نے کیا عالم شباب میں پاؤں
وہ رند ہوں کہ جہاں ہوں وہیں گزک پہنچے　　لگیں شراب میں پر ساقیا کباب میں پاؤں

انھیں سوجھی فلک سیر کی ترنگ میں آج — کہ چل کے دھوئیے اب طشتِ آفتاب میں پاؤں

ہجر کے صدمے سے کل جان نکل ہی جاتی — گر خیالِ لب جاں بخش نہ ہوتا دل میں
جنبش لب سے ترے کشتہ نے جان پائی — دم بخود رہ گئے شرما کے مسیحا دل میں

ہماری آہ سے ڈرے رقیب لازم ہے — نہ ہو یہ تیر ہوائی دوسار پہلو میں
دل ستم زدہ و یاس و حسرت و حرماں — اَنیس ہیں یہی دو تین چار پہلو میں
سنی نہ ایک مری بات ہائے صد افسوس — سنایا حال دل اس کو ہزار پہلو میں اے[۴۲]

حمیدالنبی مجروح:(م۱۲۸۰ھ)

مولوی حمیدالنبی اردواور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔تخلص مجروح تھا۔عبدالغفور نساخ اورامیر مینائی نے اپنے تذکرے میں مولوی حمیدالنبی کا ذکر کیا ہے۔[۴۴] نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

باقی نہیں آہ تک بھی ہم قدم — یہاں عالم دل میں اب خلا ہے
رکھا تہ تیغ ہم نے سر کو — یہ سجدۂ شکر بے ریا ہے
رہتا ہے یہ چرخ میں شب و روز — مجروح فلک کا سرپھرا ہے

منکرِ روزِ قیامت ترے کوچے میں تو آئیں — روز ہوتا ہے بپا محشر تری رفتار سے

ٹیکا ہو تیرے ماتھے پہ عکس مہ تاباں — بے پردہ شب ِ مہ میں اگر تو نکل آئے
ہر موج بنے مارِسیہ زہر الم سے — دریا سے جو تم زلف سنوارے نکل آئے

پانی ہو نہ کیوں کر کرۂ آب میں پانی — بھر آئے جو اس دیدہ بے خواب میں پانی
دل صاف جو ہیں اون میں کدورت نہیں ہوتی — ممکن نہیں مخلوط ہو سیماب میں پانی ۴۳ے

محمد صدرالدین آرزو(۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء۔۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء)

مفتی صدرالدین آرزو،اردو،عربی اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔تخلص ''آزردہ'' تھا۔شاہ نصیراور میاں محرم اکبرآبادی کو اپنا کلام دکھایا۔پھرنظام الدین ممنون سے مشورہ سخن کیا۔[۴۵]غالب کے حسرتی،مومن،اور دیگر شعرائے دہلی سے آپ کے بہت اچھے تعلقات تھے۔[۴۶]دہلی کی کوئی ادبی مجلس آپ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی۔آزردہ کا مجموعہ کلام مرتب صورت میں نہیں ملتا۔انیسویں صدی

کے کم وبیش ہر تذکرے میں ان کے اردو کلام کا انتخاب دیا گیا ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے صنف غزل پر طبع آزمائی کی۔ان کے کلام کا نمایاں وصف سادگی سے طرز ادا سادہ و عام فہم ہے۔اگر چہ انھیں عربی و فارسی پر کامل دست رس تھی لیکن ان کے اردو کلام میں عربی و فارسی کے مشکل الفاظ و تراکیب نہیں پائے جاتے۔بے جا مبالغہ آرائی اور مشکل الفاظ و تراکیب کے استعمال سے بھی ان کا کلام پاک ہے۔زبان اور خیال کے اعتبار سے ان کے اشعار سادگی کے حامل ہیں۔وہ خود کہتے ہیں:

ریختہ یہ ہے کہ جو آیت محکم ہے صاف | معنی دور نہیں لفظ بھی مہجور نہیں ۴۷

حقیقت تو ہے کہ صاف اور سلیس زبان میں اظہارِ خیالات ان کا طرۂ امتیاز ہے۔۴۸

''آزردہ'' کا نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

مر کر بھی ہمارا دل بے تاب نہ ٹھہرا | کشت بھی ہوا تو بھی یہ بھی سیماب نہ ٹھہرا

(محمد عبدالحیٔ:ص۷۱)

برگشتہ بخت جذبۂ دل تم کو آفریں | آکر وہ پھر گیا میرے بیت الحزن کے پاس

آمد آمد ہوئی پھر موسم گل کی شاید | ان دنوں چاک کو پاتے ہیں گریبان سے انس

اُس شوخ سے مربوط بہت سہل سے ہوتے | گر ہم بھی سبک حرکتِ نااہل سے ہوتے

(شفتہ:ص۷۸۔۷۹)

نالوں سے میرے کب تہ و بالا جہاں نہیں | کب آسمان زمین و زمیں و آسماں نہیں
قاتل کی چشم تر نہ ہو یہ ضبط آہ دیکھ | جوں شمع سر کٹے پہ اٹھایا یاں دعواں نہیں
اے بلبلان شعلہ دم اک نالہ اور بھی | گم کدہ راہ باغ ہوں یاد آشیاں نہیں
اس بزم میں نہیں آگاہ ورنہ کب | واں خندہ دیر لب ادھر اشک نہاں نہیں

(لالہ سری رام،جلد اوّل،ص۵۸)

نکلنا ہوا دل سے دشوار کیوں | یہ ہے آہا کچھ اس کا سکان نہیں
اُسی کی سی کہنے لگے اہل محشر | کہیں پرسش داد خواہاں نہیں
یہ ہاتھ اس کے دامن تک پہنچے کب | رسائی جسے تا گریباں نہیں
فلک نے بھی سیکھے ہیں تیرے سے سطور | کہ اپنے کیے سے پشیماں نہیں

(مرزا قادر بخش صابر:ص۱۱۴)

میں اور ذوق بادہ کشی ، لے گئیں مجھے — یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں
تحقیق ہو تو جانو کہ میں کیا ہوں قیس کے — لکھا ہوا ہے یوں تو سبھی کچھ کتاب میں
یہ عمر اور عشق ہے آزردہ جانے شرح — حضرت یہ باتیں پھبتی ہیں عہد شباب میں

(نساخ:ص۲۳)

دل نے ملا دیں خاک میں سب وضع داریاں — جوں جوں کے رکے وہ ملتے سے ہم بیشتر ملے

(تذکرہ شمیم سخن، جلد اوّل،ص۳۷)

مفتی صاحب نے شعرائے اردو کا تذکرہ بھی لکھا۔ یہ ناقص الآخر ہے اور ردیف نون پر ختم ہوا ہے۔نواب مصطفٰے خان شیفتہ نے ''گلشن بے خار'' میں اور لالہ سری رام نے ''خمخانۂ جاوید'' جلد اوّل میں اس تذکرہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۲۹ھ اور ۱۲۳۳ھ کے درمیانی زمانے میں مرتب کیا گیا۔۴۹؎ اس میں ۱۰۶ شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔

شاہ محمد عمر (۱۲۳۴ھ/۱۲۹۸ھ)

مولوی شاہ محمد عمر اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔تخلص ''عمر'' تھا موزونی طبع وجودتِ فکر بذریعۂ غایت آپ کو حاصل تھی۔۵۰؎ بقول امیر مینائی شاہ محمد عمر کو کسی سے تلمذ کا اتفاق نہیں ہوا۔۵۱؎ اِن کے چند اردو اشعار بطور نمونہ درج ہیں:

سرسبز ہوء نہ شاخ الفت — پھل پائے نہ ہم نے عاشقی کے
سرشار ہوں میں نگہ سے اس کی — بے خود ہیں کچھ شراب پی کے

زردی رخ مری الفت ک خبر دیتی ہے — بن کے غماز یہ رسوا مجھے کر دیتی ہے
اب بھی گھبرا کے الٹ دیتے ہیں اکثر وہ نقاب — ناتوانی میں بھی آہ اتنا اثر دیتی ہے

توڑ کر بال و پر میرے صیاد — مژدہ دیتا ہے اب رہائی ہے
کچھ جو بھاتا نہی ان روزوں — سچ کہو کس کی آن بھائی ہے

نہ کوئی حاجبنہ کوئی دربان نہ اس کا چہرہ نقاب میں ہے — نظر ہوا پنی نہیں پہنچتی سمجھتے ہیں ہم حجاب میں ہے

(امیر مینائی،ص۲۳۳)

شاہ محمد معصوم (۱۲۶۳ھ۔۱۳۳۱ھ)

شاہ محمد معصوم اردو، فارسی اور عربی میں شاعری کرتے تھے،تخلص ''معصوم'' تھا۔آپ کا فارسی و اردو مجموعہ کلام ''انتخابِ معصوم''

کے نام سے ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۷ء میں مطبع فیض الکریم، حیدرآباد دکن سے شائع ہوا رام پور کے مشاعروں میں کلام پڑھا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے مشاعروں میں بھی شرکت کی۔۵۲؎ امیر مینائی نے تذکرہ ''انتخابِ یادگار'' میں شاہ محمد معصوم کا ذکر کیا ہے اور درج ذیل اشعار درج کیے ہیں:

کس کو رتبہ تو نے اے قاتل شہادت کا دیا   سچ بتا شوخ اس قدر رنگِ حنا کیوں کر ہوا
ناصحا کس کو ہے خوفِ محشر   ایسے ہنگامے ہوا کرتے ہیں

تصور نے پری رویوں کے دیوانہ بنایا ہے   نہ جی لگتا ہے صحرا میں نہ دل لگتا ہے گلشن میں

نیا ظلم و ستم کیا یاد آیا   جو تم نے ان دنوں مجھ سے وفا کی

حال میرا دیکھ کر رونے لگے   ناصحوں کو بھی نصیحت ہو گئی

(انتخابِ یادگار:ص۳۴۴۔۳۴۵)

نواب صدیق حسن خان: (۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء۔۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء)

نواب صدیق حسن خان عربی، فارسی اور اُردو میں شاعری کرتے تھے۔ ابتدا میں عمر میں ''روحی'' تخلص تھا۔ رئیسہ بھوپال نواب شاہ جہاں بیگم سے نکاح کے بعد ان کے اصرار پر ''نواب'' تخلص رکھا بعد میں اپنا تخلص ''توفیق'' پسند کیا۔۵۳؎ عربی میں ''نواب'' فارسی اور اردو میں ''توفیق'' تخلص تھا۔۵۴؎

ان کی قدردانی اور ہنر پروری و ادب نوازی کی بدولت مشرقی علوم وفنون کے بڑے بڑے ماہر بھوپال میں جمع ہو گئے تھے۔۵۵؎ اس وقت بھوپال میں اپنے علمی و ادبی کارناموں کی وجہ سے ''بغدادالہند'' کی حیثیت رکھتا تھا۔۵۶؎ اہل علم و ہنر کی قدردانی کی بدولت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اجڑی ہوئی محفلیں بھوپال میں آباد ہوئیں۔ نواب صدیق حسن خان نے بھوپال کو دہلی اور لکھنؤ کی طرح علم و ادب کا مرکز بنانے کی شعوری کوشش کی اور وہ اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔۵۷؎

نواب صدیق حسن خان ہفتہ وار مجلس مشاعرہ منعقد کرتے تھے جس میں اردو، فارسی دونوں زبانوں کی ''طرح'' دی جاتی تھی۔۵۸ انھیں ذوق، غالب، صہبائی اور شیفتہ کی صحبت میسر ہوئی۔

''نواب صاحب فارسی کے تو بہت عمدہ شاعر تھے مگر اردو کلام خاص روایتی و رسمی انداز کا ہے۔ جس میں کسی قسم کی بدت یا ندرت نہیں پائی جاتی۔''۵۹؎ فارسی و اردو کلام ۱۳۰۶ھ میں مطبع شاہ جہانی سے ''گل رعنا'' کے نام سے شائع ہوا اس میں ۱۴۲ اردو غزلیں ہیں۔

تذکرہ آثارالشعرا، تذکرہ خمخانہ جاوید (جلد دوم) تذکرہ طورکلیم، تذکرہ بزم سخن میں نواب صدیق حسن خاں کا ذکر موجود ہے۔ نمونۂ کلام درج ہے۔

تیری ہر ایک گرہ اور ہماری ساری رات
تو ہر ہمی نہ کر اے زلفِ یار ہاری رات

چلا ہے روم قیامت برابری کرنے
تو کھیل تماشا ہوئی ہماری رات

خدا ہی خیر کرے ، ہے معاملہ دل کا
چلا ہے تاجر جاں لے کے قافلہ دل کا

مدد کر اے اثر بے کسی و تنہائی
ہے آج لشکر غم سے مقابلہ دل کا

ڈرو نہ اسیکوئی اور کھیل کھیلو تم
بہت برا ہے مری جاں مشغلہ دل کا

برپا کریں نہ فتنہ کوئی دل کے آس پاس
بیٹھے ہیں دردومسرت وغم مل کے آس پاس

کیا پر خطر ہے دشتِ محبت قدم قدم
دل میرے آس پاس ہے میں دل کے آس پاس

(آثارالشعرا،ص۳۴۔۳۵)

نجم الدین چریاکوٹی:(م۱۳۰۷ھ)

مولانا نجم الدین اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔تخلص ''نجم'' تھا۔محمد عبداللہ ضیغم نے اپنے تذکرے[۶۰] میں ان کے درج ذیل اشعار نقل کیے ہیں:

سمجھتے ہیں کسی کا دردِ دل یہ بے وفا دشمن
بتانِ سنگ دل سے اور کیا کہیے خدا سمجھے

اٹھے ہو کہ خمار اور جم بیٹھے فر گردوں پر
اگر اپنے تئیں انسان خاک کفش پا سمجھے

دختر زر سے جو الفت ہے تو اتراتی ہے نیند
جھومتی مستانہ ساقی آنکھوں میں آتی ہے نیند

خواب میں آیا کسی کی سرد مہری کا خیال
چشمہ خورشید کے مانند تھراتی ہے نیند

دھیان آجاتا ہے جس دن سبزۂ خط کا ترے
بن کے طوطی رات کو آنکھوں میں اوڑ جاتی ہے نیند

ہم نے سوئے عمر بھر یاد قدر دل دار میں
لوگ کیوں کہتے ہیں سولی پر بھی آجاتی ہے نیند

غلط پر بھی سمجھ اپنی ہی ، تیری کیا خط ظالم
کہ تجھ سے دشمنِ جان جہاں کو آشنا

(محمد عبداللہ ضیغم:ص۳۳۱)

نورالحسن خان کلیم:(۱۱۷۸ھ۔۱۳۳۶ھ)

نورالحسن خان اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔اردو میں ''کلیم'' اور فارسی میں ''نور'' تخلص تھا۔[۶۱] خان محمد خان شبیر کے شاگرد تھے۔[۶۲] انھوں نے اردو اور فارسی شعرا کے تذکرے بھی لکھے۔''طورکلیم'' فارسی زبان میں اردو شاعروں کا تذکرہ ہے۔ چند اردو اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

ہر ایک طور سے عالم کو مار رکھتے ہیں　　غرور حسن میں بھی انکسار رکھتے ہیں
ہمیشہ پیش نظر وہ عذار کا رکھتے ہیں　　تمھارے دیکھنے والے بہار رکھتے ہیں
ہم اپنے بعد سخن یادگار رکھتے ہیں　　زمین شعر میں اپنا مزار رکھتے ہیں
کیا ہے دل نے ہمیں دو جہاں سے فارغ　　بس ایک ہم یہی اجڑا دیار رکھتے ہیں

(محمد علی ممتاز: ص۱۹۲)

چل نکلتے ہیں تمھاری یاد میں　　ایسے کچھ بے بس ہوا کرتے ہیں ہم
شاعری مد نظر ہم کو نہیں　　وارداتِ دل لکھا کرتے ہیں ہم

(ایضاً: ص۱۹۳)

میری طرف ہوا تو مخاطب نہ ظاہرا　　ہر آہ کیا ادا تھی کہ میں شاد ہوگیا
تجھ سے مجھے نسبت نہیں ہرچند مگر ہاں　　جس باغ کا تو گل ہے تو میں خار ہوں اس کا

(بزم سخن: ص۸۴)

خجلت نصیب ہم سے نہ تم سے کرم شمار　　تم اور آؤ دل سے دیار تباہ میں
مستی کسی نگہہ کی ہے اپنی شراب میں　　آتی ہے بو کسی کی ہمارے کباب میں
ہیں بہت سے جو اسے بھی بے نصیب　　مہربانی ہے نہاں بیداد میں

شورش کہاں سے لائے جو ہم سا ہو درد مند　　شوخی کہاں سے پائے جو تم سا جمیل ہو

(طور کلیم: ص۸۵)

نواب علی حسن خاں سلیم: (۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء-۱۹۳۶ء)

نواب علی حسن خاں فارسی اور اردو میں شاعری کرتے تھے۔ اردو میں ''سلیم'' اور فارسی میں ''طاہر'' تخلص تھا۔ آپ رنگِ قدیم کے شاعر اور مولانا احسن بلگرامی کے شاگر تھے۔[۶۳] آپ نے اردو شعرا کا تذکرہ فارسی زبان میں ''بزم سخن'' کے نام سے لکھا۔ مولانا شبلی نعمانی سے بڑی دوستی تھی۔[۶۴] ان کی محبت اور قدر شناسی کے شواہد ''مکاتیبِ شبلی'' میں نواب علی حسن خاں کے نام خطوط میں دیکھے جاسکتے ہیں۔[۶۵]

نواب علی حسن خاں کے چند اردو بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

عمر یوں کاٹی کسی کی یاد میں　　شام نالہ میں، سحر فریاد میں
ہم اسیرانِ محبت کا ہے گھر　　یا قفس میں یا کفِ صیاد میں

تم نہ آئے تو کبھی اک چرچا رہا ‌ ‌ ‌ کٹ گئی شب نالہ وفریاد میں

(آ ثارالشعراء،ص۱۲۱۔۱۲۲)

غمزہ و ناو عشوہ و انداز ‌ ‌ ‌ ان ہی دو چار نے تو مارا ہے

سلیم اکسیر ہے مجھ کو غبارِ کوچۂ جاناں ‌ ‌ ‌ اڑاؤں خاک جنگل کی نہیں مجنوں سا دیوانہ

درد فراق اس سے بیاں کیجئے تو وہ ‌ ‌ ‌ کہتا ہے رہنے دیجئے بس بس سناسنا

تم تو سلیم کہتے تھے اس سے لڑیں گے ہم ‌ ‌ ‌ تم آج واں گئے تھے کہو کیا کہا سنا

(بزم سخن،ص۶۲)

(۳)

مذکورہ بالا علما اپنے دور کے نام ور عالم تھے۔ یہ حضرات عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ شعروشاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ اگرچہ ان میں سے بعض نے روایتی موضوعات کو بیان کیا ہے لیکن ان میں سے اکثر نے اپنے انداز بیان سے ان روایتی موضوعات کو تازگی بخشی۔ ان تمام علمائے کرام کی شاعری اس قابل تھی کہ اس دور کے تذکرہ نگاران سے صرفِ نظر نہ کر سکے اور یہ علما ان تذکروں کی بدولت بہ حیثیت شاعر اردو ادب کی تاریخ کا حصہ بن گئے۔ عبداللہ دہلوی اور مفتی صدرالدین آرزو انیسویں صدی کے نصف اوّل میں دہلی کی شعری و ادبی مجالس کا حصہ تھے۔ شاہ احمد صوفیانہ شاعری اور کفایت علی کافی اردو نعتیہ شاعری کے اہم شاعر تھے۔ مصحفی کو شاہ نیاز احمد سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ شاہ رؤف احمد جرات کے احمد حسن عرشی غالب کے اور مولوی محمد مصباح امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ نواب علی حسن خاں کے شبلی نعمانی سے دوستانہ مراسم تھے۔ بھوپال میں علی گڑھ تحریک کو فروغ دینے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا تھا۔[۲۶] مفتی صدرالدین آرزو، اشرف علی بدایونی نفیس نورالحسن خاں، علی حسن خاں نے شعرائے اردو کے تذکرے بھی لکھے۔ غرض یہ علمائے کرام بہت سی وجوہات کی بنا پر اردو ادب کی تاریخ میں اہمیت کے حامل ہیں۔

حواشی:

۱۔ ''اردو لغت''، جلد پنجم، اردو لغت بورڈ، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۶۶۔۶۷۔

۲۔ ایضاً، ص ۶۶۔ سید احمد دہلوی، ''فرہنگِ آصفیہ''، جلد اوّل، دہلی، ۱۹۱۸ء، ص ۵۹۹۔ نورالحسن نیر، ''نوراللغات''، جلد اوّل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۱۰۲۶۔

۳۔ حنیف نقوی، ''شعرائے اردو کے تذکرے، نکات الشعرا سے گلشن بے خار تک''، بنارس، ۱۹۷۲ء، ص ۲۲۔

۴۔ فرمان فتح پوری، ''اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۷۸۔۷۹۔

۵۔ نورالحسن نقوی، ’’فنِ تنقید اور اردو تنقید نگاری‘‘، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۰ء، ص ۱۰۱۔

۶۔ ’’اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری‘‘، ص ۸۵۔

۷۔ ’’فنِ تنقید اور اردو تنقید نگاری‘‘، ص ۹۸۔

۸۔ ’’ شعرائے اردو کے تذکرے، نکات الشعرا سے گلشنِ بے خار تک‘‘، ص ۴۱۔

۹۔ ایضاً، ص ۳۷۔

۱۰۔ عبدالغفور نساخ، ’’سخن شعرا‘‘، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۷۴ء، ص ۱۸۷۔

۱۱۔ ایضاً۔

۱۲۔ محمد عبدالحیٔ بدایونی، ’’تذکرہ شمیم سخن‘‘، جلد اوّل، مطبع امداد الہند، مراد آباد، س ن، ص ۱۲۸۔

۱۳۔ احتشام الحسن کاندھلوی، ’’حالات مشائخ کاندھلہ‘‘، نئی دہلی، ۱۳۸۳ھ، ص ۸۴۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۸۹۔

۱۵۔ امیر مینائی، ’’انتخابِ یادگار‘‘، تاج المطابع، لکھنؤ، ۱۲۹۷ھ، ص ۱۴۴۔ ’’تذکرہ شمیم سخن‘‘، ص ۱۲۵۔

۱۶۔ ’’سخن شعرا‘‘، ص ۱۷۸۔

۱۷۔ محمد مصطفٰے خاں شیفتہ، ’’گلشنِ بے خار‘‘، اردو مترجم محمد احسان الحق، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ۱۹۶۲ء، ص ۲۲۲۔

۱۸۔ محمد ایوب قادری، ’’اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ‘‘ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۴۴۵۔

۱۹۔ غلام احمد ہمدانی مصحفی، ’’ریاض الفصحاء‘‘ انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۳۴ء، ص ۳۳۹۔ ’’سخن شعرا‘‘، ص ۵۳۶۔ ’’گلشنِ بے خار‘‘ ص ۵۲۱۔

۲۰۔ ’’گلشنِ بے خار‘‘، ص ۲۴۸۔ علی حسن خان، ’’تذکرہ صبح گلشن‘‘، مطبع شاہجہانی، بھوپال، ۱۲۹۵ھ، ص ۲۰۴۔

۲۱۔ ’’انتخابِ یادگار‘‘، ص ۱۵۸۔ ’’تذکرہ شمیم سخن‘‘، ۱۲۹۔ ’’سخن شعرا‘‘، ص ۱۹۰۔

۲۲۔ عبدالحیٔ حسنی، ’’گل رعنا‘‘، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۲۱ء، ص ۳۱۲۔

۲۳۔ قادر بخش صابر، ’’گلستانِ سخن‘‘، مطبع نول کشور، ۱۲۷۱ھ، ص ۳۷۲۔

۲۴۔ ’’انتخابِ یادگار‘‘، ص ۱۱۴۔ ’’سخن شعرا‘‘، ص ۱۹۷۔ محمد ممتاز علی، ’’آثار الشعرا‘‘، مطبع شاہجہانی، بھوپال، ۱۳۰۴ھ، ص ۱۱۷۔

۲۵۔ سخن شعرا، ص ۱۹۷۔

۲۶۔ ’’تذکرہ شمیم سخن‘‘، ص ۱۱۶۔

۲۷۔ ’’حالات مشائخ کاندھلہ‘‘، ص ۱۳۷۔

۲۸۔ ’’گلشنِ بے خار‘‘، ص ۱۷۳۔ ’’سخن شعرا‘‘، ص ۱۲۹۔ علی حسن خاں، ’’تذکرہ بزم سخن‘‘، مطبع نامی مفید عام، آگرہ، ۱۸۸۱ء، ص ۴۱۔

۲۹۔ غلام رسول مہر، ’’سید احمد شہید‘‘، جلد اوّل، لاہور، ۱۹۵۲ء، ص ۲۳۲۔ ’’حالات مشائخ کاندھلہ‘‘، ص ۱۳۸۔۱۳۹۔

۳۰۔ ’’تذکرہ شمیم سخن‘‘، ص ۱۰۰۔

۳۱۔ ’’سخن شعرا‘‘، ص ۹۷۔

۳۲۔ ’’گلستانِ سخن‘‘، ص ۴۵۷۔

۳۳۔ امداد صابری، ’’۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا‘‘، دہلی ۱۹۵۹ء، ص ۳۸۲۔

۳۴۔ ’’تذکرہ شمیم سخن‘‘، ص۲۴۳۔

۳۵۔ ’’۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا‘‘، ص۳۹۳۔۳۹۵۔

۳۶۔ محمد میاں، ’’علمائے ہند کا شاندار ماضی‘‘، جلد چہارم، دہلی، ۱۹۶۳ء، ص۳۷۶۔ یسین اختر مصباحی، ’’چند ممتاز علمائے انقلاب‘‘، مکتبہ المدینہ، کراچی، ۲۰۰۸، ص۹۴۔

۳۷۔ ’’تذکرہ شمیم سخن‘‘، ص۱۹۱۔ ’’سخن شعرا‘‘، ص۳۹۵۔

۳۸۔ سخن شعرا، ص۵۴۳۔

۳۹۔ مالک رام، ’’تلامذہ غالب‘‘، ادارہ یادگار غالب، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص۵۹۰۔

۴۰۔ ایضاً۔ غلام رسول مہر، ’’جماعت مجاہدین‘‘، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص۲۲۵۔

۴۱۔ نورالحسن خاں، ’’طور کلیم‘‘، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۲۹۸ھ، ص۷۰۔

۴۲۔ ’’تلامذہ غالب‘‘، ص۵۹۱۔

۴۳۔ ’’سخن شعرا‘‘، ص۳۰۔

۴۴۔ ایضاً، ص۴۱۲۔ ’’انتخابِ یادگار‘‘، ص۳۳۵۔۳۳۶۔

۴۵۔ عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی، ’’صدرالدین آزردہ‘‘، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء، ص۱۸۵۔

۴۶۔ فقیر محمد جہلمی، ’’حدائق الحنفیہ‘‘، المیزان اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص۵۰۰۔

۴۷۔ سر سید احمد خان، ’’آثارالصنادید‘‘، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص۲۶۳۔

۴۸۔ مختارالدین احمد، ’’مقدمہ‘‘، مشمولہ ’’تذکرہ آزردہ‘‘، مصنفہ صدرالدین آزردہ، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۷۴ء، ص۹۔

۴۹۔ ایضاً، ص۱۳۔۱۵۔

۵۰۔ محمد معصوم، ’’ذکرالسعدین فی سیرت الوالدین‘‘، مطبع مظہرالنور، رام پور، ۱۳۰۸ھ، ص۳۸۔

۵۱۔ ’’انتخابِ یادگار‘‘، ص۲۳۳۔

۵۲۔ امداد صابری، ’’حجاز مقدس کے اردو شاعر‘‘، مکتبہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۷۰ء، ص۳۷۲۔

۵۳۔ علی حسن خاں، ’’مآثر صدیقی‘‘، حصہ چہارم، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۲۸ء، ص۱۸۵۔

۵۴۔ ’’آثارالشعرا‘‘، ص۳۳۔ لالہ سری رام، ’’خمخانہ جاوید‘‘، جلد دوم، دہلی، ۱۹۱۱ء، ص۱۵۳۔

۵۵۔ علی حسن خاں ’’مآثر صدیقی‘‘، حصہ دوم، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۲۸ء، ص۱۲۶۔

۵۶۔ سلیم حامد رضوی، ’’اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ‘‘، ادرہ ادب و تنقید، تلیا، بھوپال، ۱۹۶۵ء، ص۵۵۔

۵۷۔ ارجمند بانو افشاں، ’’ریاست بھوپال اور مشاہیر اردو‘‘، بھوپال، ۲۰۱۲ء، ص۳۰۶۔

۵۸۔ امجد علی اشہری، ’’ایشائی شاعری‘‘، مطبع آگرہ اخبار، س ن، ص۱۳۱۔

۵۹۔ ’’اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ‘‘، ص۱۵۹۔۱۶۰۔

۶۰۔ محمد عبداللہ خاں ضیغم، ’’یادگار ضیغم‘‘، مطبع قادری، حیدرآباد دکن، ۱۳۰۳ھ، ص۳۳۱۔

۶۱۔ ’’آثارالشعرا‘‘، ص۱۹۲۔ لالہ سری رام، ’’خمخانہ جاوید‘‘، جلد ششم، مرتبہ: خورشید احمد یوسفی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء، ص۸۳۔

۶۲۔ ''اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ''، ص۱۸۲۔

۶۳۔ ایضاً، ص۱۸۵۔

۶۴۔ ایضاً، ص۱۸۳۔

۶۵۔ سید سلیمان ندوی، ''حیاتِ شبلی''، مکتبہ معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء، ص۱۸۸۔

۶۶۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: ''حیاتِ شبلی''، ص۱۸۶۔۱۸۸۔

فہرستِ اسنادِ محوّلہ:

۱۔ احمد، مختار الدین: ۱۹۷۴ء، ''مقدمہ''، مشمولہ تذکرہ آزردہ مصنفہ صدر الدین آزردہ، انجمن ترقی اردو، پاکستان

۲۔ اشہری، علی، امجد: س ن، ''ایشائی شاعری''، مطبع آگرہ اخبار۔

۳۔ اصلاحی، پرواز، عبدالرحمٰن: ۱۹۷۷ء، ''صدر الدین آزردہ''، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی۔

۴۔ افشاں، ارجمند بانو: ۲۰۱۲ء، ''ریاست بھوپال اور مشاہیر اردو''، بھوپال۔

۵۔ بدایونی، عبدالحیٔ، محمد: س ن، ''شمیم سخن''، حصہ اوّل، مطبع امداد الہند، مراد آباد۔

۶۔ جہلمی، محمد، فقیر: ۲۰۰۵ء، ''حدائق الحنفیہ''، المیزان، اردو بازار، لاہور۔

۷۔ حسنی، عبدالحیٔ: ۱۹۲۱ء، ''گل رعنا''، دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

۸۔ خاں، احمد، سیّد، سر: ۱۹۶۶ء، ''آثار الصنادید''، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی۔

۹۔ خاں، حسن، علی: ۱۸۸۱ء، ''بزم سخن''، مطبع نامی مفید عام، آگرہ۔

۱۰۔ ________: ۱۲۹۵ھ، ''صبح گلشن''، مطبع شاہجہانی، بھوپال۔

۱۱۔ ________: ۱۹۲۸ء، ''مآثر صدیقی''، حصہ دوم، حصہ چہارم، مطبع نول کشور، لکھنؤ۔

۱۲۔ خاں، نور الحسن: ۱۲۹۸ھ، ''طورِ کلیم''، مطبع مفید عام، آگرہ۔

۱۳۔ خویشگی، نصیر اللہ: ۱۹۶۷ء، ''گلشن ہمیشہ بہار''، مرتبہ: اسلم فرخی، انجمن ترقی اردو، کراچی

۱۴۔ رضوی، سلیم حامد: ۱۹۶۵ء، ''اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ''، ادارہ ادب و تنقید، تلیا، بھوپال۔

۱۵۔ سری رام، لالہ: ۱۹۰۸ء، ''خمخانۂ جاوید''، جلد اوّل، دہلی۔

۱۶۔ ________: ۱۹۱۱ء، ''خمخانۂ جاوید''، جلد دوم، دہلی۔

۱۷۔ ________: ۱۹۱۷ء، ''خمخانۂ جاوید''، جلد سوم، دہلی۔

۱۸۔ ________: ۱۹۹۰ء، ''خمخانۂ جاوید''، جلد ششم، مرتبہ: خورشید احمد یوسفی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

۱۹۔ شیفتہ، خاں، مصطفیٰ، محمد: ۱۹۶۲ء، ''گلشنِ بے خار''، اردو مترجم: محمد احسان الحق، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی۔

۲۰۔ صابر، بخش، قادر: ۱۲۷۱ھ، ''گلستانِ سخن''، مطبع نول کشور، لکھنؤ۔

۲۱۔ صابری، امداد: ۱۹۵۹ء، ''۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا''، دہلی۔

۲۲۔ ________: ۱۹۷۰ء، ''حجاز مقدس کے اردو شاعر''، مکتبہ شاہراہ، دہلی۔

۲۳۔ ضیغم، خاں، عبداللہ، محمد: ۱۳۰۳ھ، ''یادگارِ ضیغم''، مطبع قادری، حیدرآباد دکن۔
۲۴۔ علی، ممتاز، محمد: ۱۳۰۴ھ، ''آ ثارالشعرا''، مطبع شاہجہانی، بھوپال۔
۲۵۔ فتحپوری، فرمان: ۱۹۷۲ء، ''اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری''، مجلس ترقی ادب، لاہور۔
۲۶۔ قادری، ایوب، محمد: ۱۹۸۸ء، ''اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ''، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔
۲۷۔ قاسم قدرت اللہ: ۱۹۳۳ء، ''مجموعہ نغز'' پنجاب۔
۲۸۔ کاکوروی، حیدر، محمد علی: ۱۹۲۷ء، ''تذکرہ مشاہیر کاکوروی''، مطبع اصح المطابع لکھنؤ
۲۹۔ کاندھلوی، احتشام الحسن: ۱۳۸۳ء، ''حالات مشائخ کاندھلہ''، نئی دہلی۔
۳۰۔ مالک رام: ۲۰۰۸ء، ''تلامذہ غالب''، ادارہ یادگار غالب، کراچی۔
۳۱۔ مصباحی، یٰسین اختر: ۲۰۰۸ء، ''چند ممتاز علمائے انقلاب''، مکتبۃ المدینہ، کراچی۔
۳۲۔ مصحفی، ہمدانی، غلام: ۱۹۳۴ء، ''ریاض الفصحا''، انجمن ترقی اردو، دہلی۔
۳۳۔ معصوم، معصوم شاہ، محمد: ۱۳۰۸ھ، ''ذکر السعدین فی سیرت الوالدین''، مطبع مظہر النور، رام پور۔
۳۴۔ مہر، غلام رسول: ۱۹۵۵ء، ''جماعت مجاہدین''، کتاب منزل، لاہور۔
۳۵۔ ________: ۱۹۵۲ء، ''سید احمد شہید''، جلد ا، لاہور۔
۳۶۔ میاں، محمد: ۱۹۶۳ء، ''علمائے ہند کا شان دار ماضی''، جلد ۴، دہلی۔
۳۷۔ مینائی، امیر: ۱۲۹۷ھ، ''انتخاب یادگار''، تاج المطابع لکھنؤ۔
۳۸۔ ندوی، سلیمان، ندوی: ۱۹۴۳ء، ''حیاتِ شبلی''، مکتبہ معارف، اعظم گڑھ۔
۳۹۔ نساخ، عبدالغفور: ۱۸۷۴ء، ''سخن شعرا''، مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ۔
۴۰۔ نقوی، حنیف: ۱۹۷۲ء، ''شعرائے اردو کے تذکرے نکات الشعرا سے گلشن بے خار تک''، بنارس۔
۴۱۔ نقوی، نورالحسن: ۱۹۹۰ء، ''فنِ تنقید اور اردو تنقید نگاری''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔

لغات:

۱۔ اردو لغت بورڈ: ۱۹۸۳ء، ''اردو لغت'' (تاریخی اصول پر)، ج ۵، مطبوعہ اردو لغت بورڈ، کراچی۔
۲۔ دہلوی، احمد، سیّد: ۱۹۱۸ء، ''فرہنگ آصفیہ''، ج ا، دہلی۔
۳۔ نیر، نورالحسن: ۲۰۰۶ء، ''نور اللغات''، جلد ا، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد۔

ABSTRACTS

A Comperative Study of "Farhag-e-Aasfia" & "Ameer-ul-Lughaat".

Syed Ahmed Dehlvi (1846-1918) has complied "Farhang-e-Aasfia". It is a four volume dictionary. Its compilation started in 1868 and in the beginning in 1878 the words of 'Alif Mamdooda' were published as "Armaghan-e-Dehli". It was later on published after different ammendments and additions, under the title "Farhang-e-Aasfia". It is a complete dictionary which has enteries from 'Alif' ( ) to Ye ( )

The compiler of "Ameer-ul-Lughaat" is Ameer Minaai (1829-1900). He belonged to Lacknow. In 1884 on the demand of Sir Alfered Lowel (Lieutenant Governor of Western Countries and Chief Commissioner of Oodh). Nawab Kalab Ali Khan gave the task of compiling an Urdu dictionary to Ameer Minaai. After eight years of "Armaghan-e-Dehli" in June 1884 Ameer Minaai published the sample of "Ameer-ul-Lughaat" which was based on the words and phrases of the word Aankh ( ).

After that Ameer Minaai published two volumes (Ameer-ul-Lughaat comprises three volumes) Right after this, Syed Ahmed Dehlvi blamed Ameer Minaai for plagiarism and publicized it. This article presents the introduction of both the dictionaries and objections raised against Ameer-ul-Lughaat have been analyzed and a comparative study of both the dictionaries have been presented. The analysis confirms that the objections against Ameer Minaai and his dictionary are totally baseless. In this brief article the comparison of the two dictionaries is limited to entries under ( ) Maqsora and Mamdoda, in the two works.

رخسانہ عبدالرشید

سیّد جاوید اقبال

’’فرہنگِ آصفیہ‘‘ اور ’’امیر اللغات‘‘ کا تقابلی مطالعہ

اس مقالے کو لکھنے کا مقصد ’’فرہنگِ آصفیہ‘‘ اور ’’امیر اللغات‘‘ کا تقابلی مطالعہ کرنا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ کے مولف سید احمد دہلوی (۱۸۴۶ء۔ ۱۹۱۸ء) ہیں۔ سید احمد دہلوی کا تعلق دہلی سے تھا۔ فرہنگِ آصفیہ چار ضخیم جلدوں پر مشتمل لغت ہے۔ ۱۸۶۸ء میں انھوں نے لغت لکھنے کی ابتدا کی جو اپریل ۱۸۷۸ء میں ’’ارمغانِ دہلی‘‘ کے نام سے شائع ہوئی۔ مختلف ترمیمات اور اضافوں کے بعد اس کا نام ’’فرہنگِ آصفیہ‘‘ رکھا گیا۔ ’’ارمغانِ دہلی‘‘ کے ۸ سال بعد جون ۱۸۸۶ء میں مولف ’’امیر اللغات‘‘ امیر مینائی

(۱۸۲۹ء۔۱۹۰۰ء) نے ''نمونہ امیر اللغات'' شائع کروایا۔امیر مینائی کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔''امیر اللغات'' تین جلدوں پر مشتمل نامکمل لغت ہے۔مولف ''فرہنگِ آصفیہ'' نے امیر مینائی پر سرقہ کا الزام لگایا۔[۱] اردو لغت نویسی میں نقل درنقل کی روایت کے اعتبار سے الزامات بعض لغات پر لگائے گئے ہیں ۔خود ''فرہنگِ آصفیہ'' پر ''مخزن الفوائد'' کا چربہ اڑانے کا الزام لگا۔[۲] جہاں تک ''امیر اللغات'' پر اعتراضات کا تعلق ہے اس موضوع پر چند مضامین، تبصرے اور دیباچے لکھے گئے ۔ان تحریروں کو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نے تو محض اعتراض برائے اعتراض کے جذبے سے قلم اٹھایا ہے یا پھر بعض نے ان تحریروں کے رد میں لکھا ہے۔البتہ چند ایسے اہلِ علم ہیں جنھوں نے اس موضوع سے انصاف کرتے ہوئے حقیقتِ حال کو واضح کیا ہے۔ان لکھنے والوں میں قاضی عبدالودود، حامد حسن قادری، ابومحمد سحر، کریم الدین احمد، محمد یسین ، ڈاکٹر رؤف پاریکھ اور ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال وغیرہ شامل ہیں۔ (ان تحریروں کے حوالوں کا ذکر اپنے مقام پر کیا جائے گا)۔اردو لغت نویسی میں آج تک اندراجات اور لسانی قواعد کی حیثیت ہی سے مطالعے اور مباحث پیش کیے گئے ہیں۔لیکن یہ بحث کہ ''امیر اللغات''، ''فرہنگِ آصفیہ'' کا چربہ نہیں ہے، تحقیق طلب ہے۔ان لغات کا تحقیقی اور تقابلی مطالعہ جیسا کہ ہونا چاہیے تھا نہیں ہوا۔چنانچہ اب جب کہ موجودہ دور میں لغت نویسی پر بہ طور خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ضرورت ہے کہ مذکورہ موضوع پر کما حقہ تحقیق ہو جانی چاہیے ۔اس مقالے میں مذکورہ دونوں لغات کا تعارف، ''امیر اللغات'' پر عائد کیے گئے اعتراضات کا جائزہ، دونوں کا تقابلی مطالعہ اور معاصرانہ چشمک کا جائزہ لیا گیا ہے۔چوں کہ یہ ایک مختصر مقالہ ہے۔لہٰذا اس مضمون میں مجوزہ موضوع پر دائرۂ تحقیق دونوں لغات کے الف ممدودہ اور الف مقصورہ کے اندراجات پر مشتمل ہے۔

(۱)

سیّد احمد دہلوی ۹ر محرم الحرام ۱۲۶۲ھ مطابق ۸رجنوری ۱۸۴۶ء بروز منگل دہلی میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا نام عبدالرحمٰن مونگیری ہے۔ان کا سلسلہ نسب شیخ عبدالقادر جیلانی سے جا ملتا ہے۔ابتدائی تعلیم دیسی مکتبوں اور سرکاری اسکول سے حاصل کی۔سید احمد کو تصنیف و تالیف کا بچپن ہی سے شوق تھا۔اردو زبان دانی پر کئی تصانیف لکھیں۔انھیں ان ادبی خدمات پر ۲۲رجون ۱۹۱۴ء کو خان صاحب کا خطاب ملا۔سیّد احمد کا انتقال ۷۲سال کی عمر میں ۱۱رمئی ۱۹۱۸ء کو ہوا۔[۳] ''فرہنگِ آصفیہ'' آپ کا نمایاں کارنامہ ہے۔

اردو لغت نویسی کی روایت ''فرہنگِ آصفیہ'' سے بہت پہلے پڑ چکی تھی ۔ابتدا ''خالق باری''، ''لغات گجری'' اور ''واحد باری'' سے ہوئی اور ترقی کے منازل طے کر کے آج ''اردو لغت تاریخی اصول'' تک پہنچی۔اُس دور کی اہم لغات میں جلال لکھنوی کی ''گنجینۂ زبان اُردو'' (۱۸۸۱ء) اور ''سرمایۂ زبان اردو'' (۱۸۸۶ء)، نیاز علی بیگ نکہت کی ''مخزن الفوائد'' (۱۸۸۶ء)، چرنجی لال کی ''مخزن المحاورات'' (۱۸۸۶ء)، مرزا محمد مرتضٰی علی، مچھو بیگ ستم ظریف کی ''بہارِ ہند'' (۱۸۸۸ء)، اشرف علی لکھنوی کی ''مصطلحات اردو'' (۱۸۹۰ء)، امیر مینائی کی ''امیر اللغات'' (۱۸۹۱ء۔۱۸۹۳ء)، غلام سرور لاہوری کی ''جامع اللغات'' (۱۸۹۲ء)، نور الحسن نیر کاکوروی کی ''نور اللغات'' (۱۹۲۴ء۔۱۹۳۱ء) وغیرہ شامل ہیں۔[۵]

''فرہنگِ آصفیہ'' کی ابتدا عرب سرائے سے ہوئی۔[۶] ''فرہنگِ آصفیہ'' اگرچہ ۱۸۹۲ء میں مکمل ہوئی۔لیکن اس کا آغاز

تالیف بہت قدیم ہے۔اس کی ابتدا ۱۸۶۸ء میں ہوئی اور ۲۴ سال کی مسلسل محنت کے بعد یہ مکمل ہوئی۔یے ''فرہنگِ آصفیہ'' مختلف ناموں سے موسوم ہے۔جن میں اسے ''لغات اردو معروف بہ ارمغانِ دہلی''، ''مصطلحاتِ اردو''، ''ہندوستانی اردو لغات''، ''مجموعہ لغات اردو' اور ''سیّد اللغات'' بھی کہا گیا ہے۔''مصطلحاتِ اردو' کے نام سے ۱۸۷۱ء میں جو مجموعہ تیار ہوا وہ اس کی ابتدائی صورت ہے۔فرہنگ کے سببِ تالیف میں اس کا ذکر کیا ہے۔لیکن قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ یہ مجموعہ شائع نہیں ہو سکا تھا۔اس بابت حامد حسن قادری کی رائے ہے کہ یہ مجموعہ مدون ہو چکا تھا جسے بعد میں ''ارمغانِ دہلی'' کے نام سے مختصر رسالوں کی صورت میں شائع کیا گیا (کذا) جب کہ ڈاکٹر رؤف پاریکھ کے مطابق ایسا نہیں تھا۔یہ مجموعہ مدون ضرور ہو چکا تھا مگر رسالوں کی صورت میں شائع نہیں ہوا۔۱۸۷۸ء میں ''ارمغانِ دہلی'' کے نام سے سید احمد نے اس فرہنگ کا پہلا حصہ طبع کروایا اور تکمیل جاری رہی۔۹ ''ارمغانِ دہلی'' بڑی تقطیع میں ہے اور اس کا سائز ساڑھے دس انچ ضرب آٹھ انچ ہے۔جس کے کل صفحات کی تعداد ۱۵۶ ہے۔ڈاکٹر پاریکھ نے اس کی لوح کی عبارت کو کم یابی کی وجہ سے اپنے مضمون ''فرہنگِ آصفیہ کی تدوین و اشاعت: چند غلط فہمیوں کا ازالہ'' میں نقل کیا ہے۔۱۰ اس حصے میں تقریباً دو ہزار الفاظ و مرکبات شامل ہیں۔تمام لغات الف ممدودہ پر مشتمل ہیں۔پہلا اندراج ''آ'' اور آخری ''اب سے'' ہے۔چند صفحات میں الف مقصورہ کا تعارف ہے۔۱۰ رسالوں کی صورت میں جب ''فرہنگِ آصفیہ'' شائع ہوئی تو اس کا نام ''ہندوستانی اردو لغات'' رکھا گیا۔یہ ماہانہ قسطوں کی صورت میں چھپی۔''مصطلحات اردو''، ''ارمغانِ دہلی'' اور ''ہندوستانی اردو لغات'' کا ذکر مولف نے فرہنگ میں کیا ہے کہ:

> ''مُصطلحات اردو، کا صرف مجموعہ تیار کیا۔'ارمغانِ دہلی' ایک وسیع لغت لکھی، کبھی ''لغات النساء'' جو صرف عورتوں کے الفاظ و محاورات پر مشتمل ہے کی تالیف کی اور جب مالی تنگی ہوئی تو صرف ارمغان دہلی کا خلاصہ کیا اور ''ہندوستانی اردو لغات'' کے نام سے رسالے نکالے۔''۱۱

کچھ عرصہ بعد اس کا نام ''فرہنگِ آصفیہ'' رکھا گیا۔یعنی یہ فرہنگ مختلف ناموں کے ساتھ پہلے حصوں اور رسالوں کی صورت میں شائع ہوئی۔اس کی تکمیل میں کتنا عرصہ لگا اس بارے میں بھی مختلف رائے ہیں۔اگر ۱۸۶۸ء سے آغاز اور ۱۸۹۲ء تک مکمل ہوئی تو عرصہ ۲۴ سال بنتا ہے۔بعض محققین اور مولف ''فرہنگ آصفیہ'' نے ۲۴ اور ۳۰ سال کا عرصہ بھی بتایا ہے۔۱۸۶۸ء سے ۱۸۹۲ء چوبیس سال بنے۔۳۰ نہیں لیکن اگر مولف ''فرہنگِ آصفیہ'' کے اس بیان کو سامنے رکھا جائے جو ان کے بہ قول ''غدر کے بعد جب دلی لٹی'' سے شروع ہوا اور ساتھ ہی جلد چہارم کی ایک تقریظ جو کہ ارشد گورکانی نے لکھی ہے جس میں یہ پتا چلتا ہے کہ سیّد احمد نے اپنی لغت کی تیاری کے لیے ۱۸۵۷ء کے بعد ہی غزلوں سے محاورات چھانٹتے تھے۔پھر اس کے بعد ہی ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن (۱۸۱۷ء۔۱۸۸۰ء) ۱۲ کی لغت کی تیاری میں ۷ سال (۱۸۷۳ء تا ۱۸۷۹ء) تک ان کی مدد کی۔اگر اس عرصہ کا بھی اضافہ کر دیا جائے تو ۳۰ سال کا عرصہ کہا جا سکتا ہے۔۱۳ جو رسالے قسط وار چھپے ہوئے تھے ان کو جلد اوّل اور جلد دوم میں تقسیم کیا گیا۔جلد اوّل، طبع اوّل ۱۹۰۱ء میں طبع ہوئی، جلد دوم ۱۹۰۸ء میں، جلد سوم جنوری ۱۸۹۸ء میں طبع ہوئی اور جلد چہارم ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔پہلی جلد کچھ اضافوں اور ترامیم کے بعد ۱۹۱۸ء میں دوبارہ شائع ہوئی۔

اس لغت کا ایک ایڈیشن ۱۹۷۷ء میں اردو سائنس بورڈ لاہور نے شائع کیا۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۴ء میں ترقی اردو بیورو (ہندوستان) نے ایک ایڈیشن شائع کیا تھا جس کو ۱۹۸۷ء میں اُردوسائنس بورڈ نے دوبارہ چھاپا۔ ۲۰۱۵ء میں وصی اللہ کھوکھر نے اس کو مرتب کیا اور پروگریسیو پبلشرز لاہور نے شائع کی۔[۱۴] ۲۰۰۲ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے حصہ اوّل تا چہارم شائع کیا اور اُردوسائنس بورڈ لاہور نے ۲۰۱۰ء میں (طبع عکسی بار ششم) شائع کیا۔

فرہنگ کا سائز ۲۶/۴ x ۲۰ ہے اور صفحات کی تعداد ۲۵۳۵ ہے۔ اس میں ساٹھ ہزار سے زائد دیگر زبانوں (عربی، ترکی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور انگریزی وغیرہ) کے وہ الفاظ شامل ہیں جو اردو زبان میں مستعمل ہیں۔ ان تمام الفاظ کے اشتقاق، مذکر، مونث، اسناد کے ساتھ واضح کیے گئے ہیں۔ فرہنگ میں الفاظ ومحاورات، فنی و پیشہ ورانہ اصطلاحات، رسوم و رواج، تہوار میلے ٹھیلے، قلعۂ معلیٰ کی بیگماتی زبان، طبیعات و فلسفہ، ضلع جگت، پھبتی، پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، دو سخنے، فقیروں اور سودے والوں کی آوازوں کی وضاحت کی گئی ہے۔[۱۵]

سیّد احمد کی جلد اوّل میں (الف تا ت)، جلد دوم میں (ٹ تا ژ)، جلد سوم (س تا ک) اور جلد چہارم میں (گ تا ی) تک کے لغات شامل ہیں۔ فرہنگ میں سیّد احمد نے ایک طویل و بسیط مقدمہ درج کیا ہے جس میں اردو لغات کا آغاز و ارتقا، اپنی سوانح حیات، اردو زبان کی پیدائش و دہلی کا قطعۂ تاریخ و سببِ تالیف و شکریہ پرستاران و معاونانِ فرہنگ آصفیہ، آواز کی کیفیت اور حرف کی اصلیت و زبان کا رواج، ابتدا میں کون سی زبان تھی اور پھر کس زبان کا رواج ہوا و، زبانوں کے مختلف ہو جانے کی وجہ، ساسانیوں کی رائے، انگریزی مورخوں کی رائے، مورخان ہندی کی رائے، مورخان اسلام کی رائے، اردو کی ماہیت اور اس کے رواج کا بیان، پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، نسبتیں، تشبیہ، محاورہ، اصطلاح، فصاحت و بلاغت، مطالب قصیدہ کا بیان، کراماتِ دہلی، پوشاک، ذہن کی رسائی اور سودا بیچنے والوں کی آوازیں اور رموزِ لغات کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔

سیّد احمد نے کہا ہے کہ: ''اس فرہنگ میں پچپن ہزار سے زیادہ مندرج ومندمج ہیں۔''[۱۶] جلد اوّل کا پہلا لفظ (الف) سے شروع ہوتا ہے اور آخری لفظ (تییَں) درج ہے۔

جلد اوّل کے آخر میں ''تجدید فرہنگ آصفیہ جلد اوّل بہ عہدِ پُرفیضِ عثمانیہ'' کے عنوان سے حکومتِ وقت کا شکریہ ادا کیا گیا ہے اور ''تقریظ برائے ''فرہنگِ آصفیہ'' از جناب نواب محمد نقی خان صاحب قمر گیاوی مولف آفتابِ اردو قمر اللغات'' شامل ہے۔ (ص ۶۶۱)

جلد دوم کی ابتدا جلد اوّل ہی کی طرح ہوئی ہے۔ اس کا پہلا حرف ''ٹ'' اور لفظ ''ٹابر'' ہے جب کہ آخری لفظ ''ژیاں'' ہے۔ اس کے بعد صحت نامہ جلد دوم فرہنگ آصفیہ شامل ہے۔

جلد سوم کا پہلا حرف ''س'' اور آخری لفظ ''کیوں نہیں'' ہے۔

جلد چہارم کا پہلا حرف ''گ'' اور آخری لفظ ''ییلاق'' ہے۔ اس جلد کے آخر میں رموزِ لغات، فرہنگ آصفیہ کا خاتمہ اور اخیر معاونوں کا شکریہ اور اس کے علاوہ اس زمانے کے علما و فضلا کی تقاریظ شامل ہیں جن میں فرہنگ کے تکمیلی مراحل اور مصائب کے علاوہ

بھی بہت سی مفید معلومات شامل ہیں۔ ۱۷

(۲)

امیر احمد مینائی ۱۶ر شعبان ۱۲۴۴ھ مطابق ۲۱ر فروری ۱۸۲۹ء ۱۸ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام کرم محمد مینائی ہے اور سلسلہ نسب حضرت عباس بن عبدالمطلب عمِ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جا ملتا ہے۔'' ۱۹ حضرت مخدوم شاہ مینا کی نسبت سے مینائی کہلاتے ہیں۔ ۲۰ امیر مینائی سنی مسلک سے تھے۔ آپ چھے سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا اور پھر امیر مینائی کی پرورش ان کے بڑے بھائی مفتی طالب حسن نے کی۔ امیر مینائی نے اس دور کے بہترین اساتذہ سے تعلیم حاصل کر کے عربی، فلسفہ، منطق، فقہ اور اصول فقہ، طب جفر اور دوسرے علوم پر عبور حاصل کیا۔ ۲۱ اردو زبان و بیان کے لیے آپ نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ جس کی سب سے بڑی مثال ''امیر اللغات'' کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ امیر اللغات سے قبل لغت نویسی میں ان کی اہم تصانیف ''بہار ہند''، ''سرمۂ بصیرت''، ''معیار الاغلاط''، ''محاورات ومصادر''، ''نمونۂ لغت اردو'' وغیرہ شامل ہیں۔ ۲۲ امیر مینائی کا انتقال ۷۱ برس سات مہینے اور ۲۰ دن کی عمر میں ۱۳ر اکتوبر ۱۹۰۰ء کو ہوا۔ ۲۳

۱۸۸۴ء میں سر الفرڈ لائل (لیفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی چیف کمشنر اودھ) کی فرمائش پر نواب کلب علی خان نے امیر مینائی کو اردو کی لغت مرتب کرنے کا کام سونپا۔ امیر مینائی نے لفظ آنکھ کے الفاظ ومحاورات کا ایک نمونہ تیار کیا۔ جو کہ نمونۂ امیر اللغات کے نام سے ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا۔ ۲۴ امیر مینائی نے یہ الفاظ ومحاورات صرف ان دو سالوں ہی میں جمع نہیں کیے بلکہ ''امیر اللغات'' کے دیباچے میں وہ فرماتے ہیں کہ:

> ''میں نے ہوش سنبھالا، آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھا کہ اچھے اچھے اہلِ زبان دان سرزمین سخن کے فرماں رواں ہیں۔
> انھیں صحبتوں میں اردو زبان کی چھان بنان کا شوق مجھے بھی ہوا'' ۲۵

''نمونۂ امیر اللغات'' ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۲۶ اس نمونے کے دو حصے تھے پہلے حصے میں لفظ آنکھ کے تقریباً چار سو محاورات شامل تھے ۲۷ اور دوسرے حصے میں ''امیر اللغات'' کا لائحہ عمل پیش کیا گیا تھا۔ اس میں زبان دانوں کی ایک کمیٹی کی منصوبہ بندی، لغات کے اندراجات کی اصول وضوابط، قواعدی نوعیت اور لغت پروفوں کی پہلے اہل علم کے پاس بھیجنے اور ان سے مشوروں کے بعد چھپوانے کی ہدایات درج تھیں۔ ۱۸۸۶ء ہی میں نواب کلب علی خان کا انتقال ہو گیا اور سر الفرڈ لائل کا تبادلہ ہو گیا۔ امیر مینائی کو ''امیر اللغات'' کی تیاری کے لیے مالی امداد کی بھی اشد ضرورت پڑی اور پھر ۱۸۸۸ء میں امیر اللغات کے متعلق خیالات جاننے کے لیے مختلف شہروں لکھنؤ، فیض آباد، بنارس اور پٹنہ کا سفر کیا۔ ۲۸

نواب کلبِ علی خان کے بعد نواب مشتاق علی خان تخت نشین ہوئے اور اعظم الدین خان وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ انھوں نے امیر کی تنخواہ ۲۱۶ روپے سے کم کر کے صرف ۱۱۶ روپے کر دی۔ امیر مینائی کے لیے لغت کی تیاری کرنا انتہائی مشکل ہو گیا کیوں کہ اسی اثنا میں (۱۸۸۸ء) میں امیر مینائی نے لغت کی تیاری کے لیے ایک دفتر بھی ''دفتر امیر اللغات'' ۲۹ کے نام سے قائم کر لیا تھا۔

''امیر اللغات'' کے لیے نواب مشتاق علی خان نے سولہ ہزار روپیہ قرض دیا تھا۔ جس کی ادائیگی امیر ہی کے سر پر تھی۔ ان نامساعد حالات میں امیر اللغات کا پہلا حصہ (الف ممدودہ) ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا۔۳۰ امیر اللغات کی دوسری جلد (الف مقصورہ) ۱۸۹۳ء میں مطبع مفید عام، آگرہ سے شائع ہوئی۔ دونوں جلدیں ایک ہی مطبع سے شائع ہوئیں۔ تیسرا حصہ حرف ب بھی ۱۸۹۵ء میں تیار ہو چکا تھا لیکن اس کی اشاعت کا سرمایہ نہیں تھا۔۳۱ (تیسری جلد پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ۲۰۱۰ء میں شائع ہو چکی ہے۔) جس کو ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے مرتب کیا۔ پ کے لغات کا چوتھا حصہ زیر تالیف تھا کہ ۱۹۰۰ء میں امیر مینائی کا انتقال ہو گیا۔ امیر اللغات کی جلدوں کے بارے میں غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ لیکن امیر اللغات صرف ان تین جلدوں پر ہی مشتمل لغت ہے۔۳۲

تینوں جلدوں کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوا ہے۔

امیر اللغات کی پہلی جلد (۳۱۷) صفحات پر مشتمل ہے جس کا پہلا اندراج ''آ'' اور آخری ''آئینے میں منہ تو دیکھو'' ہے۔ جلد اوّل کے آغاز میں مختصر سا مقدمہ دیا گیا ہے۔ جس میں اردو زبان کی تاریخ کے حوالہ سے کمی محسوس ہوتی ہے۔ تمام اندراجات کو امیر مینائی نے ابواب کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے جیسے باب الف، باب الف مع الالف اور پھر فصل الف ممدودہ مع بائے موحدہ، فصل الف ممدودہ مع بائے فارسی وغیرہ۔ جب کہ جلد دوم کے آغاز پر تقریظیں شامل کی گئی ہیں۔۳۳

جلد دوم، ص ۳۲۳، ۳۳۶ تا ۶۵۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا اندراج ''اب'' ہے اور آخری ''اے یہی تو ہے۔'' دونوں جلدیں ۲/۱-۹ x ۱۳ کی تقطیع میں عمدہ لکھائی کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔۳۴

تیسری جلد (حرف ب) ۳۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا اندراج ''بااین ہمہ'' اور آخری بیہڑ ہے۔ ''مسطر کا سائز سوا آٹھ انچ اور ساڑھے پانچ انچ ہے۔۳۵ امیر اللغات جلد سوم کا مقدمہ ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے لکھا ہے۔ جس میں سب سے پہلے اس جلد کا تعارف، امیر اللغات کی جلدوں کی صحیح تعداد اور اس کے اصول لغت نویسی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آخر میں امیر اللغات جلد سوم کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔

(۳)

(۴)

اس مقالے میں ہمیں اعتراضات کا جائزہ بھی لینا ہے جو کہ مولف ''فرہنگِ آصفیہ'' نے ''امیر اللغات'' پر کیے ہیں تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ آخر ان اعتراضات کی نوعیت ہے کیا۔ اگرچہ مختلف محققین نے بھی اس بارے میں اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ لیکن ہم بھی اپنی معلومات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں کہ آخر اتنے سخت الزامات کا سبب کیا تھا؟ سیّد احمد نے ''فرہنگِ آصفیہ'' میں تحریر کیا ہے کہ:

> ''تصنیف کے ڈاکوؤں نے ہماری تصنیف پر ہاتھ مارا اور دن دہاڑے ڈاکہ ڈالا۔ لیکن اس خدا کی خدائی کے قربان جایئے، جس نے ان نامرادوں کو انجام پر نہ پہنچنے دیا۔ بعض نامی گرامی شاعروں، عربی فارسی کے ماہروں۔ فن لغت سے ناآشناؤں نے ارمغان دہلی کا چربہ اتار کر لغت تراشی پر کمر باندھی۔۔۔۔ اگرچہ ۹۲-۱۸۹۱ء میں اس پر ڈیڑھ

> برس تک اکمل الاخبار دہلی میں بحث ومباحثہ طبع ہوتا رہا ان کی فروگذاشت وعدم تحقیق لغات سے انھیں آگاہ کیا گیا۔ مگر وہ صرف الف ہی تک شائع کر کے رہ گئے ۔۔۔۔ ناظرین ودل بستگان اردو لغات فرہنگِ آصفیہ و امیر اللغات کو سامنے رکھ کر مقابلہ فرمائیں۔۔۔۔ ارمغان دہلی اگر نہ ملے تو ہمارے دفتر میں آکر مقابلہ کرلیں ورنہ ''فرہنگِ آصفیہ'' ہی کافی ہے۔''۳۶

انھوں نے امیر کے لیے ڈاکو، اچکے، نامراد اور تصنیف چوٹنا جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جلد چہارم میں لکھتے ہیں کہ:

> ''امیر مینائی جنھوں نے اس اخیر عمر میں ''امیر اللغات'' کے دو باب صرف الف ممدودہ ومقصورہ کے ہو بہو ''ارمغان دہلی'' کا چربہ اتار کر شایع فرمائے۔''۳۷

فرہنگ میں کئی بار الزامات کی بوچھاڑ کی ہے کہ:

> ''ڈیڑھ برس تک اکمل الاخبار نے اس کی خاک اڑائی اور ثابت کیا کہ فن لغت اور ہے اور فن عروض اور۔''۳۸

کبھی کہا کہ: ''تصنیف کے چوٹوں [(چوٹا۔ ہ اسم مذکر، چور، اٹھائی گیر، اچکا) یہ معانی ''فرہنگِ آصفیہ'' ج ۲ ص ۱۲۵ میں] نے میرا بہت دل خراب کیا۔ تصنیف چوٹنا سے مراد پرانی تصنیف میں تصرف کر کے اپنی تصنیف قرار دینے والا جیسے ہماری لغت کے بہت سے چوٹٹے ہمارے زمانے میں دہلی اور رام پور وغیرہ میں ہوئے۔''۳۹

''فرہنگِ آصفیہ'' اور ''امیر اللغات'' پر جو ایک عرصہ سے اکمل الاخبار اور دیگر اخبارات میں مخالفانہ بحث جاری تھی اس کے ضمن میں سرمور، ''گزٹ ناہن'' میں اپنا موقف بیان کرتے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: ''اگر درج ذیل امور پر غور کرلیا جائے تو یہ بے ہودہ بحث ہی ختم ہو جائے گی۔ امیر مینائی بھی قابل احترام ہیں اور ان کا کام بھی تعریف کے قابل ہے جس کی ابھی پہلی جلد شائع ہوئی ہے دوسری طرف ''فرہنگِ آصفیہ'' وارمغان دہلی یا سید اللغات کے مولف نے ایسی زندگی کے بیس بائیس سال کی ان تھک محنت سے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کی خوبیوں کی بدولت آج سید احمد دہلوی کا نام دنیا کے بڑے ناموں میں شمار ہوتا ہے مگر ان دونوں لغات کے درمیان جو علمی چپقلش کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے وہ انتہائی افسوس ناک بات ہے۔ اس بحث کو دونوں طرف سے ختم ہو جانا چاہیے اور ''مضمون کو انصاف پسند لوگوں کے انصاف اور مقابلہ کو مبصرین کی حق شناسی کے واسطے چھوڑ دیں۔''۴۰

اس تبصرے کی آخری لائنیں ہمیں دعوت تحقیق دیتی ہیں کہ اس موضوع کو ثبوت اور دلائل کی روشنی میں منطقی انجام تک پہنچایا جائے۔

(۴)

اگر چہ اس موضوع پر مختلف لوگوں نے اظہارِ خیال کیا ہے جیسے:

☆ ڈاکٹر رؤف پاریکھ اس بابت رقم طراز ہیں کہ: ''سیّد احمد نے یہ بے بنیاد الزام لگایا ہے اور اس کی جو تردید حامد حسن قادری اور قاضی عبدالودود نے بہ دلائل کر دی ہے وہ کافی ہے۔''۴۱

☆ حامد حسن قادری کہتے ہیں کہ: ''امیر اللغات'' فرہنگ آصفیہ کی ہو بہو نقل نہیں ہے••• بہر حال محنت تو دوسرے لغت نویسوں نے بھی کی ہے بس فرق صرف اتنا ہے کہ جس وقت امیر نے اپنی لغت مرتب کی تو ان کے سامنے ''فرہنگِ آصفیہ'' کا نمونہ موجود تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھوں نے اس کا چربہ کیا ہے••• امیر نے صرف فرہنگ سے استفادہ کیا ہے اور خود تحقیق کر کے غیر ضروری اندراجات کو ترک کیا ہے اور بہت سے الفاظ و محاورات جو فرہنگ میں درج ہونے سے رہ گئے تھے ان کو شامل لغت کیا ہے۔ سند کے اشعار میں بھی واضح فرق نظر آتا ہے۔''۴۲

☆ قاضی عبدالودود اس ضمن میں فرماتے ہیں کہ: ''مولف لغت نویسی کے میدان میں قدم رکھنے کے بعد سمجھنے لگے تھے کہ یہ میدان ان کے لیے مخصوص ہے۔''۴۳

(۵)

اب ذیل میں مذکورہ لغات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے جو کہ الف ممدودہ اور الف مقصورہ پر مشتمل ہے۔

۱۔☆ ''فرہنگِ آصفیہ'' اور ''امیر اللغات'' کے حوالے سے ایسے الفاظ و محاورات کی نشان دہی کی جائے گی جو کہ ''فرہنگِ آصفیہ'' میں موجود نہیں ہیں جب کہ امیر مینائی نے ان ہی الفاظ کو اپنی لغت ''امیر اللغات'' میں شامل کیا ہے مثلاً:

الف ممدودہ

آب آ جانا۔ آب آہن۔ آب آئینہ۔ آب اتر جانا۔ آب انگور۔ آب باران۔ آب پاش۔ آب پاشی کرنا۔ آب پاشی ہونا۔ آب پیکاں۔ آب تیر۔ آب تیغ۔ آب جو۔ آب خاصہ۔ آب خجلت یا خجلت۔ آب خورے بھرنا۔ آب دُر۔ آبدست کا بھی سلیقہ نہیں۔ آبِ دندان۔ آبِ دہن۔ آبدیدہ۔ آبدیدہ رہنا۔

آپ آپ ہی ہیں وہ وہی ہیں۔ آپ آئے بھاگ آئے۔ آپ اب خیر سے گھر کو سدھاریے۔ آپ بلی نانگہ سے تو نہیں آئے ہیں۔ آپ گھر سے لڑ کر تو نہیں آئے ہیں۔ آپ نے صبح کس کا منہ دیکھا تھا۔ آپ اپنے حال میں ہونا۔ آپ اپنے حق میں کانٹے بونا۔ آپ اتنا نہ لگ چلیے۔ آپ ایسی ہی باتوں سے تو مقبول ہوتے ہیں۔ آپ کا کیا پوچھنا۔ آپ کا کیا کہنا/آپ کی نہ کہیے۔ آپ بڑے صاحبِ شوق ہیں۔ آپ بھی اپنے وقت کے لال بجھکڑ ہو۔ آپ بھی طرفہ معجون ہیں۔ آپ بھی عجیب معصوم ہیں۔ آپ بھی کتنا بات کو پہنچتے ہیں۔ آپ تو ڈال کے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ آپ تو صاحبزادے ہیں۔ آپ تو عقل کے پتلے ہیں۔ آپ تو ولی آدمی ہیں۔ آپ کیا خوب سمجھے ہیں۔ آپ کے بھی صدقے جایئے یا قربان جایئے (یہ جملے ہجو کے طور پر بولے جاتے ہیں) آپ بہت دور ہیں۔ آپ بھی بھلے مانس ہیں۔ آپ بھی عجب ذات شریف ہیں۔ آپ بھی کتنے بھلے آدمی ہیں۔ آپ بیڈھب آدمی ہیں۔ آپ سے بہت بہت امید ہے۔ آپ سے خدا پناہ میں رکھے۔ آپ کو کوئی کم نہ سمجھے۔ آپ میں بھی کوٹ کوٹ کر خوبیاں بھری ہیں)۔ ''امیر اللغات'' میں یہ صرف جملے دیے گئے ہیں۔ باقی وضاحت نہیں ہے۔ آپ بھلے اپنا گھر بھلا۔ آپ بھلے تو جگ بھلا۔ آپ بھولے استاد کو لگائے/آپ بھی اتنے ہوئے۔ آپ بھی بڑے وہ ہیں۔ آپ بھی عجب چیز ہیں۔ آپ تو گرم کر کے شربت پلاتے ہیں۔ آپ جانیں اور آپ کا ایمان۔

آپ دنیا میں ہیں کیا میں دنیا میں نہیں۔آپ ڈال ڈال ہیں تو میں پات پات۔آپ ڈوبے تو جگ ڈوبا۔آپ ڈوبے تو ڈوبے اور کو بھی لے ڈوبے۔

آتا تو سبھی بھلا تھوڑا بہت کچھ جاتا۔تو وڑو ہی بھلے دَلِدر ار اور دکھ۔آتا ہو تو ہاتھ سے نہ نجیے جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجیے۔آتکو آتے آتے رہ جانا۔ آتیان۔آتے بھلے نہ جاتے۔آتی جاتی چوٹ نظر نہ آنا۔آتے کا منہ دیکھتی تھی جاتے کی پیٹھ۔آتے کو روکتے نہیں جاتے کو ٹوکتے نہیں۔آتی ہے ہاتھی کے پاؤں اور جاتی ہے چیونٹی کے پاؤں۔آتش افروختہ۔آتش افروز۔آتش پنہاں۔آتش تر۔آتش جانسوز۔ آتش دل۔آتش دوست دشمن نداندا۔آتش رنگ۔آتش زرتشت۔آتش طور۔آتش قدم۔آتش موسیٰ۔آتش نفس۔آتش نمرود۔ آتشِ شیشی۔آتشبازی بنانا۔آتش بازی بننا۔آتش بازی چھوٹنا۔آتش بازی چھوڑنا۔آتش بازی کا دیو۔آتش بازی کا طاؤس۔ آتشک کا جھلسنا۔آتشک کا اڑ کے لگ جانا یا آتشک لگنا۔آتشک نکلنا۔آتشک ہو جانا۔آتما کوسنا۔آتما کلپنا/آتما کی آنچ بری ہوتی ہے۔آتما میں آگ لگی ہے۔آتما میں پڑے تو پرماتما کی سوجھی۔

آٹا دال۔آٹا دال آلو بھی۔آٹا کر دینا۔آٹا گوندھنا۔آٹا مسلنا۔آٹا نبڑا الو چا سٹکا۔آٹا نہیں تو دلیا جب بھی ہو جائے گا۔آٹا ہو جانا۔ آٹے دال کا بھاؤ بتا دینا۔آٹے دل کی فکر۔آٹے کا خمیر۔آٹوٹنا۔آٹھ ہار نو تیوہار۔آٹھ پہر چونسٹھ گھڑی۔آٹھ پہر میان سے باہر رہنا۔ آٹھ جولاہے نو حقّا، پسر بھی تھلم تھکّا۔آٹھ گاؤں کا چودھری اور بارہ گاؤں کا راو، اپنے کام نہ آئے تو ایسی تیسی میں جاؤ۔آٹھوں کے آٹھوں۔ آٹھویں۔آٹھویں ساتویں۔

آثار اچھے یا برے ہونا۔آثار کافی رہنا۔آثار بندھ جانا۔آثار پائے جانا۔آثار پڑنا۔آثار چھا جانا۔آثار دکھائی دینا یا نظر آنا۔ آثار دکھلانا۔آثار ڈالنا۔آثار رکھنا۔آثار ظاہر ہونا۔آثم۔

آج آئے کل چلے۔آج اس کا دور ہے، کل اس کا زمانہ ہے۔آج تو چُوٹ ہے۔آج سے کل نزدیک ہے۔آج کا دن۔آج کا کام آج ہی کرنا چاہیے۔آج کا کام کل پر ٹالنا۔آج کا کام کل پر رکھنا یا اٹھا رکھنا۔آج کدھر آ نکلے۔آج اس کا زمانہ ہے۔آج کل تمھارے نام کمان چڑھتی ہے۔آج کل سے۔آج کل میں۔آج کے آج اور آج کے سو برس میں۔آج کیا جاتی دنیا دیکھی ہے۔آج کے بنیے کل کے سیٹھ۔آج کے دن۔آج کی رات۔آج آ گئی کل آئے۔آج میں کل تُو۔آج میں نہیں یا وہ نہیں۔آج میں ہوں اور وہ ہے۔آج نصیبوں سے ہاتھ لگے ہو۔آجھانکنا۔

آچا۔آچڑہنا۔آچکنا۔آچلنا۔آچھپنا۔

آخر اپنی ذات پر گیا۔آخر الڈ انگی۔آخر فنا۔آخری پوشاک۔آخری دور۔آخری محبت۔آخری ملاقات۔آخریں۔آخرت بننا۔ آخرت سنورنا۔آخرت کا بھلا۔آخرت کا سودا۔آخرت کی خیر۔آخرت کی کمائی۔آخونزادہ۔

آداب عرض کرنا۔آداب عرض ہے۔آداب کرنا۔آداب ہے۔آدبانا۔آدَلّدر کا ندھے چڑھ بیٹھ۔آدم با آدم مے رسد۔آدم بے

سایہ۔آدم خاکی۔آدم راگندم۔بہشت لہ سارَد۔آدم شناس۔آدم گوٹی یاصحرائی۔آدم کی اولاد۔آدمی اپنے مطلب کے لیے پہاڑ کے پتّبر ڈ ہوتا ہے۔آدمی اپنے مطلب میں اندکا ہوتا ہے۔آدمیان گم شدند ملک حراخر گرفت۔آدمی بننا۔آدمی بُو۔آدمی پانی کا بلبلا ہے۔ آدمی پر جیسی پڑتی ہے ویسا سہتا ہے۔آدمی پیٹ کا کتا ہے۔آدمی ٹھوکریں کھا کر سنبھلتا ہے۔آدمی جانے سُبے سونا جانا کسے۔آدمی را آدمیت لازم است۔آدمی سا پکسید وکوئی نہیں۔آدمی کا آدمی ہی سے کام نکلتا ہے۔آدمی کا بچہ۔آدمی کا جنگل۔آدمی کا شیطان آدمی ہے۔آدمی کچھ کھو کے سیکھتا ہے۔آدمی کو آدمی سے سو دفعہ کام پڑتا ہے۔آدمی کو ڈھائی گز زمین کافی ہے۔آدمی کیا جو آدمی کو نہ پہچانے۔ آدمی کیا جو آدمی کی قدر نہ کرے۔آدمی کی دوا آدمی ہے۔آدمی کی شکل بنو۔آدمی کی شکل ہے۔آدمی کے جامے میں آنا۔آدمی کی قدر مرے پر ہوتی ہے۔آدمی کی کسوٹی معاملہ ہے۔آدمی نہ آدم زاد۔آدمی ہو یا آسیب۔آدمی ہو یا بے دال کے بُودم۔آدمی ہو یا بے نون کے سنگ۔آدمی یا جانور۔آدمی ہے۔آدمی ہیں مگر آدمی نہیں۔آدمیت آنا۔آدمیت کے جامے میں آنا۔آدمیت سے گزر جانا۔آدھا آپ گھر آدھا سب گھر۔آدھا آدھا۔آدھا تہائی۔آدھا تیسا یا آدھے کا تیسہا۔آدھا تیسا یا آدھے کا تیسا ہو جانا۔آدھا رہ جانا۔آدھا نام لینا۔آدہ پاؤ آٹا چوپال میں رسوئی۔آدھ سیر آٹا، آدھ سیر آٹے سے لگ جانا۔آدہم سا جہار آدھوں آدھ۔آدھے اساڑہ تو بیری بھی برسے۔آدہی بات۔آدہی بات کہنا۔آدہی بات نہ اٹھنا۔آدہی بات نہ پوچھنا۔آدہی دنیا آباد آدہی ویران۔آدہی رات اور گھر کا پروسنے والا۔آدی رات کو جمائی آئے شام سے منھ پھَیلائے۔آدھے کا تہا ویا آدھے کی تہائی۔آدھے کا ساجھی یا شریک۔ آدھی کا ساجھی برابر کی چوٹ۔آدہی کو چھوڑ ساری کو دوڑنا۔دوڑے آدہی رہے نہ ساری۔آدہی کو چھوڑ ساری کو دبائے ایسا ڈوبے تھانہ پائے۔آدھے گاؤں دوالی آدھے گاؤں ہولی۔آدھے ماگھے کملی کاندھے۔آدہمکنا۔آدیکھو۔آدینہ۔

آرا کشی کرنا۔آریا یا آرے چلانا۔آرا یا آرے چلنا۔آرا یا آرے کھینچنا۔آرے سر پر چل گئے تو بھی مدار ہی مدار۔آرے سے چیرنا۔ آراستہ کرنا۔آراستہ ہونا۔آرام اُڑ جانا۔آرام پسند۔آرام پہنچنا۔آرام تلخ ہونا۔آرام جانا۔آرام چھوڑ دینا۔آرام رسیان۔آرام کرسی۔آرام کھونا۔آرام کہینچنا۔آرام کیجیے۔آرام پہنچانا۔آرام ملنا۔آرام میں رہنا۔آرام میں ہونا۔آرام نہ دیکھنا۔آرام نہ لینا۔ آرائش بننا۔آرائش دینا۔آرائش کے پھول۔آرائش کے تخت۔آرائش لوٹنا۔آرائش لٹنا۔آرتی کے وقت سو گیے مال بھوگ کے وقت جاگ اٹھے۔آرڈری۔ آرڈر۔آرزو برلانا۔آرزو بڑھانا۔آرزو پوری کرنا۔آرزو پوری ہونا۔آرزو ٹپکنا۔آرزو چھپانا۔ آرزو خاک میں ملا دینا۔آرزو خاک میں مل جانا۔آرزو دل کی دل میں رہ گئی۔آرزو کہنا۔آرزو رہ جانا۔آرزو ساتھ پہچانا۔آرزو عیب نہیں۔آرزو کا خون ہونا۔آرزو گود میں پہچانا۔آرزو مٹ جانا۔آرزو خام۔آرہنا۔آری جانا۔آری کرنا۔آریا سماج۔آریا درت۔

آڑ باندھنا۔آڑ پار۔آڑ توڑنا۔آڑ ڈھونڈنا۔آڑ کرنا۔آڑ لگانا۔آڑ لینا۔آڑ میں چھپنا۔آڑا اتارنا۔آڑا پاجامہ۔آڑا چڑھانا۔آڑا کھینچ جانا۔آڑا گوڑی (آڑا گوڑی چڑھانا۔آڑا گوڑی دینا۔آڑا گوڑی مارنا) آڑ لگالینا۔آڑلگنا۔آڑا ماننا۔آڑی بیل۔آڑی ترچھی سنانا۔ آڑی ترچھی سننا۔آڑی گوٹ۔آڑی ہیکل۔

آ ز۔ آزادانہ رائے۔ آزادانہ وضع۔ آزاد رکھنا۔ آزاد طبع۔ آزاد کا الف۔ آزاد کا شجرہ۔ آزاد کا قشقہ۔ آزاد لوگ۔ آزاد وَضع۔ آزادہ۔ آزادہ مزاجی۔ آزار پہچاننا۔ آزار پہنچانا۔ آزار پہنچنا۔ آزار پھیلنا۔ آزار پیٹ میں ہونا۔ آزار کھینچنا۔ آزار لگانا۔ آزاری آزِر۔ آزردہ رہنا۔ آزمائش میں نہ ٹھہرنا۔

آس بگانی جو تکے وہ جھوٹ ہی مر جائے۔ آس پوری ہونا۔ آس جاتی رہنا۔ آس رہنا۔ آس سے ہونا۔ آس کا نام دنیا ہے۔ آسا جئے نراسا مرے۔ آسا گاسا۔ آسا کے گلگلے۔ آسا کے نام کا چھلا اٹھانا یا اٹھا رکھنا۔ آسام۔ آسان جاننا یا آسان سمجھنا۔ آسایش اٹھانا۔ آسایش پانا۔ آسایش دینا۔ آسایش طلب۔ آسایش کیجیے۔ آسایش ملنا۔ آس بی بی۔ آس بی بی کی ٹکیاں۔ آس پاس برسے۔ آسانے کو بوسہ بود ینا۔ آستائی۔ آستین یا آستین الٹنا۔ آستین پکڑنا۔ آستین یا آستین چڑھنا۔ آستین یا آستین چننا۔ آستین سے آنکھیں (یا آنسو) پوچھنا۔ آستیں سے چراغ بجھانا۔ آستین کا چاک۔ آستین کا سانپ بننا۔ آستین کا سانپ ہونا۔ آستین کا کف۔ آستین کا کوس۔ آستین کے پھول۔ آستین کے چین۔ آستین میں چھری دیکھنا آستین میں چھری رہنا۔ آستین میں کوش پڑا۔ آستین میں کوش پڑنا۔ آستین میں کوش ڈالنا۔ آستین دار کرتی۔ آسٹریلیا۔ آسرا باندھنا۔ آسرا بندھانا۔ آسرا بندھنا۔ آسرا تکنا۔ آسرا توڑ دینا۔ آسرا رہنا۔ (آسکتی گرا کنویں میں کہے ابھی کون اٹھے۔ آسکتی گرا کنویں میں لہے یہیں ہلے)۔ آسکنا۔ آ یگون آسمان پر پہنچا دینا۔ آسمان پر ٹوپی پھینکنا۔ آسمان پر چڑھا کے اتارنا یا گرانا۔ آسمان پر چڑھنا۔ آسمان پر دماغ پہنچانا۔ آسمان پر دماغ چڑھا دینا۔ آسمان پر دماغ چڑھنا۔ آسمان پر دماغ رہنا۔ آسمان پر دماغ پہنچنا۔ آسمان پر سر پہنچنا۔ آسمان پر لے اڑنا۔ آسمان پر مزاج ہونا۔ آسمان پر ہونا۔ آسمان پہاڑ کے تھگلی لگانا۔ آسمان پہاڑ تھگلی لگائے۔ آسمان پھٹ پڑے۔ آسمان پھٹنا۔ آسمان تک جانا۔ آسمان تھرانا یا کانپنا۔ آسمان ٹوٹ پڑے۔ آسمان جاہ۔ آسمان پایہ۔ آسمان دُور ہے زمین سخت ہے۔ آسمان زمین ایک کر دینا۔ آسمان زمین سیاہ ہو جانا۔ آسمان زمین کا رونا۔ آسمان زمیں کھا گیے۔ آسمان زمین کے پردے میں نہیں۔ آسمان زمین کی خبر نہ ہونا۔ آسمان وزمین کیوں نہیں شق ہو جاتے۔ آسمان زمین ملا دینا۔ آسمان زمین میں پتا نہیں۔ آسمان زمین میں لٹکانا۔ آسمان زمین میں رُسوم پڑنا۔ آسمان زمین میں سناٹا ہوگیا۔ آسمان زمین میں فرق نہ رہے۔ آسمان زمین میں ہلا دینا۔ آسمان زمین ہلجانا۔ آسمان زمین پر پھٹ پڑنا۔ آسمان سر پر توڑنا۔ آسمان سر پر گرانا۔ آسمان سے اترنا۔ آسمان سے پتال تک جانا۔ آسمان سے تارے اتار لانا۔ آسمان سے ٹکر لینا۔ آسمان سے گزرنا۔ آسمان کا تارا۔ آسمان کا رکھا نہ زمین کا۔ آسمان کی باتیں۔ آسمان کے پار ہونا۔ آسمان کی چیل زمین کی اصیل۔ آسمان کی سیر کرنا۔ آسمان کی طرف دیکھنا۔ آسمان کے نیچے۔ آسمان گر جنا۔ آسمان گرنا یا گر پڑنا۔ آسمان میں ڈوب جانا۔ آسمان میں لگ جانا۔ آسمان نہ پھٹ پڑے۔ آسمان نے ڈالا زمین نے جھیلا۔ آسمان ہلا دینا۔ آسمان ہل جانا۔ آسمان ہونا۔ آسمانی آگ۔ آسمانی تھنپڑا۔ آسمانی زبان۔ آسمانی صدمہ۔ آسمانی غضب یا قہر۔ آسمانا۔ آسن مارنا۔ آسینی۔ آسودگانِ خاک۔ آسیب اترنا۔ آسیب زدہ۔ آسیب سر پر آنا ۔آسیب سر پر چڑھنا۔ آسیب سر سے اتارنا۔ آسیب سر سے اترنا۔ آسیب کا اتر۔ آسیب کا سر پر آ کر بولنا۔ آسیب کا سر پر کھیلنا۔ آسیب

کا گزر ہونا۔ آسیب کا لپٹنا۔ آسیب نہ آئے۔ آسیبی مکان۔ آسینہ۔

آشفتہ طبیعت۔ آشفتہ کر دینا۔ آشفت مُو۔ آشنا رہنا۔ آشنائی چھوڑ دینا۔ آشنائی رہنا۔ آشنائی کا جھوٹا۔ آشنائی کا سچا۔ آشنائی کھٹ کرنا ۔ آشنائی مُلّا تا سبق ۔ آشنائی بنا لینا۔ آشنائی نبھانا۔ آشوب اٹھانا۔ آشوب اٹھنا۔ آشوب بجانا۔ آشوب روزگار۔ آشوب گاہ۔ آشیاں (یا آشیانہ اٹھانا)۔ آشیاں یا آشیانہ اجاڑنا۔ آشیان باندھنا۔ اآشیان بلند کرنا۔ آشیان یا آشیانہ بنانا۔ آشیان یا آشیانہ بند سہنا۔ آشیان یا آشیان چھانا۔ آشیان کرنا۔ آشیان یا آشانہ لگانا۔

آغا میر۔ آغا میر کی دائی سب سیکھی سکھائی۔ آغاز انجام نہ سوچنا۔ آغاز بد کا انجام بد ہے۔ آغشتہ۔ آغشتہ کرنا۔ آغوش بھرنا۔ آغوش خالی کرنا۔ آغوش خالی ہونا۔ آغوش سے نکلنا۔ آغوش کا پالا۔ آغوش کشادہ یا کشودہ۔ آغوش کھول کر لپٹنا۔ آغوش کھولنا۔ آغوش گرم کرنا۔ آغوش میں آنا۔ آغوش میں بٹھانا۔ آغوش میں بیٹھنا۔ آغوش میں دبانا۔ آغوش میں رہنا۔ آغوش میں سونا۔ آغوش میں کھینچنا۔ آغون آغون غٹی دودھ پی پی کرمیاں ہوئے مٹی۔ آغون کرنا۔

آفت ٹالنا۔ آفت ٹلنا۔ آفت جان پر آنا۔ آفت جان پر لینا۔ آفت سر پر ڈالنا۔ آفت سر پر ہونا۔ آفت سر سے ٹالنا۔ آفت سر سے ٹلنا۔ آفت سے چھڑانا۔ آفت سے چھوٹنا۔ آفت طلب۔ آفت کا بنا ہوا۔ آفت کا گھر۔ آفت کا نمونہ۔ آفت کی پڑیا۔ آفت کی پون۔ آفت گزرنا۔ آفت کے لوگ۔ آفت گزرنا۔ آفت لانا۔ آفت مول لینا۔ آفت میں آجانا۔ آفت میں ڈالنا۔ آفت میں گھر جانا۔ آفت نازل رہنا۔ آفت نازل ہونا۔ آفت نصیب۔ آفتیں ٹوٹ ٹوٹنا کر آنا۔ آفتاب برآمد ہونا۔ آفتاب بلند ہون۔ آفتاب بنا دینا۔ آفتاب چھپ جانا۔ آفتاب سر پر آنا۔ آفتابِ شام۔ آفتاب غروب ہونا۔ آفتاب کا ایک نیزے یا سوا نیزے پر آنا۔ آفتاب کا طلوع کرنا۔ آفتاب کا مغرب سے نکلنا۔ آفتاب گرم یا تیز ہونا۔ آفریدگار۔ آفرینندہ۔ آفرین کہنا۔ آفرین ہو رہی ہے۔

آکسفورڈ۔ آکھٹکنا۔ آکھر۔ آکھڑا ہونا۔ آکھلاپن۔ آکھنا۔

آگ بگولا بنا دینا۔ آگ بگولا کر دینا۔ آگ بگولا بنا دینا۔ آگ بگولا بن جانا۔ آگ بگولا دھواں کہاں۔ آگ بھبھوکا۔ آگ بھری ہونا۔ آگ بھی نہ لگاؤں۔ آگ پانی۔ آگ پانی کا سنجوگ ہے۔ آگ پر تیل ٹپکانا۔ آگ پر رکھنا۔ آگ پر سینکنا۔ آگ پر لٹانا۔ آگ پر لکڑی یا کمان سیدھی کرنا۔ آگ پھیلانا۔ آگ پھیلنا۔ آگ تاپنا۔ آگ ٹھنڈی کرنا۔ آگ جانے بہار جانے رہو کنے والے کی بلا جانے۔ آگ جلانا۔ آگ جلنا۔ آگ جھڑنا۔ آگ جھونک دینا۔ آگ چمکنا۔ آگ دبانا یا دبنا۔ آگ دینا یا دبی ہونا۔ آگ دہکانا۔ آگ دہکنا۔ آگ دھونکنا۔ آگ رکھ دینا۔ آگ روشن کرنا۔ آگ روشن ہونا۔ آگ سا دہکتا ہے۔ آگ سرد ہونا۔ آگ کا بنا ہوا۔ آگ کا پھول۔ آگ کا پیڑ۔ آگ کا دریا۔ آگ کا کُرہ۔ آگ کا کھیل ہے۔ آگ کا گھر۔ آگ کا لوکا۔ آگ کا ہنسنا۔ آگ کو آگ مارتی ہے۔ آگ کو دامن سے ڈھانکنا۔ آگ کھائے منھ جلے ادھار کھائے پیٹ۔ آگ کہتے منھ نہیں جلتا۔ آگ کے آگے سب بھسم ہیں۔ آگ کی بڑھیا۔ آگ کے لوکے اٹھنا۔ آگ گڑی ہونا۔ آگ لگے پانی کہاں۔ آگ لگے تو بجھے جل سے، جل میں لگے تو بجھے

کہوکیسے۔آ گ مٹنا۔آ گ میں آ گ لگانا۔آ گ میں جھلس جانا۔آ گ میں بسوں ڈالنا۔آ گ میں آ گ جلانا۔آ گ میں چلنا۔
آ گ میں جو چیز پڑی وہ آ گ ہے۔آ گ میں پھونک دینا۔آ گ میں ڈالنا۔آ گ میں رکھ کے پھونک مارنا۔آ گ میں کود پڑنا۔
آ گ نگلنا۔آ گا باندھنا۔۔آ گے آ گے گبرو پیچھے پیچھے چیلا۔آ گے آ گے ہونا۔(آ گے بڑھو، آ گے چلو، آ گے دیکھو، آ گے مانگو) آ گے
پیچھے سب جل بسیں گے۔آ گے پیچھے کا خیال سونا۔آ گے پیچھے کوئی نہیں۔آ گے پیچھے ہاتھ دہرے ہونا۔آ گے جاتے گھٹنے ٹوٹیں پیچھے
دیکھتے آنکھیں پھوٹیں۔آ گے چلتے ہیں پیچھے کی خبر نہیں۔آ گے چل کر۔آ گے خدا کا نام محمد کا کلمہ۔آ گے خیریت ہے۔آ گے دہرا ہے۔
آ گے دیکھ کے چلنا۔آ گے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔آ گے دینا۔آ گے رکھنا۔آ گے قدم نہ اٹھنا۔آ گے قدم نہ بڑھنا۔آ گے قسمت۔ آ گے
کنواں پیچھے کھائی۔آ گے کو۔آ گے کے دانت۔آ گے کے دن پیچھے گئے ہر سے کیوں نہ بہت۔اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں
چگ گئیں کھیت۔آ گے نہ چلنا۔آ گاہی پانا۔آ گاہی دینا۔آ گاہی رکھنا۔آ گاہی ہونا۔آ گرہ۔

آل عبا۔آل کا انڈہ۔آلا پٹ جانا۔آلا و لے نوالا۔آلا رہنا۔آلا کرنا۔آلا کھیل جانا۔آلا کھیلنا۔آلا لگنا۔آ نگنا۔آلام۔آلٹپنا۔آلنگ
آلہا۔آلہا گانا۔آلے بالے۔آلینا۔

آم بُوَ آم کھاؤ ملی بوؤ املی کھاؤ۔آم پال رکھنا یا ڈالنا۔آم پھلنا یا ہونا۔آم پھلے نیو چلے نیو چلے ارنڈ پھلے اترائے۔آم تراشنا۔آم ٹپکنا۔
آم چوسنا۔آم ڈھل جانا۔آم کا ٹپکا لگنا۔آم کھانے سے کام یا پیڑ گننے سے۔آم کھائے پال کا خربوزہ کھائے ڈال کا پانی پیے نال کا۔آم
کے آم گٹھلی کے دام۔آم گھاس۔آم لو پال کے۔آم مچھلی کا ساتھ نہ ہوگا۔آم میں بُور آنا۔آم ہلانا۔آمادہ بیٹھنا۔آماس۔آماس
کرآنا یا آماس کر جانا۔آمدآمد پھیلنا۔آمد برآمد کے دن۔آمدن ارادت ورفتن باجازت۔آمدنی کے سر سہرا ہے۔ آمدورفت بند
ہونا۔آمدورفت جاری ہونا۔آمدورفت رہنا۔آمدورفت لگانا۔آمدورفت لگی رہنا۔آمرزش۔آمرزگار آملنا۔آمنا وصَدَقنا۔آمین
ہونا۔آمین اللہ۔آمین بالخیر۔آمین بالسر۔آمین بولنا۔آمین پکار کر کہنا۔آمین یارب العالمین۔

آن آن۔آن بان والا۔آن بند لینا۔آن جانا۔آن کہاں ہو گیا۔آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے۔آن واحد۔آنے جانے والا۔
آنا پائی۔آنا نہ پائی فریَ پا گسائی۔آنے پائی سے بیباق کرنا۔آنا کانی۔آنا کانی دینا۔آنا کانی کرنا۔آنا نکہ غنی تراند محتاج تراند۔آننا
ہلدی۔آنت کی آنت۔آنتیں الٹ جانا۔آنٹہ۔آنچ دینا۔آنچ کا کھیل۔آنچ کرنا۔آنچ بڑی ہونا۔آنچیں نکلتی ہیں۔آنچل۔آنچل
منھ پر لینا یا منھ پر رکھنا۔آنچل میں گرہ دینا۔آنحضرت۔آن سَروَر۔آن دختر راگا وخورد آندو۔آندھی آئے بیٹھ جائے مینہ آئے
بھاگ جائے۔آندھی تھمنا یا ٹھہرنا۔آندھی آئے یا مِنہ بڑسہا۔پینۂ سے ترسے۔آندھی چلنا۔آندھی حضرت بی بی کے دامن میں
باندھی۔آندھی روکنے کو جھاڑ دبانا۔آندھی کا ٹنا۔آندھی کا جھونکا۔آندھی کا شور۔آندھی کا کوا۔آندھی باندی کھانا۔آنر۔آنکھ آنکھ یا
آنکھیں آشنا نہیں۔آنکھ یا آنکھیں آشوب کرنا۔آنکھ یا آنکھیں ابل آنا۔آنکھ اٹھا کر نظر کرنا۔آنکھ اٹھ جانا۔آنکھ یا آنکھیں اٹھنے
آنا۔آنکھ اچٹ جانا۔آنکھ اونچی کرنا۔آنکھ اونچی ہونا۔آنکھ ایک نہیں کجلوٹیاں نو لو۔آنکھ بچی مال دوستوں کا۔آنکھ یا آنکھیں بدل کر

دیکھنا۔آنکھ بنانا۔آنکھ یا آنکھیں بند کیے چلے جاؤ۔آنکھ یا آنکھیں بہہ جانا۔آنکھ بھول چلنا۔آنکھ بیدار ہونا۔آنکھ پھسلنا۔آنکھ پھوٹے گی تو کیا بھوں سے دیکھیں گے۔آنکھ پیدا کرو۔آنکھ یا آنکھیں توتے کی طرح بدل لینا۔آنکھ یا آنکھیں تر ہونا۔آنکھ یا آنکھیں توتے کی طرح پھیر لینا۔آنکھ ٹیڑھی ٹیڑھی ہے۔آنکھ جا پڑی۔آنکھ جانا۔آنکھ جما کر دیکھنا۔آنکھ جوش کرآنا۔آنکھ چار کرنا۔آنکھ چار نہ کرنا۔آنکھ دوڑنا۔آنکھ دھوی دکھلائی ہے۔آنکھ دینا۔آنکھ یا آنکھوں سے آنسو ٹپکانا۔آنکھ سے آنسو نہ نکلا۔آنکھ سے آنکھ نہ چھپکنا۔آنکھ یا آنکھوں سے کبھی دیکھی ہے۔آنکھ یا آنکھوں سے ٹپکنا۔آنکھ یا آنکھوں سے جدا ہونا۔آنکھ یا آنکھوں سے چوں جھاڑنا۔آنکھوں سے خون ٹپکنا۔آنکھوں سے دور ہونا۔آنکھ یا آنکھوں سے رومال نہ سرکنا۔آنکھ سے ریتی ٹپکنا۔آنکھ سے سلام لینا۔آنکھ یا آنکھوں سے طوفان بپا ہونا۔آنکھ یا آنکھوں سے کبھی دیکھی نہیں ہے۔آنکھ سے لہوآنا۔آنکھ سے نہ دیکھوں۔آنکھ یا آنکھیں قدح کرانا۔آنکھ کا پانی بہ جانا۔آنکھ کا پردہ اٹھ جانا۔آنکھ کا پردہ جاتا رہنا۔آنکھ کا تارا سمجھنا۔آنکھ کا (یا آنکھوں کے) تل سفید ہونا۔آنکھ یا آنکھوں کا جھڑی لگنا۔آنکھ یا آنکھوں کا حجاب۔

آنکھ کا ڈھلکا۔آنکھ کا غبار۔آنکھ کا لحاظ۔آنکھ یا آنکھوں کا لہو کی بوٹی ہونا۔آنکھ یا آنکھوں کا ناسور ہو جانا۔آنکھ کان سے درست ہے۔آنکھ کڑی پڑنا۔آنکھ کڑی ڈالنا۔ آنکھ ہونا یار ہنا۔ آنکھ یا آنکھیں کھول کر دیکھنا۔آنکھ یا آنکھوں کے اشارے پر بیمار ہونا۔آنکھ پانا۔آنکھ یا آنکھوں پر تنکا رکھنا۔آنکھ یا آنکھوں پر چڑھنا۔آنکھ یا آنکھیں پرم ہونا۔آنکھ پہچاننا۔آنکھ پھڑکے چلنا۔آنکھ کی بدی آنکھ کی ٹھنڈک۔آنکھ کی حیا۔آنکھ کی سیل۔آنکھ کی کیچڑ۔آنکھ کی گردش۔آنکھ کی مروت۔آنکھ کی لجائی دہی پر آئی۔آنکھ للچائی ہوئی پڑنا۔آنکھ مندیلے۔آنکھ مندی۔آنکھ مندی اندھیرا پاس۔آنکھ موچی دھپ۔آنکھ میلی ہونا۔آنکھ یا آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آنا یا ڈبڈبانا۔آنکھ میں آنسو نہیں یا آنکھ میں ایک آنسو نہیں۔آنکھ میں آنسو نہیں اور کلیجا ٹوک ٹوک۔آنکھ (یا آنکھوں) میں پانی اترنا۔آنکھ میں پانی نہیں ہے۔آنکھ میں پھلی پڑ جانا۔آنکھ میں تھی شرم دل کی تھی نرم۔آنکھ میں جگہ کرنا۔آنکھ یا آنکھوں میں حیا نہ ہونا۔آنکھ میں شرم ہو تو جہاز سے بھاری۔آنکھ میں لگانے کو نہیں۔آنکھ یا آنکھوں میں موتیا بند ہو جانا۔آنکھ میں میل ہے اور اس میں میل نہیں۔آنکھ ناک سے درست ہے آنکھ ناک سے ڈرنا۔آنکھ نہ اٹھانا۔آنکھ نہ اٹھ سکنا۔آنکھ نہ جھپنا۔آنکھ نہ دیدہ کاڑھے کشیدہ۔آنکھ نہ کھل سکنا۔آنکھ نہ کھول سکنا۔آنکھ نہ ملاؤ۔آنکھ نہیں کہ کان نہیں۔آنکھ ہی پھوٹی تو بھون سے کیا کام۔آنکھوں آنکھوں میں (آنکھوں ہی آنکھوں میں) چرالینا۔آنکھوں آنکھوں میں رات لٹنا۔آنکھوں آنکھوں میں صبح ہونا۔آنکھوں پر پاؤ رکھنا۔آنکھوں پر پاؤں رکھیے۔آنکھوں پر جھپان پڑنا۔آنکھوں پر رومال ہونا۔آنکھوں پر رہنا۔آنکھوں پر زور پڑنا۔آنکھوں پر زور دینا۔آنکھوں پر (آنکھوں میں) غبار چھانا۔آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑنا۔آنکھوں تلے۔آنکھوں خاک۔آنکھوں دیکھا پھٹ پڑا کہ میں کانوں سنا۔آنکھوں دیکھا سو جانا کانوں سنا نہ مانا۔آنکھوں پر جگ ملنا۔آنکھوں دیکھتے یا آنکھوں دیکھے) مکھی نہیں نگلی جاتی۔آنکھوں دیکھیں گے۔آنکھوں سے آج دیکھا کانوں سے سنا تو کرتے تھے۔آنکھوں سے آنکھیں بندھنا۔آنکھوں سے بجالا۔آنکھوں سے بلائیں لینا۔

آنکھوں سے پاؤں۔ آنکھوں سے پھول اٹھانا۔ آنکھوں سے تلوے سہلانا۔ آنکھوں سے ٹکرٹکر دیکھنا۔ آنکھوں سے چنگاریاں اڑنا۔
آنکھوں سے دریا بہانا۔ آنکھوں سے دریا بہنا۔ آنکھوں سے دم نکلنا۔ آنکھوں سے دور ہے مگر دل سے نزدیک ہے۔ آنکھوں سے
دیکھا جو کبھی کانوں سے بھی نہ سنا تھا۔ آنکھوں سے دیکھا جو نہ دیکھا تھا۔ آنکھوں سے دیکھا، نہ کانوں سے سنا۔ آنکھوں سے زمانہ دیکھا
ہے۔ آنکھوں سے سوجھتا نہیں ہے۔ آنکھوں سے شرم لحاظ جاتا رہنا۔ آنکھوں سے شعلے نکلنا۔ آنکھوں سے سے عزیز رکھنا۔ آنکھوں
سے عزیز ہونا۔ آنکھوں سے غائب ہوجانا۔ آنکھوں سے غفلت کے پردے اٹھ جانا۔ آنکھوں سے غیرت بجھانا۔ آنکھوں سے قبول
ہے۔ آنکھوں سے قدم لگانا۔ آنکھوں سے کسی چیز کو لگانا۔ آنکھوں سے کوڑی نہیں دیکھی ہے۔ آنکھوں سے کوئی کام نہ کرنا۔ آنکھوں
سے گرا بہت برا ہوتا ہے۔ آنکھوں سے مجبور ہونا۔ آنکھوں سے معذور کرنا۔ آنکھوں سے ملنا۔ آنکھوں کا برسنا۔ آنکھوں کا بہنا۔
آنکھوں کا جھمکا۔ آنکھوں کا چلنا پھرنا۔ آنکھوں کا دریا بہانا۔ آنکھوں کا دیکھا جانے دیا بھلے مانس کا کہنا مان لیا۔ آنکھوں کا رونا۔
آنکھوں کا کسی کو ڈھونڈنا۔ آنکھوں کا لہو رونا۔ آنکھوں کا لہو ہو جانا۔ آنکھوں کا ناسور ہو جانا۔ آنکھوں کا نور اڑ جانا۔ آنکھوں کا نور
کھودینا۔ آنکھوکا یا آنکھوں سے تیل ڈھل جانا۔ آنکھوں کا انتظار رہنا۔ آنکھوں کے آگے سے الوپ یا تلپٹ ہو جانا۔ آنکھوں کے
اندھے۔ آنکھوں کے نام شیخ روشن۔ آنکھوں کے بھل چلنا۔ آنکھوں کی بینائی۔ آنکھوں کے پپوٹے۔ آنکھوں کی پتلیاں پتھرانا۔
آنکھوں کی پتلیاں پھر جانا۔ آنکھوں کے پردے۔ آنکھوں کی تری۔ آنکھوں کے تل۔ آنکھوں کے حلقے۔ آنکھوں کی دوا کرو۔
آنکھوں کے ڈھیلے۔ آنکھوں کی راہ یا راستے سے دل میں درآنا۔ آنکھوں کی راہ سے دم نکلنا۔ آنکھوں کی روشنی۔ آنکھوں کے سامنے
رکھنا۔ آنکھوں کے سامنے (یا آگے) سے چرانا۔ آنکھوں کے سامنے سے نہ ہٹنا۔ آنکھوں کے سامنے سے کوئی چیز آجانا۔ آنکھوں کے
سامنے یا آگے کی کوئی بات۔ آنکھوں کی سفیدی۔ آنکھوں کی سیاہی۔ آنکھوں کی سیاہی سفید ہونا۔ آنکھوں کی صفائی دیکھو۔ آنکھوں کی
فصدیں کھلواؤ یا فصدیں لُو۔ آنکھوں کی قسم۔ آنکھوں کے گڑھے۔ آنکھوں کے نیچے۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آجانا۔ آنکھوں کے
نیچے بجلی سی چمک جانا۔ آنکھوں کے نیچے پھرنا۔ آنکھوں میں اشارے ہونا۔ آنکھوں میں باتیں کرنا۔ آنکھوں میں بجلی کی سی چمک جانا۔
آنکھوں میں بچپن ہونا۔ آنکھوں میں بسنا۔ آنکھوں میں بہار پھولنا۔ آنکھوں میں پی جانا یا پئے جانا۔ آنکھوں میں ترمرے پھرنا۔
آنکھوں میں تصور بندھنا۔ آنکھوں میں میں تل بیٹھنا۔ آنکھوں میں میں تیل لگانا۔ آنکھوں میں ٹھنڈک پڑنا۔ آنکھوں میں جان اٹکنا۔
آنکھوں میں چکا چوندہ آنا یا چکا چوندہ ہونا۔ آنکھوں میں حقیر کر دینا۔ آنکھوں میں حقیر ہونا۔ آنکھوں میں خاک لگانا۔ آنکھوں میں خمار
ہونا۔ آنکھوں میں خواب آنا۔ آنکھوں میں خوار ہونا۔ آنکھوں میں خیال یا تصور پھرنا۔ آنکھوں میں دل لبھانا۔ آنکھوں میں دم اٹکنا۔
آنکھوں میں دم لانا۔ آنکھوں میں دَم ہونا۔ آنکھوں میں ذرا ڈر نہیں ہے۔ آنکھوں میں رات بسر لے جانا۔ آنکھوں میں رات جانا۔
آنکھوں میں رائی لون۔ آنکھوں میں روشنی آجانا۔ آنکھوں میں سحر کرنا۔ آنکھوں میں سرخی ہونا۔ آنکھوں میں سرمہ کھینچنا۔ آنکھوں میں
سرمہ (کاجل) لگانا۔ آنکھوں میں سرے (کاجل) کی تحریر کھینچنا۔ آنکھوں میں سفیدی چھانا۔ آنکھوں میں سم بندھنا۔ آنکھوں میں

شرم نہ ہوتو ڈھیلے اچھے۔آنکھوں میں غبار ہونا یا آ جانا۔آنکھوں میں کھائے جانا۔آنکھوں میں گڑھے پڑ جانا۔آنکھوں میں لون مرچ بھرنا یا آنکھوں میں مرچیں بھرنا۔آنکھوں میں مروت نہ ہونا۔آنکھوں میں نہ جچنا۔آنکھوں میں نیل کی سلائی بھرنا۔آنکھوں والے انکھیاں بڑی نعمت ہیں۔آنکھیں آسمان پر رہتی ہیں یا آسمان پر ہیں۔آنکھیں ادھرادھر ہیں۔آنکھیں اگلی پڑنا۔آنکھیں امنڈنا۔ آنکھیں اندر دھنس جانا۔آنکھیں اندھی ہونا۔آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔آنکھیں بند رہنا۔آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں۔آنکھیں بھبھوکا ہونا۔آنکھیں بے نور ہوجانا۔آنکھیں پانی ہوجانا۔آنکھیں پاؤں سے ملنا یا پاؤں پر ملنا۔آنکھیں پٹپٹانا۔آنکھیں پٹر پٹر مارنا۔ آنکھیں پسنا۔آنکھیں پھٹ گئی ہیں۔آنکھیں پھٹتی جاتی ہیں۔آنکھیں پھٹی ہوئی ہیں۔آنکھیں پھرا کے رہ جانا۔آنکھیں پھوٹ بہنا۔آنکھیں پھیر کے چلا دینا۔آنکھیں پھیرے تو تے کی سی باتیں کرلے مینا کی سی۔آنکھیں تلے اوپر ہوجانا۔آنکھیں تلی ہونا۔ آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔آنکھیں تھک جانا۔آنکھیں تیورا جانا۔آنکھیں ٹمٹمانا۔آنکھیں ٹھنڈی رہیں۔آنکھیں جھپکانا۔آنکھیں جھکی جھکی تھک جاتی ہیں (یا جھکی پڑتی ہیں)۔آنکھیں چارطرف چلی جاتی ہیں۔آنکھیں چارطرف رکھنا۔آنکھیں چارطرف رہنا۔آنکھیں جڑی ہوئی ہونا۔آنکھیں چلنا۔آنکھیں چمکانا۔آنکھیں چندھی ہونا۔آنکھیں چوندھیانا یا چندھیانا۔آنکھیں چھوٹی بڑی ہونا۔آنکھیں چیر چیر کر دیکھنا۔آنکھیں چیر کر نمک بھرنا۔آنکھیں خدا نے دیکھنے کو دی ہیں۔آنکھیں خون میں ڈوبنا۔آنکھیں در پر لگی رہنا یا لگی ہونا۔ آنکھیں دوچار کرنا۔آنکھیں دیکھتے جاتے ہیں۔آنکھیں دیکھتے رہنا۔آنکھیں دیکھی ہیں۔آنکھیں دیوار ہوجانا۔آنکھیں ڈھانپنا یا ڈھانکنا۔آنکھیں رگڑنا۔آنکھیں رورو کے سجانا۔آنکھیں رورو کے لال کرنا۔آنکھیں سر پر ہونا۔آنکھیں لینا۔آنکھیں فرش کرنا یا فرش راہ کرنا۔آنکھیں قدموں پر ملنا۔آنکھیں قدموں تلے بچھانا۔آنکھیں کور ہوجانا۔آنکھیں کھل جانا۔آنکھیں کھلی رہ گئی۔آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی۔آنکھیں کہیں ہیں دل کہیں ہے۔آنکھیں کیا پھوٹ گئی ہیں۔آنکھیں کیا چرنے گئی ہیں۔آنکھیں کیا منہ پر نہیں ہیں۔آنکھیں گرم کرنا۔آنکھیں گڑا کے دیکھا۔آنکھیں لگانا۔آنکھیں لگائے رہنا۔آنکھیں ملتے ہوئے اٹھنا۔آنکھیں نکال کر ڈرانا۔آنکھیں نکل آنا۔آنکھیں نکل پڑنا۔آنکھیں نکلی پڑنا۔آنکھیں نیچی کرلینا۔آنکھیں ہوئی چار دل میں آیا پیار۔آنکھیں ہوئیں اوٹ دل میں آئی کھوٹ۔

آواجائی لگا رکھی ہے۔آؤ بوا لڑیں لڑے ہماری بلا۔آؤ پڑوسن گھر کا بھی لے جاؤ۔آؤ پڑوسن لڑیں۔آؤ پیر گھر کا بھی لے جاؤ۔آؤ تو جاؤ کہاں۔آؤ جانے دو۔آؤ جاؤ۔آؤ جاؤ گھر تمھارا مانگے دشمن ہمارا۔آؤ دیکھا نہ تاؤ۔آؤ بہ آوارہ بنا دینا۔آوارہ رہنا۔آوارہ وطن۔ آواز اٹھنا۔آواز اکھڑنا۔آواز بدل جانا۔آواز بدلنا۔آواز بڑھانا۔آواز بڑھنا۔آواز بکایا گر یہ۔آواز بگڑ جانا۔آواز بلند کرنا۔ آواز بلند ہونا۔آواز بند کر دینا۔آواز پا۔آواز بتانا۔آواز پر آنا۔آواز پر کان دھرنا یا آنا۔آواز پر کان لگائے دینا یا لگائے ہونا۔آواز پر کان لگے رہنا یا لگے ہونا۔آواز پر گولی لگانا۔آواز پڑ جانا۔آواز پھولنا۔آواز پیدا ہونا۔آواز پتھرانا یا آواز تھرتھرانا۔آواز جانا۔آواز جرس۔آواز جکڑ جانا۔آواز خندہ۔آواز رک جانا۔آواز ڈوک میں آنا۔آواز سننا یا سنائی پڑنا۔آواز سے آواز ملنا۔آواز سے شگون لینا۔

آ واز صاف ہو جانا۔آ واز صور۔آ واز غیب۔آ واز غیب آ نا۔آ واز کا پاٹ۔آ واز کا پاٹ نہ ملنا۔آ واز کان پڑی سنائی نہ دینا۔آ واز کان میں آ نا۔آ واز کان میں لانا۔آ واز کان میں پہنچنا۔آ واز کانوں میں بھر گئی یا بھری ہے۔آ واز کھل جانا۔آ واز کی اٹھان۔آ واز کی چل پھر یا چلت پھرت۔آ واز کی گرج۔آ واز گوش آ شنا ہونا۔آ واز گونجنا۔آ واز ملانا۔آ واز ملنا۔آ واز منہ سے نہ نکلنا۔آ واز میں پتی لگ جانا۔ آ واز میں پیچ دینا۔آ واز میں پھریاں۔آ واز میں رعشہ ہونا۔آ واز میں کھٹکا ہونا۔آ واز میں کھندانے پڑنا۔آ واز میں لوچ ہونا۔آ واز میں نمک ہونا۔آ واز نہیں چلتی۔آ واز ہونا۔آ وازہ پہنچنا۔آ وازہ سننا۔آ ورد آ وردہ۔آ ورہ۔آ وہ اترنا۔آ وہ چڑہانا۔آ وے کھوگئی۔آ وے آ ویزاں آ ہ آ ہ رہنا۔ آ ہ آ ہ گرنا۔آ ہ اٹھنا۔آ ہ اللہ۔آ ہ جگر۔آ ہ روکنا۔آ ہ سر کرنا۔آ ہِ شب۔آ ہ صدا آ ہ۔آ ہ کرنا۔آ ہ نکالنا۔آ ہ نہ آ ئے۔آ ہِ نیم شب۔آ ہ و بکا۔آ ہ وفغاں۔آ ہ وفغاں کرنا۔آ ہٹ پانا۔آ ہٹ سننا۔آ ہر جاہر لگانا۔آ ہر جاہر لگنا۔آ ہن دل۔آ ہو چشم۔ آ ہو کا کاہلا ہونا۔آ ہوے حزم۔آ ہو لے فلک۔

آ یا بندہ آ ئی روزی گیا بندہ گئی روزی۔آ یا رمضان بھاگا شیطان۔آ یا کتا کھا گیا۔بیٹھی ڈھول بجا۔آ یتِ سجادہ۔آ یت نازل ہونا۔ آ یت وحدیث ہے۔آ یت وحدیث کی برابری۔آ یۂ رحمت۔آ ئندہ۔آ ئے آ م جائے لبیدا۔آ ئی بات کا روکنا ذہن کند کرتا ہے۔آ ئے بائے کھاٹ کے پائے۔آ ئی بلا ٹالنا۔ائی بلا سر سے ٹالنا۔آ ئے بیر بھاگی سیر۔آ ئی پر نہیں چوننے۔آ ئے پیر بھاگے بیر۔آ ئی تو زمانی نہیں تو خالی چار پائی۔آ ئے تو کیا آ ئے۔آ ئی تھی آ گ کو رہ گئی رات کو۔آ ئے تھے ہر بھجنے کو اور اوٹنے لگے کپاس۔آ ئی ٹل جانا اور آ ئی ہوئی ٹل جانا۔آ ئے کا آ یا۔آ ئے گا تو اپنے پاؤں سے جائے گا کسی کے پاؤں سے۔آ ئے گا کتنا تو پائے گا ٹکا۔آ ئے گئے کا سودا۔آ ئی گئی میرے ماتھے۔آ ئی گئی ہو گئی۔آ ئی موج فقیر کی دیا جھو پڑا اجلا۔آ ئے نہ آ ئے۔آ ئی نہ گئی،کون ناتے بہن۔آ ئی نہیں ٹلتی یا آ ئی ہوئی نہیں ٹلتی۔آ ئے ہوش حواس جانا۔آ ئے ہوش یا حواس کھونا۔آ ئی ہے جان کے ساتھ جائے گی جنازے کے ساتھ۔آ ئین جاری کرنا۔ آ ئین جاری ہونا۔آ ئین ہو جانا۔آ ئیں بائیں شائیں اڑانا۔آ ئیں بائیں شائیں۔بکنا یا کہنا۔آ ئی بی عاقلہ سب کاموں میں داخلہ۔ آ ئینہ الٹا دکھانا۔آ ئینہ اندھا ہو جانا۔آ ئینہ اندھے کو دکھانا۔آ ئینہ باطن۔آ ئینہ بنا دینا۔آ ئینے کو بیمار نہیں دکھاتے یا آ ئینہ بیمار کے آ گے نہیں لاتے۔آ ئینہ تمثال۔آ ئینہ جڑنا۔آ ئینہ حلب۔آ ئینہ خانہ۔آ ئینہ داری آ ئے۔آ ئینہ ڈبا لینا۔آ ئینہ سامنے رکھ کے طوطی پڑھانا۔آ ئینہ سامنے سے نہ ہٹنا۔آ ئینہ سکتے میں دکھانا۔آ ئینہ سیما۔آ ئینہ صفر میں دیکھنا۔آ ئینہ غدار۔آ ئینہ قد آ دم۔آ ئینہ کر دینا۔آ ئینہ گر۔آ ئینہ لگانا۔ آ ئینہ لگنا۔آ ئینہ ہر وقت سامنے رہنا۔آ ئینہ ہونا۔آ ئینے میں بال آ جانا یا پڑ جانا۔ آ ئینے میں چاند دکھانا۔آ ئینہ میں چاند دیکھنا۔

الف مقصورہ

ابابیلیا۔ابال اٹھنا۔اب تک ہو رہی ہے۔اب بتاؤ جاواب کہو۔اب بھی میرا مردہ تیرے زندے پر بھاری ہے۔ابتدا ابتدا میں۔ابتدا بگڑنا۔ابتدا پڑنا۔ابتدا کرنا۔ابتدائی۔ابتری پڑنا۔ابتری دینا۔ابتری ڈالنا۔اَبتُو۔ابتو ہوں میں اُونی اونی جب ہوں گی سب سے دونی۔اب تیئن۔اب جا کے۔ابجد کا قفل۔ابخرے نکلنا۔اَبدال۔اَبدُ الآ باد۔ابر آ نا۔ابرار۔ابرا منڈنا۔ابراہیم۔ابراہیم اَدہم۔ابر پھٹنا۔ابر پھیلنا۔ابر تر۔ابر باراں۔ابر بہار۔ابر بہمن۔ابر تصور۔ابر تنک۔ابر تیغ۔ابر چھٹنا۔ابر دریا بار۔ابر رحمت۔ابر سیر ظش۔ابر

سفید۔ابر سیاہ۔ابر قبلہ۔ابرک۔ابر کا برہنا۔ابر کا بھاگنا۔ابر کا ٹکڑا۔ابر کا جھومنا۔ابر کا رونا۔ابر کا گرجنا۔(ابر کوہسار+ابر کہسار+ابر کہساری)۔ابر گھیرنا۔ابرن۔اب رنگ لائی گلہری۔ابرو باد۔ابرو پر میل۔ابرو تاننا۔ابرو ملانا۔ابرو میں بل آنا۔ابرو میں بل پڑنا۔ابرو ہلانا۔ابرو ہلنا ابروے پیوستہ۔ابرہ چڑھانا۔ابری تلوار۔ابریشم۔اب ستوستی ہو کر بیٹھی لوٹ کھایا ستار۔اب سے آئے گھر سے آئے۔ اب سے دور۔اب کہاں جاتا ہے۔اب کیا ہوتا ہے۔اب کی بات جب کی بات جب کے ساتھ۔ابکے برس یا ابکے سال۔ابلا پری۔ ابلق ایام۔اَبلق چشم۔ابلہ فریب۔ابنائے جہاں۔اب نہ تب۔ابوریحان۔ابوزید۔ابوجہل۔ابوحنیفہ۔ابولہب۔اُبھی اُبھی سانسیں لینا۔(ابھی چھٹی کا دودھ نہیں سوکھا۔ابھی دودھ کے دانت نہیں ٹوٹے۔ابھی منہ دابیے تو چلو بھر چھٹی کا دودھ نکل پڑے۔ابھی منہ سے دودھ ٹپکتا ہے۔ابھی منہ سے دودھ کی بو آتی ہے۔ابھی منہ کی دال نہیں جھڑی۔ابھی ہونٹوں کا دودھ نہیں سوکھا۔ابھی دلی دور ہے)۔ ابھی سے۔ابھی کچا برتن ہے۔ابھی کچی لکڑی ہے۔ ابھی کچے گھڑلے پانی سے بھرنے ہیں۔ابھی کیا ہے۔ابی دبی کھیلنا ہے۔

اَپْرِنٹس۔اپریل فول۔(اُپلے پاتھنا+اپلے تھاپنا)۔اپنا اپنا۔اپنا اپنا جی اپنی اپنی طبیعت۔اپنا رستہ لینا۔اپنا اپنا کرنا اپنا اپنا بھرنا۔اپنا اپنا کمانا اپنا اپنا کھانا۔اپنا اپنا کُھولوا اپنا اپنا پیُو۔اپنا اپنا لہنا ہے۔اپنا اپنا نصیب۔اپنا اپنا ہے پرایا پرایا ہے۔اپنا بالا اور کا ڈھینگر۔اپنا بھی خدا ہے۔اپنا پرایا۔اپنا پرایا بہت آتا ہے۔اپنا پرایا کرنا۔اپنا پیٹ تو کتا بھی پالتا ہے۔اپنا تو تن پہلے ڈھانکو دوسرے کو ننگا پیچھے کہنا۔اپنا توشہ اپنا بھروسہ۔اپنا ٹھیک نہیں اور کا نیک نہیں۔اپنا ٹینٹ نہیں نہارتے اور کی پُھلّی دیکھتے ہیں۔اپنا اپنا جوہر دکھانا۔اپنا جوہر کرنا۔اپنا حساب کرلو۔اپنا رکھ پَرایا چکھ۔اپنا سا حال دوسرے کا بھی جانو۔اپنا سب کو جانتے ہیں۔اپنا سیتا کرنا۔اپنا سر پیٹو۔اپنا سر کھاو۔اپنا سمجھو۔اپنا سُوپ مجھے دے تو ہاتھوں بچھوڑ۔اپنا قُلَّہ شجرہ رکھ چھوڑیے یا اپنا قلہ شجرہ لیجیے۔اپنا کام۔اپنا کام آپ سے خوب ہوتا ہے۔اپنا کُتّا باندھو ہم بھیک سے باز آئے۔اپنا کر لینا۔اپنا کہا کرنا۔اپنا کھانا اپنا پہننا۔اپنا کیا آگے آیا۔اپنا گھر بھرنا۔اپنا گھر ہگ بھر پرایا گھر تھوک کا ڈر۔اپنا لال گنوا کے دَرْ دَرْ مانگیں بھیک۔اپنا لہو بہانا۔اپنا لینا کیا پرایا دینا کیا۔اپنا ماریگا تو پھر چھاؤں میں بٹھائے گا۔اپنا مال اپنی چھاتی تلے۔اپنا مَرن جگت کی ہنسی۔اپنا منہ بنواؤ۔اپنا منہ دیکھتا ہے۔اپنا منہ دیکھو۔اپنا مُنہ گڑھیّا میں دھو رکھو۔اپنا نام بدل ڈالیں۔اپنا نام نہ رکھیں۔اپنا وہی جو اپنے کام آئے۔اپنا ہاتھ اپنے سر پر۔اپنا ہی رونا رونا۔اپنا ہی مال جائے آپ ہی چور کہلائے۔اپنا ہی مطلب سوجھتا ہے۔اپنے آپ۔اپنی آگ میں آپ جلے جاتے ہیں۔اپنے آگے کسی کو نہیں گنتے۔اپنی اپنی بولی بولنا۔اپنی اپنی پسند ہے۔ اپنے اپنے حال میں مست ہیں۔اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ۔اپنی اپنی راہ پر ہیں۔اپنی اپنی سب بھگت لیتے ہیں۔اپنی اپنی سمجھ ہے۔ اپنی اپنی کہنا۔اپنی اپنی گانا۔اپنی اپنی گو اپنی اپنی منزل۔اپنے اپنے گھر سب بادشاہ ہیں۔اپنے اختیار میں نہونا۔اپنی اڑھائی اینٹ کی مسجد الگ بنانا۔اپنی اصل۔اپنے اللہ سے پائے۔اپنے اوپر لے لینا۔اپنی اور تیری جان ایک کروں گی۔اپنی ایسی تیسی میں جائے۔اپنی بات اپنے ہاتھ۔اپنی بات اپنے ہاتھ سے کھونا۔اپنی باری۔اپنی بانی نہ چھوڑنا۔اپنے بچھڑے کے دانت سبکو معلوم ہوتے ہیں۔اپنے بچے کو ایسا ماروں کہ پڑوسن کی چھاتی پھٹے۔اپنی بساط دیکھو اپنی بساط سے باہر کام کرو۔اپنی بلا اور کے سر۔اپنی بیتی۔اپنی پڑنا۔اپنے پوت کنوارے پھریں پڑوسن کے پھیرے۔اپنی پیٹھ نہیں دکھائی دیتی۔اپنی پیر پرائی باتیں۔اپنے پیر کو مان۔اپنی تو خبر لو۔اپنے تئیں۔اپنے

جامے سے باہر ہونا۔اپنی جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔اپنے جھونپڑے کی خبر مانگو۔اپنے حال سے نہ چُوکنا۔اپنے چلتے۔اپنی چلم بھرنے کو میرا جھونپڑا جلاتے ہو۔اپنی چھاتی کو دوں دلوانا۔اپنے حساب۔اپنے خدا کو مان۔اپنی خوشی۔اپنے دام کھوٹے پرکھنے والے کو کیا دُوس۔ اپنی دفعہ۔اپنے دل کے بادشاہ ہیں۔اپنے دل کے مختار ہیں۔اپنے دم سے اچھے ہیں۔اپنے دلُوں کو رونا۔(اپنے دہی کو کون کھٹا کہتا ہے+اپنے دہی کو کوئی کھٹا نہیں کہتا)۔اپنے ڈھب کا۔اپنی ذات سے اچھے ہیں۔اپنے رادھا کو یاد کرو۔اپنی راہ لگو۔اپنے زور میں آپ رہنا۔اپنے سایے سے وحشت ہونا۔اپنے سرآفت لینا۔اپنے سر بلا لینا۔اپنے سر پرآئی بلا لینا۔(اپنے سر لے لینا+اپنے سر اوڑھ لینا)۔اپنے سوئی بھی چبھونے دو دوسرے کے بھالے کو چو۔اپنے سے بچے تو اور کو دے۔اپنی سی بنائے جانا۔اپنی سی بہت کی۔ اپنی سی کرنا۔اپنی سی بنا لینا۔اپنی طرف خیال کرو۔اپنی طرف دیکھو۔اپنی طرف سے۔اپنی عقل اور پرانی دولت بڑی معلوم ہوتی ہے۔ اپنی عمر سے مرنا۔اپنی غرض کا آشنا ہونا۔اپنی غرض کو گدھے چراتے ہیں۔اپنی غرض کو لوگ گدھے کو باپ بنا لیتے ہیں۔اپنے فرض سے ادا ہونا۔اپنے قدے کی خیر منانا۔اپنی قدر آپ نہ جانی۔اپنی قسمت کا لے اُترنا۔اپنی قسمت کو رُونا۔اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔اپنے کام سے کام رکھو۔اپنی کرنی اپنی بھرنی۔اپنی کرنی یا اترنی۔اپنی کرنی پَر وان کیا ہندو کیا مسلمان۔اپنے کو۔اپنے کو گھالُم گھولا اور کی بار کو ٹالم ٹولا۔(اپنی کملی میں مست ہیں+اپنی کہنا اور کی نہ سننا۔اپنی کہو اور کی سنو اپنی کہی اور کی سنی۔اپنے کی بات جی میں کھٹکتی ہے۔اپنے کیے پر پچھتانا۔اپنے کیے کا علاج نہیں۔اپنے کیے کا مزہ چکھنا۔اپنے کیے کو رونا۔اپنے کیے کی سزا پانا۔اپنی گانٹھ ہو پیسا تو پرایا آسرا کیسا۔اپنی گرہ کا۔اپنی گرہ کا کیا جاتا ہے۔اپنی گڑیا سنوار دینا۔اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے۔اپنے گھر کی راہ لو۔اپنے گھر میں آتا کس کو برا لگتا ہے۔اپنے گنے تو پینٹھ میں اور کے لگے تو ھیٹ میں۔اپنی مراد کو پہنچ جانا۔اپنے مزے بن سرگ نہیں ملتا۔اپنے مزے کے آگے کچھ نہیں سوجھتا۔اپنی مصلحت ہر شخص خوب جانتا ہے۔اپنے مطلب کے ہیں۔اپنے من سے جانیے پرائے من کی بات۔اپنے منہ پر تمانچے مارنا۔اپنے منہ پر جاؤ۔ اپنے منہ سے دھنّا بائی۔اپنے منہ سے کہنا۔اپنے نزدیک اپنی نظر میں ہو۔اپنے سینا مجھے دے تو گھوم پھر کے دیکھ۔اپنی والی۔اپنے وقت کا حاتم ہے۔اپنے ہاتھ کے بلن بلن جایے جیسا من ہو تیسا کھایے۔اپنے ہاتھ میں ہے۔اپنی بائی اور گنوائی۔ اپنے ہی تن کا پھوڑا ستاتا ہے۔اپنے ہی گھر سے آگ لگی ہے۔اپھر جانا۔اپیل بحال ہونا۔اپیل ڈگری ہونا۔اپیل خارج ہونا۔اپیل ڈسمس ہونا۔اپیل منظور ہونا۔

اَتا پتا۔اتار ارکھنا۔اُتارَن۔اَتائی۔اتباع۔اتحاد بڑھانا۔اتحاد بڑھنا۔اُترا شحنہ مردل نام۔اَتر پڑنا۔اُتر تی برسات۔اُترتی ندی کنارے ڈھائے۔اُترَ نگ۔اُتر ہری۔اتری ہوش پاپوش۔اتری ہوی مہندی۔اتفاقاً۔اتفاقات۔اتقیا۔اتمام محبت۔اتم سے اتم ملے اور ملے نیچ سے نیچ۔پانی سے پانی ملے اور ملے کیچ سے کیچ۔اتم کھیتی مدھم بان نِکشٹ سیوا بھیک ندان۔اتنا بھرا کہ چھلک گیا۔اتنا پکا کہ باسی تھکا۔اتنا جھوٹ بولو جتنا آٹے میں لون۔اتنا سا۔اتنا سا فتنہ یا اتنی سی فتنی۔اتنا سا منہ نکل آیا۔اتنا کھائے جتنا آٹے میں نمک۔ اتنا کھالے جتنا بچے۔اتنوں میں۔اتنے سے اتنا ہونا۔اتنی سی جان گز بھر کی زبان۔اتنی صورت نظر نہ آئیگی۔اتنی عقل بھی اجیرن ہوتی ہے۔

اتنے کی بڑھیا نہیں جتنے کا لہنگا پھٹ گیا۔ اتنے لیے یا کتنے کے لیے۔ اتنے میں۔ اتنی ہی تھی۔ اتنی ہی لکھی تھی۔ اُتو۔ اتوار۔ اتو ساز۔ اُتو کرنا۔ اتو کش۔ اتہام۔ اتہام کرنا۔ اتہام لگانا۔ اتھاہ۔ اتھک۔ اُتھلا۔ اُتھل پتھل کرنا۔ اُتھل پتھل ہوتا۔ اَتیت۔ اٹاوے کے کاریگر۔ اٹرنی۔ اٹکا بنیا سودا کرلے۔ اٹکل ملنا۔ اٹکھیل۔ اٹکھیل پنا۔ اٹکھیل کھیلنا۔ اِٹلس۔ اٹنگن۔ اَٹّھا۔ اُٹھا بیٹھا نہیں جاتا۔ اٹھتا جوبن۔ اٹھتی پینٹھ۔ اٹھ کر پانی نہیں پیا جاتا۔ اُٹھلو۔ اُٹھملاری۔ اٹھی پینٹھ آٹھویں دن۔

اثر آنا۔ اثر پڑنا۔ اثر پذیر۔ اثر جگانا۔ اثر دار۔ اثر دکھانا۔ اثر ڈالنا۔ اثر رکھنا۔ اثر کھلنا۔ اثر نکلنا۔ اثمار۔ اثیم۔

اجارہ اجاڑا۔ اجارہ باندھنا۔ اجارہ کرنا۔ اجارہ کیا ہے؟ یا اجارہ کچھ ہے۔ اجارہ لکھنا۔ اجارہ نہیں ہے۔ اجارے دینا۔ اجارے لینا۔ اجاڑ کرنا۔ اجازت بھیجنا۔ اجازت چاہنا۔ اجازت دینا۔ اجازت طلب۔ اجازت لینا۔ اجالا۔ اجتماع۔ اجتماعِ ضدین۔ اجتناب رکھنا۔ اجتناب رہنا۔ اجتناب کرنا۔ اجداد۔ اجرا۔ اجر دینا۔ اجر ملنا۔ اُجڑا گھر بس گیا۔ اُجڑ گیا۔ اجڑے دن سے کیا ناتا۔ اجڑے گھر کا بلینڈا۔ اَجگر۔ اجگر کے داتا رام۔ اجل آنا۔ اجلاس کرنا۔ اجلاف۔ اُجل کارخانہ۔ اجلا کام۔ اجلال۔ اُجلا میلا۔ اُجل دامن گیر ہے۔ اجل سر پر سوار ہے۔ اجل سر پر کھڑی ہے۔ اجل سر پر کھیلتی ہے۔ اجل کا پیغام آنا۔ اجل کا تمانچا۔ اجل کا تھپڑا۔ اجل کا سامنا ہے۔ اجل کے منہ سے پھرنا۔ اجل کے منہ میں جانا۔ اجل گرفتہ۔ اُجلنا۔ اجماع۔ اجمال۔ اجمیر۔ اَجنّہ۔ اِجوکیشن۔ اِجوکیشنل۔ اجہل اجہنا۔ اُجیالا۔ اجیر۔

اُچاپت۔ اچاپت اٹھانا۔ اچاپت اٹھنا۔ اچاپتی۔ اچاٹ۔ اچاٹ دینا۔ اچاٹ کر دینا۔ اچاٹ ہونا۔ (اچار+اچار بنانا+اچار ڈالنا +اچار نکالنا فرہنگ میں الف ممدودہ سے ہیں جیسے آچار) اچار اٹھنا۔ اچار پڑنا۔ اچار کر دینا۔ اچار نکلنا۔ اچار ہو گئے۔ اچاری۔ اچپلا پن۔ اچپلی۔ اچپلائی۔ اچٹتا ہوا۔ اُچک۔ اچکا پن۔ اچکا ہوا۔ اچک پھاند۔ اَچکن۔ اچلا چال۔ اچمبھا کرنا۔ اچمبھے کی بات۔ اچمبھے میں رہنا۔ اچھا برا۔ اچھا بھلا۔ اچھا سلوک کیا۔ اچھا کرتے ہیں یا اچھا کیا۔ اچھا کہنا۔ اچھا کیا۔ اچھا کیا خدا نے برا کیا بندے نے۔ اچھال۔ اچھا لگنا۔ اچھالنا۔ اچھا ہی اچھا ہے۔ اچھت۔ اچھے کودے۔ اُچھوُ۔ اچھوتا بنڈا۔ اچھوتیاں۔ اچھو کے اچھے ہی ہوتے ہیں۔ اچھے اچھے۔ اچھے جی سے۔ اچھی دل لگی۔ اچھے دن۔ اچھے رہے۔ (اچھے سے اچھا پہننا+اچھے سے اچھا کھانا)۔ اچھے سے پالا پڑا۔ اچھی طرح۔ (اچھی کٹنا+اچھی گزرنا)۔ اچھے کو اچھا برے کو برا جاننا۔ اچھے کو اچھا برے کو برا نظر آتا ہے۔ اچھی کہی۔ اچھے گھر کی بنیاد۔ اچھے لوگ۔ اچھے وقت۔ اچھے ہیں پر خدا کام نہ ڈالے۔

احادیث۔ احاطہ کھینچنا۔ اَحِبّا۔ احباب۔ احتراز۔ احتراق۔ احترام۔ احترام کرنا۔ احتشام۔ احتقان۔ احتمال جانا۔ احتمال کرنا۔ احتیاج رکھنا۔ احتیاج لانا۔ احتیاط۔ احرام۔ احسان اتارنا۔ احسان اترنا۔ احسان سہنا۔ احسان کا عوض احسان ہے۔ احسان کھینچنا۔ احسان لیجیے جہاں کا نہ احسان لیجیے شاہجہاں کا۔ اَحْسَنْتْ کہنا۔ احمد۔ احمد کی پگڑی محمود کے سر۔ احمد کی ڈاڑھی بڑی یا محمود کی۔ احمد محمود۔ اِحمر۔ احمق الناس۔ احمق بنانا۔ احوال۔ احوال پرستی۔

اَخ ۔اَخَّاہ۔اخبار کا ہرکارہ۔اخبار کے پرچے۔اخبار کے فرشتے۔اخبار میں آنا۔اخبار نکالنا۔اخبار نکلنا۔اختتام۔اختتام پر پہنچنا یا آنا۔ اختراع کرنا۔اختراعی ۔اختر شناس۔اختصار۔اختصاص۔اختلاجِ قلب۔اختلاط بڑھانا۔اختلاط رکھنا۔اختلاط رہنا۔اختلاط زیادہ برآشنائی۔اختلاط کرنا۔اختلاط کی باتیں۔اختلاف پڑنا۔اختلاف ڈالنا۔اختلاف رائے ۔اختلافِ طبائع۔آ ختلالِ حوا۔اختونخو۔ اختہ بیگی۔اختہ خانہ۔اَخ تھو۔اخ تھو کرنا۔اخ تھو۔

ادا بندی۔ ادادکھانا۔ اُداسا کھینچنا۔ اُداس رکھنا۔ اداس رہنا۔ اداس کرنا۔ اُداسی پھیلنا۔ ادا نکالنا۔ ادب آداب۔ ادب آموز۔ ادب پکڑنا۔ ادب دینا۔ دینا۔ ادب سکھانا۔ ادب سیکھنا۔ ادب کرنا۔ ادڑا ۔ اَڈ رک ۔ اُومات۔ اُدماتا۔ اُدمات لگنا۔ اَڈ وائن۔ ادوائن کا توتا۔ادّھا۔اُدھار آنا۔ادھار بیوپار۔ادھار دیجئے دشمن کیجیے۔ادھار کھانا پھوس سے تاپنا برابر ہے۔ادھار کھائے ہوئے ہیں یا ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ادھار کی کیا ماں مری ہے۔ادھ بیچ۔ادھ پکا۔ادھ پکی۔ادھا جَل گگری چھلکت جائے۔ادھ جلی۔ادھر آیا یا ادھر گیا۔ادھراج۔ اِدھر اُدھر پھرنا۔ اِدھر اُدھر سے لینا۔ اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر۔ اِدھر کنواں اُدھر کھائی۔ اِدھر کی اُدھر کرنا۔ اِدھر کی اُدھر لگانا۔ اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جانا۔ اِدھر کیے نہ اُدھر کے۔ اِدھر کی نہ اُدھر کی یہ بلا کدھر کی۔ ادھر میں پڑے ہونا۔ ادھر میں لٹکنا۔ ادھر ہاتھ ملانا۔ اِدھر ہو یا اُدھر۔ اُدھر ہی اُدھر۔ ادھ سبزی۔ ادھ کھلا۔ اُدھم۔ (اُدھم اٹھانا+ اُدھم جوتنا+ اُدھم مچانا) ادھ موا۔ اُدھمی۔ اَدھنّا۔ (ادھن چڑہانا+ادھن رکھنا)۔ ادھن ہونا۔ ادھواڑ۔ اُدھوترا۔ اُدھورا۔ اَدھوڑی۔ اَدھوڑی اَشتبر۔ ادھوڑی تاننا۔ اَدّھی۔ ادھی ادھی پر جان دینا۔ ادھی ادھی کا حساب۔ اَدْھیانا۔ اُدھیڑنا بُننا۔ ادھی کی چُون چُون۔ ادھی کے واسطے پیسے کا تیل جلانا۔ ادھی کی ہانڈی بھی ٹھونک بجا کے لیتے ہیں۔ادھیلا نہ دے اَدِھیلی دے۔ادھیلجا۔

اَرّ۔ارّا۔ اِرایہ ۔ارادت رکھنا۔ارادسمند۔ارادہ باندھنا۔ارادہ بندھنا۔ارادہ رکھنا۔اَرذل ۔اَراضی ۔اَراکین۔اُڑسی ۔اربع عناصر۔ اربع مناسبہ۔ ارب کھرب۔ اِڑت۔ اِڑجَل ۔ اَڑجُمند۔ اِڑجن۔ اَڑجَنٹ۔ اُرَدَ۔ اِردادا۔ اِڑ دب۔ اردلی بازار۔ اردوے مُعلّی ۔ اِڑ ذل ۔ارزاں بعلّت گراں بحکمت۔اَرزق۔ارژنگ۔ارشاد سے باہر ہونا۔ اِرض وسما۔اَڑغوان۔ارکان ادا کرنا۔ اِڑل۔ اِرَم۔ ارمان پوا ہونا۔ارمان جاتا رہنا۔ارمان جی کے جی میں رہنا۔ارمان خاک میں ملنا۔ارمان کرنا۔ارنی۔ارنی کہنا۔ارواح لگی رہنا یا لگی ہونا۔ارواح نہ بھرنا۔اِڑوَلی۔اَرّوُن گھرّ وُن۔اَرّہ۔اَرّہ کشی۔ارے ترے کرتا۔ارتھ میٹک۔

اڑ۔اڑاڑا کے بیٹھنا۔اڑان۔اڑبڑ۔اڑبھنبھری ساون آیا۔اڑ جاے۔اڑسٹھ۔اڑ کر کہاں جاؤ گے۔اڑکے۔اڑکے لگنا۔اڑ کے منہ میں کھیل نہیں گئی۔اڑم۔اڑنا گنی۔اڑن جوگا۔ اڑنگ۔ اڑنگا لگنا۔۔اڑنگ بڑنگ بکنا۔اڑنگ بڑنگ ہانکنا۔اڑنگے پر چڑھا کر مارنا۔اڑھانا۔اڑھائی انچر۔اڑھائی چاول الگ گلانا۔اڑھائی دن سقے نے بھی بادشاہت کی ہے۔اڑھائی گھڑی کی موت آئے۔اڑھائی ہاتھ ککڑی کو ہاتھ کا بیج۔اڑھری۔اڑے اڑے پھرتے ہو۔اڑی اڑی طاق بیٹھی۔اڑی ڈری قاضی جی کے سر پڑی۔اڑیل مہاجن۔اڑ پنج رکھنا۔اڑے وقت گہنا۔

اساڑھ کے درزی۔اسامی۔اسانا۔اسباب۔اسپائی گلاس۔اسپر بھی۔اسپرنگ۔اسپرنگ کوچ۔اسپر نہ بھولو۔اسپر نہ جاؤ۔اسپیشل

ٹرین۔اسپند کرنا۔اِسْپِین۔اَسپینل۔استاد باپ کی جگہ ہوتا۔استاد بیٹھے پاس کام آئے۔استاد کرنا۔استانی۔استبرق۔است۔استخارہ آنا۔استخارہ کرنا۔استخارے کا مانع ہونا۔

استخارے کا واجب آنا۔استدلال۔استراحت۔اُسْترہ۔اُسترہ پھیرنا۔اُسْترہ لگانا۔استرہ لگنا۔اِستصواب۔استعجاب۔استعمالی چاول۔اَستغراق۔اِستغفار۔استغفار کرنا۔استفتا۔استقرا۔استقلال۔اَستمداد۔استمراری۔استمراج۔استبول۔استنجا گہرا ملنا۔اسٹیج۔اسٹیل پن۔اسٹیمر۔اسحاق۔اَسدْ۔اَسَدُ اللہ۔اسر افیل۔اسرائیل۔اُس سرے سے اس سرے تک۔اس سرے کا۔اس سوا۔اس سے۔اس سے اچھا تو خدا کا نام ہے۔اس سے تو نکٹے کی ناک بھی نہ کٹے۔اس سے کیا پورا پڑے گا۔اس سے ہاتھ دھوؤ۔اُسْطُر لاب۔اسطوخودوس۔اَسْفل۔اسفل السافلین۔اسفند یار۔اسقاط حمل ہونا۔اسکا بھی منہ جھلس۔اسکاٹ۔اسکاٹلینڈ۔اس کا منہ کالا۔اس کاندھے چڑھ اُس کاندھے اتر۔اِس کان سنا اُس کان اڑادینا۔اِسکُرو۔اسکندر۔اِسْکُرو۔اَسْکُوْایر۔اس کو تو پتھر مارے موت بھی نہیں۔اُسْلُوب۔اسلوب بندھنا۔اسم جلالی۔اسم جمالی۔(اس مرض کا تو تا کوئی اور پالتا ہوگا+اس مرض کا تو تا میں نہیں پالتا+اس میں کچھ فی ہے+اس میں کچھ نہ ہے)۔اسناد۔اسنے رکھا اسنے اٹھایا۔اَسْوار۔اسوقت تم کہاں ہو۔اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔اسہال۔اُسی۔اسی برتے پر۔اِسّی بھی موت نہیں۔اس کوٹھی کے دھان اس کوٹھی میں کرنا۔اسکو چیلون گو ڈوُن۔اسکو خدا پر چھوڑ دو۔اسکول فیلوُ۔اسکی جان پر صبر۔اسکے جگر کو دیکھو۔اسکی چھاتی سراہیے۔اسکے چھپر تو پھوس بھی نہیں۔اسکے دل گردے کو دیکھو۔اسکے راج میں گابھن گابھ ڈالتی ہے۔اسکی گردن وہاں ماریے جہاں پانی نہ ملے۔اسکے منہ کی۔اسکے نام کا کتا بھی نہیں پالتے۔اَسْکَنْڈ۔اس گھر کا باوا آدم برس کا ریزہ۔اسّی برس کا عمر، نام میاں معصوم۔اُسی پر خاک پڑتی ہے جو چاند پر خاک ڈالتا ہے۔اسے چھپاؤ اسے دکھاؤ۔اسی دن کو۔اسی دن کو پالا تھا یا اسیدن کو پال کراتنا بڑا کیا تھا۔اسیر کرنا۔اسی سے۔اسے کیا کہتے ہیں۔اُسی کی جُوتی اُسی کے سر۔اُسیلا۔اَسّی لسّی۔اسی میں خیر ہے یا اسی میں خیریت۔

اشارات۔اشارہ پانا۔اشارہ فہم۔اشارے بازی کرنا۔اشارے چلنا۔اشاعت اشتراک۔اشتعال طبع۔اشتعالک دینا۔اشتہار دینا۔اشتہار لگانا۔اشتجار۔اشخاص۔اشراف وہ ہے جس کے پاس اشرافی ہو۔اشراقین۔اَشْرالناس۔اشرفیاں لٹیں کولوں پر مہر۔اشرافی بوٹی۔اشرافی کا پھول۔اشعار۔اُشغلا۔اشغلا اٹھانا۔اشتقاق۔اشقر۔اشقیا۔اشک شادی۔اَشْب۔

اصحاب۔اصحاب فیل۔اصحاف کیف۔اصرار کرنا۔اُصْطُر لاب۔اصفہان۔اصلاح پر آنا۔اصلاح لینا۔اصل اصل ہے نقل نقل ہے۔اصل الاصوال۔اصل لسوس۔اصل بداز خطا خطا نہ کند۔اصل پر کھچ جانا۔اصل سے خطا نہیں کم اصل سے وفا نہیں۔اصنام۔اصول موضوعہ۔اصیل گھوڑے کو چابک کی حاجت نہیں۔اصلی مرغی ٹکے ٹکے۔

افاغنہ۔افتاد اٹھانا۔افتادگان خاک۔افتادگی۔افتاد ہونا۔افتاد خیز ابن افتتاح۔افترا باندھنا۔افترا بنانا۔افترا جوڑنا۔افترا گرنا۔اف تیرا کاٹا نہ جیے۔افراد۔افریقہ۔افسانہ چھیڑنا۔افسانہ چھیڑنا۔افسانہ خوان۔افسانہ گو۔افسانہ رہ جانا۔افسانہ سننا۔افسانہ کہنا۔افسوس رہ جانا۔افسوس کرنا۔افسوس کھانا۔افسوں پڑھنا۔افسوں چل جاتا۔افسوں ساز۔افسوں گر۔افسوں کرنا۔افشا۔افشاں۔افشاں اترنا۔افشاں اڑانا۔افشاں جمانا۔

افشاں چھڑانا۔افشاں چھڑکنا۔افشاں کا زرہ۔افشاں کرنا۔افشاں لگانا۔افشانی کاغذ۔افشائے راز کرنا۔افصح۔افضال۔افضلیت۔افطار کرنا۔افعی سیرت۔افغانستان۔افکار۔اُف کر دینا۔افگار۔افلاطون کے ناتی بنے پھرتے ہیں۔افلاک۔اُف نہ کرنا۔افواج۔افواہ۔افواہاً۔اُفوہ۔اُف ہوجانا۔افیم یا کھائے امیر یا کھائے فقیر۔افیمی تین منزل سے پہنچانا جاتا ہے۔افیون لینا۔افیون چڑھنا۔افیون دینا۔افیون کا چوگا۔افیون کا کھولا۔افیون کھانا۔افیونی جنونی۔

اقبال بلند ہونا۔اقبال چمکنا۔اقبال دعوے داخل کرنا۔اقتباس۔اقتضاد۔اقدام قتل۔اقدس۔اقرار کا سچا۔اقرار لینا۔اقرار مراد۔اقساط۔اقسام۔اقل۔

اکابر۔اکارت کرنا۔اکاس باندھیں پتال باندھیں گھر کی ٹٹی کھلی۔اکاسی۔اکانوے۔اکاون۔اکاوئینٹ جنرل۔اک بات کی بات۔اک بار یا ایک بار۔اکبارگی۔اکباری۔اکبر۔اکبر کے نورتن۔اکبر دروازہ۔۔اک تولنا۔اکتارا۔اکتالیس۔اکتائی کمھاری ناخن سے مٹی کھودیے۔اکتساب۔اکثر۔اکثر کرکے۔الجّا۔اک جہاں یا ایک جہان دیکھا ہے۔اک دل ہوتا۔اکدم (یا ایکدم) سے۔اکڈالا۔اک رجنی۔اِک رخی تصویر۔اکڑتنکڑ۔اکسپورٹ۔اک سرے سے۔اک سوانگ ہے۔اکسو ہونا۔اکسیر کی بوٹی۔اکسیر گر۔ایک قلم۔اک گونہ۔اک لخت۔اکل کھرا۔اکھل کھرا۔اکل کھرا جگ سے برا۔اکلو۔اکلیل الملک۔اکمل۔اک منزلا۔اکواہی۔اکولا۔اکوہر۔اکھاڑے کا جوان۔اکھاڑے میں آؤ۔اکھترا۔اکہری سواری۔اکھڑ۔اکھڑا اکھڑ کے اکھنڈر۔اکے دکے کی خبر منانے والی۔اکیس۔اکیلا پوت کمائی کرکے گھر کرے یا کچہری کرے اکیلا چنا پھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔اکیلا حسنو روے کہ قبر کھودے۔اکیلا سو باؤلا و کیلا سو سنگ تکیلا سو کھٹ۔چوپٹ چو کیلا سو جنگ۔اکیلا ہنستا بھلا نہ روتا۔اکیلنا۔اکیلے اکیلے۔اکیلی تو لکڑی بھی نہیں جلتی۔اکیلی جان۔اکیلے چلیے نہ باٹ جھاڑ بیٹھے کھان۔اکیلے دکیلے ۔اکیلے دکیلے کا اللہ بیلی۔

اگانا۔اگاہنا۔اگاہی۔اگد۔اگرسوز۔اگر ماند شے ماند شب دیگر نمے ماند۔(اگر۔مگر۔شاید)۔اگرم بگرم۔اگلا پچھلا۔اگلا زمانہ۔اگلا لیپا دے بہا اب کا لیپا آگے لا۔اگلتی تلوار بیسوا لگائی جسم کو مار کر کہتی ہے۔اگل نگل کے کھانا۔اگل اگل کے کھانا۔اگلے پانی۔پچھلے کیچ۔اگلے تو اندھا کھائے تو کوڑھی۔اگلے دفتر کھولنا۔اگلے کو گھاس نہ پچھلے کو پانی۔اگلے لوگ۔اگلے نے کیا پچھلے پر آئی۔اگلے ہوئے پچھلے ہوئے پردھان۔اگونی۔اگولا۔اگھن چولھے دبھن۔الابلا گردن مُلاؔ۔الاپ۔الاپنا۔الاچابیگ۔الار۔اِلارم کلاک۔الالون بلالون صحنک سر کالون۔الامان کہنا۔الانتظار اشد من الموت۔الاؤنس۔البتہ۔البم۔البیلا۔البیلی نے پکائی کھیر دودھ کی جگہ ڈالا نیر۔البیلی وضع۔التجا کرنا۔التجا لیجانا۔التزام۔التیام۔التیام پانا۔التیام دینا۔التیام کرنا۔الٹا پاسا پڑنا۔الٹا پھرنا۔الٹا تمانچا۔الٹا توا۔الٹا ٹانگنا یا الٹا لٹکانا۔الٹا دریا بہنا۔الٹا یا الٹے دم لگنا۔الٹا یا الٹے دم لینا۔الٹا دھڑا باندھنا۔(الٹا زمانہ آیا ہے+الٹا زمانہ لگا ہے+الٹا زمانہ ہے)۔الٹا سبق پڑھانا۔الٹا سیدھا جواب دینا۔الٹا لیا جائے نہ سیدھا۔الٹا مزاج۔الٹانا۔الٹ پڑنا۔الٹ پلٹ۔الٹ پلٹ دینا۔الٹ پلٹ کرنا۔الٹ پھیر۔الٹ پھیر میں آجانا۔الٹ پیچ۔الٹ جانا۔الٹ کے جواب دینا۔الٹ کے خبر نہ لینا۔الٹ کے کروٹ نہ لینا۔الٹنا۔الٹواسنی۔الٹواسی۔الٹے۔الٹی۔الٹے استھرے سے سر منڈوانا۔الٹی الٹی سانس بھرنا۔الٹے ہانس پہاڑ چڑھے۔الٹے بل کی

چوٹی۔الٹے پاؤں پھرنا۔الٹے پاؤں چلنا الٹی تقدیر۔الٹے چور کوتوال کو ڈانٹے۔الٹی چھری سے ہلال کرنا۔الٹی رسم۔الٹی سانس چلنا۔ الٹی سمجھے نہ سیدھی۔الٹی سنو۔الٹی سوجھنا۔الٹے سیدھے۔الٹی سیدھی باتیں کرنا۔الٹی سیدھی پڑنا۔الٹے قدم یا الٹے گدھے پر چڑھانا۔ الٹی گنگا بہانا۔الٹی مانے نہ سیدھی۔الٹی ہوا چلی ہے۔الجبرا۔ال جاؤں بل جاؤں جلوے کے وقت ٹل جاؤ۔الجھا۔الجھا پڑنا۔ الجھا چھڑانا۔الجھا چھوٹنا۔الجھا ڈالنا۔الجھاؤ پڑنا۔الحاج۔الجذر۔الجذر مانگنا۔الحق۔الحمد۔الحمد للہ۔الخاموشی نیم رضا۔الزام آنا۔ الزام اٹھانا۔الزام پانا۔الزام دکھانا۔الزام رکھنا۔الزام کی بات۔الزام کی چیز۔الزام لینا۔الزام ملنا۔السلام علیکم۔السی۔السیٹ لگانا۔ الطاف۔الطاف نامہ۔العبد۔العطش۔العظمۃ اللہ۔الغرض۔الغیاث۔الفاظ۔الف اللہ۔الفت جتانا۔الفت کرنا۔الفراق۔الفربہ بدخواہ مخواہ مراد آدمی۔الف سے بے نہ سننا۔الف سے بے نہ کہنا۔الفقر فخری۔الف کھینچنا۔الف کے نام بے نہیں جانتے۔الذی نہ اللذی۔اللہ آمین سے پالنا۔اللہ آمین کرنا۔اللہ آمین کا بچہ۔ اللہ اٹھالے یا اللہ اٹھالینا۔اللہ اللہ بھائی اللہ اللہ میرا بیٹا سوئے اللہ اللہ۔ اللہ اللہ بھائی کے کان کاٹوں نائی کے،اللہ اللہ بھائی کے دیدے پھوٹیں نظر آئی کے۔اللہ اللہ کی برکت میرے میاں بیٹے کی عمر بڑی۔اللہ اللہ کرتی تھی، گھی کے پاپڑ تلتی تھی، پاپڑ تلتے ہوئے تمام، بیٹا کرے آرام۔اللہ اللہ نمبرا نے امان،تم جیو میری جان،وہ تمہارا نگہبان،اللہ اللہ خیر سلا۔اللہ اللہ رے۔اللہ اللہ کرے۔اللہ اللہ کی چیز ہے۔اللہ بخشے۔اللہ بس باقی ہوس۔اللہ بسم اللہ کرنا اللہ بھلا کرے۔اللہ پر نظر رکھو۔اللہ پر نگاہ رہنا۔اللہ پر منانا۔اللہ توکلی کارخانہ۔اللہ جانتا ہے۔اللہ دے اور بندہ لے۔اللہ رکھے تو کون چکھے۔اللہ تیرے دیدے اللہ سلامت رکھے۔اللہ سے ڈرو۔اللہ شاہد ہے۔اللہ غنی۔اللہ غنی تو کاہے کی کمی۔اللہ کا دیا سر پر۔اللہ کا دیا نور کبھی نہ ہووے دور۔اللہ کا کلام۔اللہ کا گھر بڑا ہے۔اللہ کا محبوب۔اللہ کا نام سچا ہے۔اللہ کا نام ہے۔اللہ کرے سو ہو فقیر کہے سو ہو۔اللہ کو پیارا ہوا۔اللہ کو سونپا۔اللہ کو مانو۔اللہ کو منہ دکھانا ہے۔اللہ کو یاد کرو۔اللہ کی امان۔اللہ کی لاٹھی بے آواز نہیں۔اللہ کی منت۔اللہ کی ہزار ہا باتیں۔اللہ کرے سو ہو فقیر کہے سو ہو۔اللہ کو پیارا ہوا۔اللہ کو سونپا۔اللہ کو مانو۔اللہ کو منہ دکھانا ہے۔اللہ کو یاد کرو۔اللہ بگٹی۔اللہ لوگ۔ اللہ مارا۔اللہ میاں کی گائے۔اللہ نہ دکھائے۔اللہ والے لوگ۔اللہ ہے۔اللہ ہی اللہ ہے۔اللہ یار ہے تو بیڑا پار ہے۔اللے تللے۔الم۔الم اٹھانا۔الماں خانی ۔الماغونچی۔المیا۔الم پہنچنا۔المختصر۔المدد۔المرطقیس علیٰ نفسہ۔المغنی فی بطن الشاعر۔المکتوب نصف الملاقات۔الم نشرح کرنا۔المنتہ اللہ ۔الو۔الوالعزم۔الوان۔الو بولتا ہے یا الو بول گیا۔الوپ ہو جانا۔الو پھنسنا۔الو کا پٹھا۔الو کا گوشت کھایا ہے۔الو کی خاصیت رکھنا۔الو کی دم فاختہ۔الو کی مادہ۔الو کے منہ نام پڑے۔الو ماخرا۔الو ماں کا خبطی بچہ۔الہ آباد۔الھڑ پن۔الھنا۔النہا دینا۔الھیا۔الیات۔ الٰہی توبہ۔الٰہی خیر کرنا۔الٰہی مرا بیا مرز و دیگران را تو رانی۔الول۔ الیمانی تلوار۔الینڈو۔

اَن۔انا الحق۔ان آنکھوں سے کیا کیا نہیں دیکھا۔انا دا والے۔انارا۔اناڑی پن۔اناڑی کا سونا بارہ باٹ۔اناسی۔انا کافی دینا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔انبہ۔ان بے چاروں نے ہینگ کہاں پائی۔ان پڑھ۔انتالیس۔انت برا سو برا،انت بھلا سو بھلا۔انت برے کا برا انت بھلے کا بھلا۔انتخاب کرنا۔انتر منتر۔انتڑی میں روپ اوٗجھی میں چھب۔انتظام رکھنا۔انتظار کھینچنا۔انتظاری۔انتظام بیٹھنا۔ انتظام دینا۔انتظام کرنا۔انتقال ذہنی۔ان تلوں میں تیل نہیں۔انتہا لینا۔انتی۔انتیں۔انتی سار ہو کر نکلے۔انٹا چت پڑے ہیں۔انٹا

عقیل ہو گئے۔ انٹرمیڈیٹ۔ انٹرویوس کرنا۔ انٹ کاسنٹ۔ انٹی چڑھانا۔ انٹی دینا۔ انجام بخیر ہونا۔ انجام پانا۔ انجام کا۔ انجر پنجر ڈھیلے کر دیے۔ انجل۔ انجلی نکالنا۔ انجن۔ انجن ڈرایور۔ انجینیر۔ انچاس انحطاط۔ ان داتا۔ اندازے سے باہر ہونا۔ انداز نکلنا۔ اندازہ پانا۔ اندازہ کرنا۔ اندرسا۔ اندر کی سانس اندر، باہر کی سانس باہر۔ اندروالی۔ اندرہی اندر۔ اندلس۔ اندمال۔ (اندنوں+اندوہگین۔ اندوہناک۔ اندھا۔ اندھا جلتا ہے۔ اندھا بادشاہ لنگڑا ڈیرہ۔ کاٹھ کا گھوڑا۔ زین اندھا گروہ بھر چیلا۔ مانگے ہڑسہیڑا۔ اندھا بانٹے ریوڑیاں ہر پھیر اپنوں ہی کو دے۔ اندھا نکلا۔ اندھا بٹے رسی اور پیچھے بچھڑا کھائے۔ اندھا تپ پیتا لے جب دو آنکھیں پائے۔ اندھا جانے آنکھوں کی لے۔ اندھا چوہا چھوچھے دبھان۔ اندھا دھند کہ منگل گائیاں۔ اندھا دھندھا۔ اندھا کرنا۔ اندھا کیا جانے لانے کی بہار۔ اندھا گائے بہرا بجائے۔ اندھا لکڑی ایک بار کھوتا ہے۔ اندھا ملا ٹوٹی مسجد۔ اندھا نیوتے، دو جتے آئیں۔ اندھا ہادی بہرا مرشد۔ اندھا ہو۔ اندھڑ۔ اندھلانا۔ اندھوں میں کانا راجا۔ اندھوں نے بازار لوٹا۔ اندھوں نے گاؤں مارا دور یو لے لنگڑو۔ اندھیارا۔ اندھیاری۔ اندھی پیسے کتا کھائے۔ اندھے حافظہ کانے راجا۔ اندھیرا جھک آنا۔ اندھیرا چھانا۔ اندھیرا کرنا۔ اندھیر مچانا۔ اندھیرے کے منہ۔ اندھے کو رات دن برابر ہے۔ اندھے کے آگے روئے اپنی بھی کھوئے۔ اندھے کی جورو کا اللہ بیلی۔ اندھے کی داد نہ فریاد۔ اندھا ماربیٹھے گا۔ اندھے کی لاٹھی۔ اندھے کے ہاتھ بٹیر لگا۔ اندھے گھوڑے پر سوار کر دے۔ اندھی نائن آئینے کی تلاش۔ اندھی نگری چوپٹ راج۔ ان دیکھا چور سا برابر۔ ان دیکھی۔ انڈا ایائل کرنا۔ انڈ لانا۔ انڈوا۔ انڈون پر ہے۔ انڈ پائی انڈ پاگئی ہے۔ انڈے ببول میں بچے کھجور میں۔

انڈے دینا۔ انڈے سینا۔ (انڈے سیوے کوئی بچے لیوے کوئی+انڈے سیوے فاختہ کوے میوے کھائیں) انڈے ہوں گے تو بچے بہت۔ اُنس۔ انسان بنانا۔ انسان بننا۔ انسان میں کچھ نہیں۔ انسان ہی تو ہیں۔ انسب۔ انسٹھ۔ انس رکھنا۔ انس رہنا۔ انس کرنا۔ ان سمجھے۔ انستی۔ انشا کرنا۔ انصاد۔ انصاف چکانا۔ انصاف سے دیکھنا۔ انصاف کرنا۔ انعام کرنا۔ انفاس۔ انفراغ۔ انفلوائنزا۔ انقلابِ زمانہ۔ انکھوا۔ ان کہی۔ انکھیارا۔ انکھیاں۔ ان کے پٹھوں میں گھسے ہیں۔ ان کے پیشاب سے چراغ جلتا ہے۔ ان کے چاٹے روکھ نہیں رہتے۔ ان کے دھن پر چور راجا۔ انگاروں پر لٹانا۔ انگارے۔ انگارے پھانکنا۔ انگیسن۔ انگڑ کھنگڑ۔ انگشن بنکشن۔ انگشتانہ۔ انگشت بلب ہونا۔ انگشتری۔ انگلستان۔ انگلیاں توڑنا۔ انگلیاں ٹوٹنا۔ انگلیاں چٹکنا۔ انگلی پکڑے پنجا پکڑا۔ انگلی رکھنا۔ انگلینڈ۔ انگلی نہ لگانا۔ انگلیوں پر نچانا۔ انگنا برس۔ انگنا مہیا۔ انگور پھوٹ بہنا۔ انگور کا گچھا۔ انگور کی ٹٹی۔ انگوری بیل۔ انگوری شراب۔ انگھڑت بات۔ انگیا کا کنٹھا۔ انگیا کے بازو۔ انگیا کے بند۔ انگیا کے پچھولے۔ انگیا کی لہر۔ انگیز کرنا۔ انلینڈ۔ انملا۔ انمل بے جوڑ۔ انملی۔ انملی کی گسل۔ انمول۔ ان مولوں کو مہنگا ہے۔ انند کے تار بجانا۔ ان تیئں کا یہی بیسگھ وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھا۔ انواسنا۔ انواسی۔ انواع انواع۔ انوٹ۔ انوٹھا۔ انوکھا۔ آہنہ یا اونہ۔ انتھر۔

انھوریاں۔ انھوں۔ ان ہونی۔ ان ہونی ہونی نہیں اور ہونی ہوون یار۔ ابھی بھی لکھو۔ انھی پاؤ۔ انی۔ انیاٹانک۔ انی دار جوتا۔ اسنیس۔

انی کی ٹلی ہزار برس۔ انیلا۔ اَہا۔ اَہَر ا۔ اَہر تہر۔ اہرن۔ اہلِ وطن۔ اہلِ دل۔ اہلِ سُنن۔ اہلِ تشیع۔ اہل دنیا۔ اہل سخن۔ اُہوں۔ اُہواُہو۔ اَہیرا۔ اہیر

دیکھ گڑ ریاما تا بھیڑی کھائیں سیار۔ اسیری۔

ایاز۔ ایاغ۔ ایام بیض۔ اے بادِ صبا انیہمہ آوردۂ تست۔ ایتر کے گھر تیتر۔ ایثار۔ ایجاد بندہ اگر چہ گندہ۔ ایچ پیچ۔ ایچ پیچ کی باتیں۔ ایڈرس دینا۔ ایڈیکانگ۔ ایذا اٹھانا۔ ایذا پہنچانا۔ ایذا پہنچنا۔ ایذا جھیلنا۔ ایذا دہندہ۔ ایذا دینا۔ ایذا سہنا۔ ایذا کھینچنا۔ ایذا رگڑنا۔ ایرا پھیری یا اہرا پھیری۔ ایراد۔ ایران۔ ایران توران ایک کرنا۔ ایران چوری نہ پیران۔ دغا بازی۔ ایر پھیر یا ہیر پھیر۔ ایر پھیر کے تولنا۔ اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی۔ ایڑ کرنا۔ ایڑیاں رگڑ کر مر جانا۔ ایڑیاں رگڑنا۔ ایڑیاں گھس گئیں۔ ایزد۔ اے زر تو خدا نہ ولیکن بخدا۔ ستار عیوب و قاضی الحاجاتی۔ ایسا۔ ایسا کیا شہر شملہ ہے۔ ایسا کیا گیا گزرا ہے۔ ایسا نہ ہو۔ ایسا ویسا بھا تا نہیں خوان ملو کا آتا نہیں۔ اسیر آئین دَلدَ رجائیں۔ اسیر سے بھینٹ نہیں دَلدّ ر سے بگاڑ۔ ایسر گئے دَلدّ ر آئے۔ ایسے آدمی کے دیدے میں پیچ پسا دیجیے۔ ایسے پر تو ایسی کاجل دیے پر کیسی۔ ایسے پر تین حرف۔ ایسے تو میری جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ ایسے جی۔ ایسی کہی کہ چھا گئی۔ ایسی لگی کہ دھوئے نہ چھوٹے۔ ایسی کیا تیرے ہی تلے گنگا بہی ہے۔ ایسی کیا قاضی کی گدھی چرائی ہے۔ ایسے گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ایسے لڑکے بہت کھلائے ہیں۔ ایسے میں۔ ایسے ہوتے تو عید بقر عید کے کام آتے۔ ایسے ہی بھولے نہیں۔ ایفا۔ ایکا۔ ایک آم کی پھانکیں ہیں۔ ایک انچ کی کسر رہ گئی۔ ایک آنچ کی کسر ہے۔ ایک آنکھ۔ ایک آنکھ پھوٹتی ہے تو دوسری پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ ایک آنکھ میں لہر ایک آنکھ میں خدا کا قہر۔ ایک آنکھ یہ ایک آنکھ وہ۔ ایک آوے کے برتن ہیں۔ ایکا کرنا۔ ایک انار سو بیمار۔ ایک انڈہ وہ بھی گندا۔ ایک انگور کسور ینور۔ ایک اور ایک گیارہ۔ ایک اور سو کا فرق۔ ایک ایک دم میں سو رنگ بدلتا ہے۔ ایک ایک کا دامن پکڑ کے رونا۔ ایک ایک کا منہ دیکھنا یا تکنا۔ ایک ایک کی چار چار لگانا۔ ایک اینٹ کے لیے مسجد ڈھانا۔ ایک بات بھی منہ سے نکل گئی۔

۲۔ ذیل میں فرہنگِ آصفیہ اور امیر اللغات کے حوالے سے ایسے الفاظ و محاورات کی نشان دہی کی گئی ہے جو فرہنگِ آصفیہ میں شامل ہیں لیکن امیر مینائی نے انھیں ترک کیا ہے مثلاً:

الف ممدودہ

آب تاب۔ آب جوش۔ آب خصر۔ آب خیز۔ آب دوز یا آب دوز کشتی۔ آب زلال۔ آب شور۔ آب نقرہ۔ آب و ہوا دیکھنا۔ آبادبیشی۔ آباد رہو۔ آباد رہے۔ آبادگار۔ آبرو بر باد دینا یا کرنا۔ آبرو ریز۔ آبرو کالا گو ہونا۔ ابرو۔ آبرو کے در پہ ہونا۔ آب کاری۔ آب کاری کا داروغہ۔ آبلۂ دل۔ آبنائے۔ آبنوسی۔ آبی برج۔ آبی حرف۔ آبیانہ۔

آپ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں۔ آپ دھاپ۔ آپ روپی مایا۔ آپ سے آنا۔ آپ کا۔ آپ کاج۔ آپ کی آپ کے۔ آپ کے بجھا ڈنڈ کہے دیتے ہیں۔ آپا سرانا۔ آپا تجنا۔ آپا اماں۔ آپا جان یا جانی۔ آپس میں گرہ پڑنا۔

آتش دان۔ آتش رشک میں جلنا۔ آتش مزاجی۔ آتشی بُرج۔ آتشی حرف۔

اٹھارہ۔آٹھ پہری۔آٹھیں۔

آثارِقدیمہ۔

آج کل بتانا۔

آچار۔آچار بنانا۔آچار ڈالنا۔آچار کرنا یا نکالنا۔آچاری۔آچمن

آداب سکھاتا۔آدر۔آدر سے بٹھانا یا لیجانا۔آدر کرنا یا آدر دینا۔آدمی نیچے۔آدمی زاد، آدمیت سکھانا یا سکھلانا۔آدمیت سیکھنا۔

آدمیت میں لانا۔آدھ یا ادھ۔آدھموا۔آدھا ہونا۔آدھار۔آدھار ہونا۔آدھاری۔ادھین یا آدھین۔آدھینی یا آدھینا۔

آرکرنا یا آرلگانا یا مارنا۔آرادھن یا آرادھنا۔آراستگی۔آراضی۔آراضیٔ افتادہ۔آرام تکیہ۔آرام چاہنا۔آرام سے۔آرم سے پاؤں پھیلانا۔آرام میں ہیں۔آرام والی۔آرایشی۔آربل۔آرتا۔آرتی۔آرتی لینا۔آرٹ۔آرجار۔آرجان۔آردآرزو کرانا۔آرزو کروانا۔آروزمند ہونا۔آرہ آرہ کش۔آرہ کشی۔آرے بلے کرنا۔آریواں۔آرے چلنا۔آرے سے چیرنا۔آریہ وَرْت۔

آڑا ترچھا۔آڑت پکڑنا یا لینا۔آڑگڑا۔آڑی گوڑیا آڑا گوڑا۔آڑگوڑ۔آڑی کرنا۔

آزادرو یا آزادہ رو۔آزُادہونا۔آزاد پیدا ہونا۔آزادہی۔آزُردَگی۔آزمالینا۔آزمودہ۔آزمودہ لینا۔

آس اولاد۔آس اولاد والی۔آس پجنا یا پوری۔آس تجنا۔آس تکنا۔آس چھوٹنا۔آس مراد۔آسامی۔آسامی باز۔آسامی بنانا۔

آسامی پاہی یا چاہی کاشت۔آسان کردینا۔آسیرباد۔آتشکتانا۔آسمان پراڑنا۔آسمان پرتھوکنا۔آسمان پردماغ کھینچنا۔آسمان پرقدم رکھنا۔آسمان پرکھینچنا۔ آسمان دیکھنا۔آسمان قدر۔آسمانی پلانا۔آسمانی مار۔آسَن۔آسن باندھنا۔آسن پائی۔آسن پائی لے کر پڑنا۔

آسن تیاگنا۔آسن ڈگانا۔آسن لینا۔آسودگی۔آسودیٔ عمامۂ خلایق، آسودہ۔آسودہ ہوجانا۔

آشِرباد۔آشُفتگی۔آشفتہ دلی۔آشفتہ سَری۔آشمال۔آشنا ہوجانا یا ہونا۔آشنائی۔آشنائی ہونا۔

آغاز ہونا۔آغوش کھول کرلینا۔آغوش لینا۔

آفاتِ آسمانی۔آفاتِ موسمی۔آفاق۔آفت۔آفت اٹھانا۔آفت آنا۔آفت برپا کرنا۔آفت پڑنا۔آفت ٹوٹ نا۔آفت ہے۔آفتابہ لے کر کھڑے ہونا۔آفتاب گلقند۔آفِرینش۔آفندی۔

آک۔آس کی بڑھیا یا بڑیا۔آکا بھائی۔آکار۔آکاس۔آکاس اگن گولا۔آکاس بانی یا آکاس والی۔آکاس برت یا اجگر برت۔

آکاس برتی۔آکاس پھل۔آکاس چوٹی۔آکاس دُھری۔آکاسدھری کے سرے۔آکاس دیا۔آکاس کنگا۔آکاسی چیز آکسیجن۔

آگ پر مُوتو یا مسلمان ہو۔آگ تلوؤں سے لگنا۔آگ جوڑنا۔آگ چھونا۔آگ ڈالنا۔آگ لگتی جھونپڑی جو نکلے سولابھ۔آگ لگو یا لگے۔آگ لگے پر بلی کا موت ڈھونڈنا۔آگ لہکنا۔آگ میں کسی کی پڑنا۔آگ میں کسی کی جلنا۔آگ ہونا۔آگا بھاری ہونا۔آگا سنبھالنا۔آگا لینا۔آگا ہونا۔آگر دآگے آگے رنگ لانا۔آگے دیکھنا۔آگے دیکھیے۔آگے ڈوبنا۔آگے رنگ لانا۔آگے سے ٹھانا۔

آگے سے ٹھہرانا۔آگے سے روکنا۔آگے سے سوچنا۔آگے سے گانٹھنا۔آگے سے نکلنا یا نکل جانا۔آگے سے ہٹانا۔آگے سے ہٹنا۔

آ گے کو کان ہوئے۔ آ گیا یا آ گیا۔ آ گیا یا کنا۔ آ گیا پتر۔ آ گیا دینا یا اگیا کرنا۔ آ گیا کاری۔ آ گیا میں رکھنا۔ آ گیا میں رہنا۔ آ گیا میں لانا۔

آل واطفال۔ آلا ہونا۔ آلا گانا۔ آلا بالا۔ آلا بالا بتا دینا۔ آلاپ۔ آلا پنا۔ آلاتِ ضرب۔ آلاتِ کشاورزی۔ آلا ریسی۔ آل جنجال آلس۔ آلکس۔ آلکس آنا۔ آلکسی۔ آلکیا۔ آلن۔ آلنا۔ آلنگ پر آنا یا ہونا۔ آلودہ ہونا۔ آلہی۔ الٰہی خرچ۔ آلئی۔

آن دادا۔ آنن تان والی۔ آن توڑنا۔ آن رکھنا۔ آنا بننا۔ آن پڑنا۔ آن بھرنا۔ آن پہنچنا۔ آن پھنسنا۔ آن جھانکنا۔ آن رہنا۔ آن کے یا آکے۔ ان لگنا۔ آن لینا۔ آن ملنا یا آملنا۔ آن مول۔ آنتنی سار، آنتیں، آنتیں سمیٹنا یا مونسنا۔ آنتیں گلے میں آنا یا پڑنا۔ آنتیں منہ کو آنا۔ آنٹ نکلنا۔ آنٹی دینا یا مارنا۔ آنپٹی لگانا۔ آنٹھی یا اٹھی۔ آنچ نہ آنا۔ آنچ نہ آنے دینا۔ آنچل پڑنا۔ آنچل پلو۔ آنچل دبانا۔ آنچل دینا۔ آنچل سنبھالنا۔ آنچل میں باندھنا۔ آنچل میں سات باتیں باندھنا۔ آندھی ہونا۔ آنڈو۔ آنڈو بیل۔ آنسو آنا۔ آنسو بہانا۔ آنسو بھر آنا۔ آنسو بہنا۔ آنسو ٹپکانا۔ آنسو خشک ہونا۔ آنسو ڈھال۔ آنسوئی دھار۔ آنسو کی لڑی۔ آنسو گرانا۔ آنسو گرنا۔ آنسو نکل آنا۔ آنسو نکل پڑنا۔ آنسو نکلنا۔ آنسوؤں۔ آنسوؤں سے منہ دھونا یا آنسوؤں منہ دھونا۔ آنسوؤں کا تار چلنا۔ آنکھ بچا کے آنا۔ آنکھ بچے کا چاٹنا۔ آنکھ برابر کرنا۔ آنکھ برابر نہ کرسکنا۔ آنکھ بگڑنا۔ آنکھ بھرلانا۔ آنکھ پتھرانا۔ آنکھ پر پردہ پڑنا۔ آنکھ پسیجنا۔ آنکھ پھاڑ پھاڑ کے دیکھنا۔ آنکھ پھوڑ لینا۔ آنکھ پھیر دینا۔ آنکھ پھیلانا۔ آنکھ ٹوٹ آنا۔ آنکھ ٹھنڈی کرنا۔ آنکھ ٹیڑھی ہونا۔ آنکھ جمنا۔ آنکھ چرا کر کچھ کرنا۔ آنکھ چرانا۔ آنکھ چمکانا۔ آنکھ چیر چیر کر دیکھنا۔ آنکھ دُکھا۔ آنکھ دیکھ کر کچھ کرنا۔ آنکھ ڈبڈبانا۔ آنکھ ڈھکنا۔ آنکھ روشن کرنا۔ آنکھ سامنے نہ کرنا۔ آنکھ سرخ ہونا۔ آنکھ سیدھی رکھنا۔ آنکھ سے گرنا۔ آنکھ سے لہو ٹپکنا۔ آنکھ سینکنا یا سیکنا۔ آنکھ کا ڈھیلا۔ آنکھ کے آگے۔ آنکھ کی تپلی پھرنا یا پھر جانا۔ آنکھ کے سامنے۔ آنکھ گرم کرنا۔ آنکھ گڑ جانا۔ آنکھ لال کرنا یا لال پیلی کرنا۔ آنکھ لڑ جانا۔ آنکھ لڑنا۔ آنکھ لگایا یا آنکھ لگا مرادو۔ آنکھ للچانا۔ آنکھ مچ جانا۔ آنکھ مچلکنا۔ آنکھ میں آنکھ ملانا۔ آنکھ میں بسنا۔ آنکھ میں چبنا۔ آنکھ میں خار ہونا۔ آنکھ میں خاک ڈالنا۔ آنکھ میں ذرا آنسو نہیں۔ آنکھ میں ذرا پانی نہیں۔ آنکھ میں سمانا۔ آنکھ میں کھبنا۔ آنکھ میں مروت نہ ہونا۔ آنکھ نکالنا۔ آنکھ نہ ٹھیرنا۔ آنکھ نہ جمنا۔ آنکھ نہ ڈالنا۔ آنکھ نہ رکھنا یا نہیں رکھنا۔ آنکھ نہ لگنے دینا۔ آنکھ نہ ملا سکنا۔ آنکھ نہ میلی کرنا۔ آنکھ نہ ہونا۔ آنکھ نہیں اٹھانا یا نہ اٹھنا۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لینا۔ آنکھوں میں یا آنکھوں پر چربی چھانا۔ آنکھوں تلے پھرنا۔ آنکھوں تل لہو اترنا۔ آنکھوں دیکھا یا آنکھوں دیکھی۔ آنکھوں سے اترنا۔ آنکھوں سے آنکھیں ملانا۔ آنکھوں سے پاؤں لگانا۔ آنکھوں سے پٹی باندھنا۔ آنکھوں سے خون آنا۔ چاندنا۔ آنکھوں کے آگے رکھنا یا سامنے رکھنا۔ آنکھوں کے آگے سے سرکنا۔ آنکھوں کے بل چلنا۔ رآنکھوں کے تارے۔ آنکھوں کے تارے چھٹنا۔ آنکھوں کے تلے تارے چھٹنا یا چھوٹنا۔ آنکھوں کی ٹھنڈک۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا۔ آنکھوں میں بھنگ گھٹنا۔ آنکھوں میں بیٹھنا۔ آنکھوں میں پٹی باندھنا۔ آنکھوں میں پھر جانا۔ آنکھوں میں تھی شرم دل کے تھے نرم۔ آنکھوں میں ٹھیرنا۔ آنکھوں میں چچنا۔ آنکھوں میں خمتے پڑتا۔ آنکھوں میں جہاں سیاہ ہونا۔ آنکھوں میں جی آنا۔ آنکھوں میں چڑھنا۔ آنکھوں میں خاک یا دُھول ڈالنا۔ آنکھوں سے خون برسنا۔ آنکھوں میں کاجل گھلنا۔ آنکھوں میں کھٹکنا۔ آنکھوں میں کہنا۔ آنکھوں میں موتی کوٹ

کوٹ کر بھر دیتے ہیں۔(آنکھوں میں نمک ڈالنا/نون دینا/نون رائی)۔آنکھوں ہی آنکھوں میں۔آنکھوں ہی آنکھوں میں چرا لینا۔ آنکھیں۔آنکھیں بند کر کے کوئی کام کرنا۔آنکھیں بنوانا۔آنکھیں بنواؤ۔آنکھیں بیٹھنا۔آنکھیں پڑنا۔آنکھیں پونچھ ڈالنا۔آنکھیں پھرانا۔آنکھیں پھوٹنا۔آنکھیں پھیر لینا۔آنکھیں چڑھنا۔آنکھیں چومنا۔آنکھیں دکھانا یا دکھلانا۔آنکھیں ڈھونڈتی ہیں۔آنکھیں سامنے کرنا۔آنکھیں سامنے نہ کرنا۔آنکھیں سجا لینا یا سجانا۔آنکھیں سرخ کرنا۔آنکھیں کھٹکنا۔آنکھیں کُھل جانا۔آنکھیں گدی میں ہونا۔آنکھیں لال ہوآنا۔آنکھیں لڑانا۔آنکھیں لگ جانا۔آنکھیں ملا کر دیکھنا یا ملا کے دیکھنا۔آنکھیں ملانا۔آنکھیں منتظر ہیں۔ آنکھیں مندنا۔آنکھیں موند لینا یا موندنا۔آنکھیں نہ اٹھانا۔آنکھیں نہ کھولنا۔آنکھیں نہ ملانا۔آنکھیں نہ ملنا۔

آؤ جانیدد۔آوا۔آوااترنا۔آواچڑھنا۔آواجائی۔آوادائی،آواآدر۔آوارجہ۔آوراگی۔آورہ گرد۔آوارہ گردی۔آوارہ ہونا۔آواز بھاری ہونا یا بھاری پڑنا۔آواز بھرانا۔آواز بیٹھنا۔آواز پھٹکنا۔آواز دہندہ۔آواز کسنا۔آواز گرنا۔آواز میں آواز ملانا۔آوازہ توازہ۔ آوازہ توازہ پھیکنا۔آوازہ مارنا یا بھگ آؤن۔آویزاں کرنا،آولے کی طرح بیٹھ جانا یا بیٹھنا۔اولے یاری۔

آہِ سرد۔آہِ سوزاں۔آہ مارنا۔آہار کرنا یا آۃ ارنا۔آہٹ ہونا۔آہرن۔آہستہ آہستہ۔آہن پوش یا زرہ پوش جہاز۔آہوتی یا آہبت۔آہے۔آہے پر جگہ نہ ہونا۔

آیات۔آیاتِ محکمات۔آیتوں۔آیتیں۔آئین دیوانی۔آئین فوجداری۔آئین مال۔آئیں بائیں۔آئیں تو جائیں کہاں۔ائنتی پانتی۔آئندہ۔آئینہ بندی۔آئینہ بندی کرنا۔آئینہ سازی۔آئینہ میں یا اٹھا کے اپنا منھ دیکھو۔آئینہ محل۔آئینہ ہونا۔

فصل الف مقصورہ

اب تک ہونا۔اب تو پتھر تلے ہاتھ دب گیا۔اب سے دور۔اب کے۔اباحت۔ابتدائی رُسُوم۔ابتر ہونا۔اَبدھوت۔ابر کرم۔ابرائی ذمہ۔ابرائی نامہ۔ابری۔ابطال۔ابعاوتلاثہ۔ابکائی لگنا۔ابلا۔ابلیسِ آدم۔ابلیس کا پیشاب۔ابن الوقت۔ابنِ رشید۔اُبنّا۔ ابوالحسن۔ابوالنصر فارابی۔ابوظفر۔ابوعلی سینا۔ابوابِ بیجا۔ابھارلانا۔ابھار لینا۔

اپاڑ۔پاڑ کرنا اپاسک۔اپت۔اپچاؤ۔اُپڑنا۔اپنا اُلوّ سیدھا کرنا۔اپنا بیگانہ۔اپنا پُوت۔پرایا۔ڈھینگڑا۔اپنا پیسہ کھوٹا۔پَرکھنے والے کا کیا دوش۔اپنا ٹینٹ تو دیکھو پیچھے ہی دوسری کی پھلی نہارنا۔اپنا دے بڑائی مول لے۔اپنا سوجتا کرنا۔اپنا گھٹنا کھول لئے اور آپ ہی لاجوب مرہے۔اپنی چاچھ کو کوئی کھٹا نہیں کہتا۔اپنی گوں کا۔اپنی نیند سونا اپنی نیند اٹھنا۔اپنے آپے میں رہنا۔اپنے بھاویں۔اپنے جامے سے باہر ہونا۔اپنے حق میں کانٹے بونا یا زہر کرنا۔اپنے دنوں کو پورا کرنا۔اپنے گئے کے پاس بیٹھنا۔اپنے گریبان میں منہ ڈالنا۔اپنے نین گنوائے کے دَر در مانگے بھیک اپیل سرسری۔اپیل خاص۔اپیل متخالف۔

اَٹ۔اتار چڑھاؤ بتانا۔اتارا۔اتارنا۔اتار چڑھاؤ بتانا۔اترن پُترن۔اُتروانا۔اَتصالِ حقیقی۔اتفاق بڑھنا۔اتفاقِ حُسنہ۔اتفاق رائے۔اُتل۔اُتم۔اتنے میں۔اُلواَتو کرنا۔اتو کرتے ہوئے چلنا۔اُتو کرنا۔اُتو ہونا۔اتوار،اتھل پتھل ہونا۔

اٹاچی۔اٹ سٹ کرنا۔اٹ سٹ لڑانا۔(اٹ سٹ لڑنا+اٹ سٹ ہونا۔اٹک اٹک کر۔اٹکھیلیاں یا اٹھلھیلیاں۔اٹل ہونا۔اٹوائی

کھٹوائی۔اٹھادینا۔اٹھارکھنا۔اٹھارہ کنکرہ۔اٹھالے جانا۔
اٹھالینا۔اٹھاؤ۔اٹھ بیٹھ۔اٹھ جانا۔اٹھ ماشی۔اٹھوانا۔اٹیرن پھیرنا۔اٹیرن کردینا۔اٹیرنا۔
اثر ہونا۔
اجابت ہونا۔اجارہ۔اجارہ دار۔اجارہ نامہ۔اجاڑو۔اجالا ہونا۔اجتہاد کرنا۔اجر جائیز۔اجڑوانا۔اجسام۔اُجَّلن۔اُجْلا۔اجلا منہ کرنا۔
اجلا منہ ہونا۔اجلاس کامل۔اجلی سمجھ۔اجلی گزرن۔اُجھَّڑ۔اجھیلنا لگانا۔اجیرن ہونا۔
اُچٹانا۔اُچٹنا۔اَچرج۔اَچَل۔اُچنگ۔اچھا رہنا۔اچھا لگنا۔اچھا ہونا۔اچھرّ ابھیّاس۔اچھل کود دکھانا۔اچھوتی کوک۔اچھوتا ہونا۔
اچھے۔اچھے یا اچھوں۔اچھے اچھوں۔
احاد۔احتلام۔احدی بیل۔احسان ہے۔احمق الذی۔
اختر شماری، اختصار۔اختلاف ہونا یا پڑنا۔اختیار لینا۔اخفائے تولد۔اخفائے واردات۔اخلاص جوڑنا۔اخلاص میں آنا۔اخلاطِ فاسدہ۔آخوند۔اخوند جی۔اُخوندِ سوات۔اخیر۔
ادا ہونا۔اداس ہونا۔اَدگدرا ہونا۔اد ماتی۔اُدمار۔ادوَان۔اَدھ یا آدھ۔ادھ گلا دس۔ادھ منا۔ادھار کرنا۔ادھار ہونا۔ادھر اٹھالینا یا کر لینا۔ادھر چلنا۔ادھر سے ادھر پھر جانا۔ادھر سے ادھر کرنا۔ادھر سے ادھر ہونا یا ہو۔جانا۔ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ادھر ہاتھ لانا یا ادھر ہاتھ دینا۔ادھر یا اُدھر۔اُدھر سے۔اُدھلا پڑنا۔ادھلنا۔ادھین یا آدھین۔ادس۔
اِرادَت۔اِرادَہ۔اَراروٹ۔اراَضیٔ بندوبستی۔اراضیٔ جَلکر۔اراضیٔ خالصہ۔اراضیٔ دریابرو۔اراضیٔ شکنی۔اراضیٔ شاملات اراضیٔ شور۔اراضیٔ معافی۔اراضیٔ منضبط۔اراضیٔ تو تردّد۔اراضیٔ وقف۔ارب کھرب۔ارباب عدالت۔ارباب عشرت۔ارباب علم۔ارباب ہنر۔اربع عناصر۔ارتفاع۔ارتکاب۔ارتکاب جرم۔ارتھی نکلے۔اُردو۔ارزانی۔ارسال کرنا۔ارسطو یا اَرسطاطالس۔ارشاد فرمایا۔ارشاد ہونا۔ارشمیدس۔ارض ارمان آنا۔ارمان ہونا۔ارمان دہلی۔اریا بھینسا۔ارنڈی۔ارواح بھرنا۔ارواح نہ شرمائے۔اری اریب۔اریواں۔اریواں باتیں۔ارتھ۔
آڑا۔آڑاس۔اَڑا کر لینا۔اڑان۔اڑانا۔اڑاوَیا اڑاوَکھاوَ۔اڑبنگا۔اڑتی۔بیماری۔اڑگھڑا ہونا۔اڑنگے ہر چڑھنا۔اڑنگے ہر مارنا۔اڑھایا۔
اس برتے پر تتّا پانی۔اس بھول کا خدا حافظ۔اس کان سے سنا اس کان اڑانا۔اُسارا۔اسامیٔ شکمی۔اسامیٔ غیر موروثی۔اسامیٔ مستقل۔اسامیٔ موروثی۔اسبابِ جہالت۔اسبابِ مانع اِرث۔اسپات۔اسپرٹ۔استادی۔استحقاقِ شمع۔استحقاق نالش۔استخراج۔استرخاء۔استرہ لینا۔استقائے آبی یا زنی۔استقائے طبلی۔استقائے لحمی۔استعارہَ بالتصریح۔استعارہَ بالکنایہ۔استعمال کرنا۔استعمال ہونا۔استعمالی۔اسٹابری۔اسٹوڈنٹ۔اسٹیشن ماسٹر۔اسرارالہیٰ۔اسقاط۔اسکالرشپ۔اسکول ماسٹر۔اسے چھپاوَ اسے نکالو۔اسیرسلطانی۔اُسیر۔اسیرباد۔انتیس۔اسٹینا۔

اشتعال دینا۔اشتہاری مجرم۔اشرافت ۔اشک بازی۔اشک ریزی۔اشک سوئی۔اُشلک لگانا۔اشبنان۔اشبنان دھیان۔

اصراف۔اصطباغ۔اصطباغ دینا۔اصطباغ لینا۔اَصلاح خبر نہیں۔اصلاح بنانا۔اصلاح بننا۔اصلاح بنوانا۔اصلوں۔

افسانہ آنا۔افسُر دہ دلی۔افشا کرنا۔افشا ہونا۔افشائے راز کرنا۔افشاں۔افلاطون کا بچہ۔افلاطون کا سالا۔اَفیمی۔

اقبال مندی۔اقبالی۔اقتدارِ جائز۔اقدام۔اقدام قتل عمد۔اقرار صالح۔اقراری۔اقوام۔

اُکت۔اکتا جانا۔اکچھت۔راج۔اکڑ باز۔اکڑ باز خاں۔اکڑ بازی کرنا۔اکڑ جانا۔اکڑ دکھانا۔اکڑ فوں کرنا یا دکھانا۔اکڑ کے چلنا۔

اکڑ وڑا۔اکڑیت۔آکسیجن۔اکلانا۔اکنا نجمنٹ۔اکونا۔اکھاڑ پچھاڑ کرنا۔اکھاڑ پچھاڑ ہونا۔اکھڑنا ۔اکھیڑنا

اگٹوانا۔اگرمگر ہونا۔اگر دھوں دھوں۔اگر پلیٹو۔اگم۔اگم باندھنا۔اگم شاستر۔اگوانی یا اگوائی۔اگھاڑنا۔اگھانا۔اگھانا۔

الاراسی کارخانہ۔الاراسی مزاج۔الاڑ۔الاڑو۔الانگنا۔الاہنا۔الاہنا دینا۔الاپچی بہن۔البتہ۔البیت۔التمغا۔الٹ۔الٹ بید۔الٹ بید پڑھانا۔الٹ پڑنا۔الٹ پلٹ۔الٹ پلٹ کرنا۔الٹ پلٹ ہونا۔الٹ جانا۔الٹا پھرنا۔الٹا توا۔الٹا دھڑا باندھنا۔الٹا زمانہ الٹا لیا جائے نہ سیدھا۔الٹنا یا الٹ دینا۔الٹی بات۔الٹی سیفی پڑھنا۔الٹے کانٹے تولنا۔الٹی کرنا۔الحال۔الحان۔الحان داؤدی۔العبد۔الف لیلہٰ۔الف۔الف سے ے نہ کرنا۔الف کھینچنا۔الف کے نام بے نہ جاننا۔الف مقصورہ۔الف ممدودہ۔الفا۔الفت کا بندہ۔القا ہونا۔الکھ جاگے۔الکھ جگانا۔الکھ دھاری۔الگ الگ۔الگ ہونا۔الٹیو۔اللہ آمین۔ اللہ آمین سے پالنا ۔اللہ آمین کا۔اللہ حافظ۔اللہ کا نام۔اللہ کی جان۔اللہ کے لوگ یا اللہ لوگ۔اللہ مارا۔اللہ میاں کا جی۔اللہ نظر آتا ہے۔اللہ والا۔الذی نہ للذی۔الو بننا۔الو کا گوشت کھلانا۔الوان۔الوپ۔الوداع کا جمعہ یا الوداعی جمعہ۔الونا۔الوہیت۔الھڑ یا لڑھ۔الہیٰ رات۔الہیٰ کرے۔الہیٰ مہر۔

اَن جل۔ان داتا۔ان کا کیڑا۔ان۔ان بن ہونا۔ان پڑھ۔ان پانی۔انت۔انت بنت۔انتی سار۔اتنی سار۔اتنی سار ہو کر نکلنا۔انتا گڑ گڑ ہونا۔انٹا گھر۔انٹرسٹ۔انٹی بازی۔انجام کار۔انجماد۔انجن سارنا۔انجن سار۔انجن۔انجنا۔انجن ہاری۔انداز پٹی۔اندام نہانی۔اندرائن۔اندرون۔اندرون خانہ۔اندری۔اندر بجری۔انڈنٹ۔اندھ۔اندھ آنا۔اندھاپن۔اندھکا۔اندھیر کرنا۔اندھیر کھاتا۔اندھیر مچانا۔اندھیری جھکنا۔اندھیری چھانا۔اندھیری دینا یا چڑھانا۔اندھیری ڈالنا۔اندھے کی لاٹھی یا لکڑی۔اندیشہ کرنا۔اندیشہ ہونا۔انڈے۔انڈے اڑانا۔ہونا۔انضباط۔انعام دینا۔انعام لینا۔انعکاس ۔انفارمیشن۔انفساح۔انفکاک۔انفکاک رہن۔انقضا۔انقضائے معیاد۔انکس۔انگ۔انگ لگنا۔انگارا بننا۔انگاروں پر لوٹنا۔انگشت۔انگشت نمائی۔انگشری انگلانا۔انگلی پکڑ کر پہنچا پکڑنا۔انگلی رکھنا۔انگلی کرنا۔انگلی لگانا۔انگلیاں۔انگلیوں پر نچانا۔انگنت۔انگوٹھا چومنا۔انگوٹھا نچانا۔انگور کی ٹٹیاں۔انگوری باغ۔انگوری بیل۔انگیا کاٹھرا۔انگیا کا گھاٹ۔انمان۔انمنا۔انمنا۔انت۔انت چودس۔انند۔انواع۔انوٹھی بات۔انوری۔انوکھی بات۔انہدام۔انہیں۔انی۔انیاں خنیاں۔انیک۔

اہانتِ عدالت۔اہل جوری۔اہل ودل۔اہل روزگار۔اہلِ سنت۔اہلِ سیف۔اہلِ سرع۔اہلِ صنعت۔اہلِ عرض۔اہلِ کمال۔اہلِ ہنر۔اہلے گہلے۔اُہے۔

ایتر۔ایتلافِ ثلثہ۔اینٹ۔ایجوکیشنل ڈپارٹمنٹ۔ایڈ ڈی کیمپ۔ایڈورٹائیزر۔ایڈیٹر۔ایڈی ٹوریل۔ایڈیشنل۔ایڈی

کا نگ۔ایڑی دیکھ۔ایڑیاں رگڑ۔ایڑیاں گھسیٹنا۔ایساں یا ایس۔ایسی ویسی بات کرنا۔۔ایف۔اے۔ایک بات۔ایک بارگی۔ایک بازار بند ہونا یا ایک طرف کا بازار بند ہونا۔ایک جان کرنا۔ایک ذات کا۔ایک زبان۔ایک زبان رکھنا۔ایک طرح کا۔ایک عمر۔ایک قلم۔ایک منہ۔ایک ہو جانا۔ایک ہے۔ایکا۔ایکا ایکی۔ایکٹ۔ایکھ۔ایلیم۔ایلو۔ایمان کا۔ایمان لانا۔ایماندار۔ایمانداری۔ایم۔او۔ایل،ایم۔اے،اینٹھ۔اینٹھ کر چلنا۔اینچا۔تانی۔اینڈ۔اینڈ کر دینا۔اینڈ ہو جانا۔اینڈا اینڈا پھرنا۔اینڈ وا۔اینڈ وی۔ایڈی بلینڈی۔ایوب۔ایوننگ۔پارٹی۔

۳۔دونوں لغات کے مشترک اندراجات:

یہ ایک مختصر مقالہ ہے لہٰذا جو الفاظ ومرکبات وضرب الامثال اور محاورات فرہنگِ آصفیہ اور امیر اللغات میں مطابقت رکھتے ہیں۔ان میں سے چند اندراجات درج ذیل ہیں مثلاً: آبِ بقا۔آب پاشی۔آب دار۔آبرو۔آبلہ۔آپ۔آپ رُوپ۔آپ کو دور کھینچنا۔آپ کو شاخِ زعفران سمجھتے ہیں۔آپسداری۔آتشیں۔آہِ تن سوزِ دروں سے شکلِ آتش ہی مرا۔آتشک۔آتشکیا۔آتما۔آتون۔آٹا۔آٹھ آٹھ آنسو رونا۔آٹھ پہر۔آٹھواں گانٹھ کمیت یا کمید۔آٹھ پہر سولی ہے۔آثار۔آثار شریف۔آثارِ قیامت یا آثارِ حشر۔آج۔آج برس کے پھر نہ برسوں۔آخ۔آخرالامر۔آختہ۔آداب بجالانا۔آدمیت۔آرا۔آرام۔آڑ۔آڑا۔آزار۔آزُردَہ۔آزمائش۔آسمان زمین کے قلابے ملانا۔آشفتہ۔آشیاں۔آصف۔آغا۔آغا مینار۔آفاق۔آفرین۔آقا۔آکا۔آگاہ۔آگے کا اٹھاہ۔آلان۔آلودہ۔آمد۔آمیزش۔آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا۔آنکھ لگنا۔آواگون۔آوُرد۔آہ لینا۔آہن۔آیت۔آئین۔ابتر کرنا۔ابلیس۔اُپاڑنا۔اپنائیت۔اتحاد۔اُترائی۔اَٹکل۔اُٹھتے جُوتی بیٹھتے لات۔اثاثہ۔اثبات۔اجاڑ۔اَجنبی۔احتیاج۔اَحمق۔اختر شماری۔اخلاص مند۔اُداسا کسنا۔اَدَل بَدَل۔اذان دینا۔اِذنِ عام۔اِرادت۔ارشاد کرنا۔اُژ ْدِّھو۔ارزق۔اَستھان۔اَشلُوک۔اصلالت پر آنا۔اِضمحلال۔اَطلَس۔اظہار دینا۔افتاد۔اقبال۔اکارت۔اگیا بیتال۔الٹی سمجھ۔اَمَل بید۔اندھا ہونا۔اوسوں پیاس نہیں بجھتی۔اہلِ نظر۔ایک ایک کر کے وغیرہ۔

۴۔ترتیب اندراجات:

مذکورہ دونوں لغات میں تمام اندراجات ہجائی ترتیب سے دیے گئے ہیں۔فرہنگِ آصفیہ کی جلد اوّل میں الف ممدود اور الف مقصورہ کے الفاظ ومحاورات کو ایک ساتھ ہی درج کیا گیا ہے جیسے۔۔آ۔آ بلا گلے پڑ نہیں پڑھتی۔آ بھائی۔آ بے لونڈے جا بے لونڈے۔آ پڑنا۔آ پڑوسن گھر کا بھی لے جا۔آ پڑوسن مجھ سی ہو۔آ پہنچنا۔آ پھنسنا۔آ جانا۔آ رہنا۔آ گرنا۔آ لگنا اور آ لینا کے بعد۔اب۔اب کر کے۔اب بھی۔اب تک ہونا۔اب تک۔اب تو پتھر یلے ہاتھ دب گیا۔اب سے دور۔اب کے۔کے لغات شامل ہیں جب کہ امیر اللغات کی پہلی جلد میں الف ممدودہ کے الفاظ ومحاورات شامل ہیں۔امیر مینائی نے باب الف کی سرخی کے بعد باب الف مع الالف کی سرخی دی ہے اس کے بعد الف ممدودہ کے تمام اندراجات کو فصل کی تقسیم کر دیا ہے۔جیسے فصل الف ممدودہ مع بائے موحدہ کی سرخی کے بعد اس کے لغات آب۔آب آب۔آب آب کر مر گئے۔سرہانے وہر و یا پانی وغیرہ شامل ہیں۔پھر فصل الف ممدودہ مع

بائے فارسی کے الفاظ ومحاورات درج ہیں اسی طرح جلد دوم کا آغاز فصل الف مقصورہ مع بائے موحدہ میں اب۔ ابا۔ اب اب کر کے وغیرہ کے اندراجات شامل ہیں۔ دونوں لغات میں اکثر ذیلی یا تحتی مرکبات ومحاورات شامل ہیں لیکن ان کے مفرد لفظ یعنی ہیڈ ورڈ کا اندراج نہیں ہے جیسے۔ امیر اللغات میں اُپاڑنا کا اندراج ہے لیکن اُپاڑ کا لفظ نہیں دیا گیا ہے۔ اسی طرح اُجلا کا لفظ نہیں دیا گیا اور اُجلا کارخانہ درج ہے۔ ''فرہنگِ آصفیہ'' میں بھی اِحرام کا اندراج نہیں ہے جب کہ اِحرام باندھنا موجود ہے۔

۵۔ مذکورہ لغات کے الفاظ کا املا:

اس معاملے میں امیر اللغات نے بہت سے لفظوں کو ملا کر ایک ساتھ لکھ دیا ہے جس سے قاری کو اندراج پڑھنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے آج کریگا کل پائیگا۔ اس کے علاوہ امیر اللغات میں جگہ جگہ لفظوں کو ملا کر لکھا گیا ہے مثلاً آج اسکا زمانہ ہے۔ آج کسکا منھ دیکھا ہے۔ اپنا ماریگا تو پھر چھاؤں میں بٹھائیگا۔ آجتک پرئے ہینگ لگ رہے ہیں۔ آجکل ہونا وغیرہ۔ فرہنگ آصفیہ میں کہیں کہیں لفظوں کو ملا کر لکھا گیا ہے لیکن زیادہ تر اندراجات کو ملا کر نہیں تحریر کیا گیا ہے جیسے آج کس کا منہ دیکھا ہے یا آج کس کا منہ دیکھکر اٹھے ہیں۔ اس میں دیکھکر ملا کر لکھ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آج کل ہونا۔ آج تک ہینگ پڑے سکتے ہیں۔

فرہنگِ آصفیہ آج میں ''آج کے تھپے آج ہی نہیں جلتے'' لکھا ہے جب کہ امیر اللغات میں ''آجکے تہپے آج ہی نہیں جلتے'' تحریر ہے۔

۶۔ اب دونوں لغات کے الفاظ کے تلفظ کی نشان دہی کی جائے گی۔

جیسے فرہنگِ آصفیہ میں لفظ آڑُو پر اعراب لگا کر اس کے تلفظ کی نشان دہی کی گئی ہے جب کہ امیر اللغات میں لفظ آڑو پر اعراب نہیں لگائے گئے ہیں۔

اسی طرح فرہنگِ آصفیہ میں ''آوُرد'' پر اعراب لگائے گئے ہیں امیر اللغات میں آورد پر کوئی حرکت واضح نہیں کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اپنائیت۔ اثاثہ۔ اُچٹنا۔ اِحاطَہ۔ اَضلاع۔ اِعَانت۔ اِغماص۔ اَقارِب۔ اِقامَت۔ اِقتدار۔ اِقرار نامہ اور اَکارت وغیرہ پر فرہنگِ آصفیہ میں اعراب لگا کر تلفظ کی نشان دہی کا اہتمام نظر آتا ہے جب کہ امیر اللغات نے ان تمام الفاظ کا تلفظ واضح نہیں کیا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں اُلفَتہ ہے جب کہ امیر اللغات میں یہی اندراج اَلفَتہ تحریر کیا گیا ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں ازرق اور امیر اللغات میں اَرزق لکھا ہے۔ الفاظ کے تلفظ کی نشان دہی کے معاملے میں فرہنگِ آصفیہ میں امیر اللغات کی نسبت زیادہ اہتمام کیا گیا ہے۔ امیر اللغات میں کئی الفاظ کا تلفظ واضح نہیں کیا گیا ہے۔

۷۔ قواعدی نوعیت:

فرہنگِ آصفیہ میں اندراجات کی قواعدی نوعیت کو زیادہ واضح کیا گیا ہے اور امیر اللغات میں اس کا اہتمام کم نظر آتا ہے جیسے: لفظ آبرو کو فرہنگِ آصفیہ میں مونث تحریر کیا گیا ہے جب کہ امیر اللغات میں اس کی قواعدی نوعیت نہیں لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ

آبلہ فرہنگ میں اسمِ مذکر و آتشکیا اِسم مذکر، آٹھ آٹھ آنسو رونا فعل لازم، آٹھ پہر = ظرفِ زماں، آج = ظرفِ زماں، آج کل = ظرفِ زماں، آختہ = صفت، آرا اور آراستہ = صفت، آس پاس = تابع فعل وصفت ، آسودہ = صفت، آشفتہ اور آشکار = صفت، تحریر ہے اور امیر اللغات میں ان قواعدی نوعیت نہیں دی گئی ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں آغوش کو اسم مونث لکھا گیا ہے جب کہ امیر اللغات میں مذکر لکھا ہے ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ ''شعرا نے مذکر مونث دونوں استعمال کیا ہے لیکن مولف مذکر کو ترجیح دیتے ہیں۔'' آگ برسانا فرہنگ میں فعلِ معتدی تحریر ہے جب کہ امیر اللغات میں اس کی قواعدی نوعیت موجود نہیں ہے۔

۸۔ معنوی وضاحت کا تقابل:

مذکورہ لغات کی معنوی وضاحت کی شقوں میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔ اس معاملے میں امیر اللغات نے جامعیت اور اختصار سے کام لیا ہے۔

فرہنگِ آصفیہ:

آبلہ:

(۱) چھالا۔ پھپھولا۔ کسی چیز کے تیز جلنے یا سوزش وغیرہ سے جو بخارات پیدا ہو کر کھال کے اندر اکھٹے ہو جاتے ہیں اور ان سے پانی بن کر حباب یا بلبلے کی سی شکل بن جاتی ہے اسے آبلہ کہتے ہیں۔ (۲) دانہ۔ چیچک۔ چیچک کا بڑا پھلکا۔ پھنسی۔

آتشکیا:

آتشک والا۔ آتشکی۔ وہ شخص جس میں آتشک موجود ہو۔

آٹھ پہر سولی ہے:

(۱) ہر وقت موت کا سامنا ہے۔ ہر وقت آفت ہے۔ ہر دم ہلاکت سامنے کھڑی ہے۔ تکلیف ہی تکلیف ہے۔ مصیبت ہی مصیبت ہے۔ صدمہ ہی صدمہ ہے۔ رات دن کا دکھ جیسے اس بچے کے ہاتھوں سے مجھے آٹھ پہر سولی ہے۔ (۳) رات دن کا طعنہ تشنہ۔

امیر اللغات:

آبلہ:

چھالا۔ پھپھولا۔

آتشکیا:

آتشکی۔ وہ شخص جس کو گرمی کی بیماری ہو۔

آٹھ پہر سولی ہے:

دن رات بلا کا سامنا ہے۔

آدمیت:

(۱) انسانیت دیکھو (آدمگری) (۲) تربیت۔ تعلیم۔ خوش صحبتی۔ شرافت۔ اہلیت۔ تمیز داری۔ عقلمندی۔ ہوشیاری۔ عقل وشعور۔ تہذیب۔ خوش سلیقگی۔ (۳) خوش اخلاقی۔ خوش خلقی۔ نیک نہادی۔ وہ نیک عادتیں اور اخلاق کی باتیں جو انسان میں سب سے اعلیٰ ہونے کے سبب ہونی چاہییں۔ (۴) نرم دلی۔ دردمندی۔ ہمدردی۔ مروت۔ ملائمت۔ (۵) بلند حوصلگی۔ عالی حوصلگی۔ عالی ہمتی۔ جرات۔

آدمیت:

عقل وشعور۔ خلق و مروت۔ ملنساری۔ وضعداری وغیرہ۔ جو صفات انسانی ہیں۔

آرام ہونا:

تندرست ہونا۔ بیماری سے شفایاب ہونا۔ مرض کا دور ہونا۔ شفا پانا۔ صحت پانا۔

آرام ہونا:

(۱) آسائش ہونا۔ چین آ جانا۔

آڑے آنا:

(۱) درمیان آنا۔ بیچ میں پڑنا۔ سامنے آنا۔ حائل ہونا۔ پردہ کرنا۔ چھپانا، (۳) سپر ہونا۔ ڈھال ہونا۔ روک ہونا۔ ٹٹی بننا

آڑے آنا:

کام آنا۔ حمایت اور مدد کرنا۔ پناہ میں لینا۔

آسمان زمین کے قلابے ملانا:

(۱) عیاری کرنا۔ چالاکی کرنا۔ توڑ جوڑ ملانا۔ (۲) چرب زبانی کرنی۔ سخن سازی کرنا۔ نہایت جھوٹ بولنا۔

آسمان زمین کے قلابے ملانا:

(۱) انتہا کی کوشش کرنا۔ (۲) ہل چل مچانا۔ ہنگامہ برپا کرنا۔ (۳) جھوٹ بولنا۔ بے فائدہ باتیں بنانا۔

آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا:

(۱) نظر اونچی کر کے نہ دیکھنا۔ آنکھ بھر کر نہ دیکھنا۔ نظر ملا کر نہ دیکھنا۔ (۲) خاطر میں نہ لانا۔ کچھ نہ سمجھنا۔ کسی چیز سے دل اٹھا لینا۔ اکراہ کرنا۔ بے قدری کرنا۔ بیزار ہونا۔ (۳) متکبر ہونا۔ مغرور ہونا۔ ابھمان کرنا۔ گھمنڈ کرنا۔ گھمنڈی ہونا۔ خود بین ہونا۔ (۴) شرم کرنا۔ شرم سے آنکھ سامنے نہ کرنا۔ شرم کے مارے آنکھ بھر کر نہ دیکھنا۔ لاجونتا ہونا۔ نادم ہونا۔ سلجانا۔ حجاب کرنا۔ منفعل ہونا۔ منہ چھپانا۔ محجوب ہونا۔ حیامند ہونا۔ صاحب حیا ہونا۔ حیا کرنا۔ شرم کرنا۔ لاج کرنا۔ لجانا۔

آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا:

(۱) شرمانا۔ لجانا۔ (۲) التفات کرنا۔

آنکھوں میں رات کاٹنا:

جاگ کر رات بسر کرنا۔ بیٹھ کر رات گزارنا۔ آنکھ نہ چھپکانا۔ رات بھر جاگنا۔ آنکھ بند نہ کرنا۔ تڑپ کر رات کاٹنا۔ کروٹوں میں صبح کر دینا۔ تمام رات بیٹھ کر کاٹنا۔ انتظار میں رات گزارنا۔ رات بھر رستہ تکنا۔ منتظر رہنا۔ اختر شماری کرنا۔

آنکھوں میں رات کاٹنا

بے کیفی سے رات بھر جاگتے رہنا۔

ابرِ نیساں:

گنوارکنیا۔ ابر بہاراں۔ ابر بہاری۔ وہ ابر جو موسم بہار یعنی ستمبر میں برستا ہے۔ ایشیائی لوگ خیال کرتے ہیں کہ سیپی میں موتی۔ کیلے میں کافور۔ کالے سانپ میں زہر۔ بانس میں مسلو چن اسی سے پیدا ہوتا ہے۔

ابرنسیاں:

وہ ابر جو فصل ربیع میں نوروز سے چالیس دن قبل یا چالیس دن بعد برستا ہے۔

اُتّر:

(۱) جواب۔ مقابل۔ تقابل۔ بالمقابل۔ محاذی۔ ہمتا۔ (۲) سمت۔ جانب۔ (۳) خط کا جواب پاسخ۔ (۴) شمال دکن کے مقابل کی سمت۔ قطب شمالی کی سمت۔

اُتّر:

جب کوئی اس طرف منہ کر کے کھڑا ہو جدھر سے سورج نکلتا ہے تو اس کے بائیں رُخ جو سمت پڑے وہ اُتر ہے۔

اٹکل:

(۱) انداز۔ قیاس۔ تخمینہ۔ (۲) آنک۔ جانچ۔ کونت۔ (۳) پرکھ۔ شناخت

اٹکل:

دانست۔

اَزرق:

(۱) نیلگوں۔ نیلا۔ کبود۔ کرنجو سے مشابہ۔ آسمانی۔ ڈھنیلا۔ (۲) گربہ چشم۔ کرنجا۔ کیرا۔ بلی کی سی آنکھوں والا۔

اَزرق (ف):

نیلا۔ وہ آدمی جس کی آنکھ کنجی ہو۔

اَلفَنگ:

(عو) اہل لکھنو وجہلا۔ بفتح الف (۱) لغوی معنی پریشان۔ پریشان حال۔ فراوانی۔ رِندمشرب۔ مفلس۔ قلاش۔ ننگ دھڑنگ۔ مفلسا بیگ۔ (۲) غیر بیگانہ۔ اجنبی۔ غیر مستحق۔ ابرا غیرہ۔ (۳) بدمعاش۔ آوارہ بدچلن۔

الفنگ:

ہفت خور۔ لچا۔ شہدا۔

آڑ تلا: **آڑ ملا:**

(آڑ۔ تلا) (۱) زیر سایہ۔ پناہ۔ سَرنَ۔ پُشتی۔ بچاؤ۔ آسرا۔ سہارا۔آڑ۔بھروسا۔
سہارا۔(۲)حیلہ۔بہانہ۔

۹۔دونوں لغات کی اسناد کا تقابلی مطالعہ:

فرہنگِ آصفیہ لفظ اپ کے۱۲۲اشعار ہیں جو کہ شیفتہ، مخیرّ، میر،نسیم دہلوی،معروف، سالک، داغ،شہید،نگہت،مومن اور جرات کے کلام سے لیے گئے ہیں جب کہ امیر اللغات میں اسی لفظ کے لیے سند کے ۱۱۰اشعار استعمال کیے گئے ہیں جن میں صرف نکہت اور مومن کا ایک ایک شعر مشترک ہے باقی صبا، آتش، وزیر، ناسخ اور بحر کے کلام سے اسناد لی گئی ہیں۔اسناد کے معاملے میں امیر اللغات کو فرہنگِ آصفیہ پر فوقیت حاصل ہے۔ بہت سے ایسے اندراجات ہیں جس کے لیے امیر اللغات نے فرہنگ کی نسبت زیادہ اسناد دی ہیں اور کئی اندراجات کے لیے فرہنگِ آصفیہ میں کوئی سند نہیں دی گئی ہے۔مثلاً آ پکوشاخِ زعفران سمجھتے ہیں میں امیر اللغات نے انشا، سرور، دہلوی،نصیر اور نکہت کے اشعار دیے ہیں جب کہ فرہنگ میں ایک بھی شعر نہیں دیا گیا۔اسی طرح آخرالامر، آخرت، آخون کے اندراجات کے لیے کوئی شعر مثال کے طور پر نہیں دیا ہے جب امیر اللغات میں قلق۔آتش۔جاں صاحب۔معروف اور ولہ کے کلام سے اسناد دی گئی ہیں۔

(۲)

سید احمد دہلوی کے ان اعتراضات کے پیچھے جو اسباب کارفرما نظر آ رہے ہیں ان کو سمجھنے کے لیے چند تقاریظ کا اور تبصروں کا مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے جو کہ ''فرہنگِ آصفیہ'' میں شائع ہوئیں۔مثلاً نواب مولوی محمد نقی خان قمر اپنی تقریظ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''آپ کے جوہر میں یہی خوبی ہے کہ دہلی کی زبان کے الفاظ جب لکھتے ہیں تو اس کے معانی تشریح وتوضیح کے ساتھ بیان کرتے ہیں۰۰۰آپ سے بہتر یا آپ کے برابر، اردو الفاظ کے معنی کیا بیان کر سکتے ہیں۰۰۰امیر اللغات ''فرہنگِ آصفیہ'' یا سید اللغات کی نقل ہے۰۰۰ میں ان نامکمل کتب کو دیکھ چکا ہوں۔جو صاحبان لکھنؤ کے قلم سے نکلی ہیں۔''[۴۴]

ان کے مطابق لکھنؤ میں کسی بھی محقق یا لغت نویس نے شہر دہلی اور قلعہ معلی کی زبان پر لغت لکھی ہو یا اس سے درست معنی و مطالب بیان کیے ہوں۔امیر اللغات کو دہلی کی زبان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔[۴۵]

اس ضمن میں سر مور گزٹ ناہن کا موقف ہے کہ:''فرہنگِ آصفیہ'' کی حمایت اور امیر اللغات کی مخالفت میں اکمل الاخبار میں مضامین شائع ہوتے ہیں اسی طرح لکھنؤ سے آزاد، مہذب اور ریاض الاخبار گھور گھپور وغیرہ امیر اللغات کے معاون کے طور پر کام کر رہے ہیں۔جو محنت''فرہنگِ آصفیہ'' میں کی گئی ہے اس کے سامنے امیر اللغات اور فرہنگ کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔اس کی

مثال ایسے ہے جیسے ایک مدرسہ یا مکان (امیر اللغات) کسی کالج یا محل (فرہنگِ آصفیہ) کے بانی کے ساتھ مقابلہ کرنا۔''[۴۶]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے دہلوی و لکھنوی دبستان کو الگ الگ پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق یہ بات شعرالہند سے شروع ہوئی تھی اور ان کے مطابق علی جواد زیدی کا بھی یہی نظریہ تھا کہ دہلی اور لکھنو کی بحث کو تاریخ ادب سے خارج کر دینا چاہیے۔''[۴۷] لیکن مذکورہ بالا اقتباسات کے علاوہ بھی کچھ شواہد ایسے ہیں جن میں مولف ''فرہنگِ آصفیہ'' دہلویت پر فخر کرتے ہیں اور دیگر لکھنویت وغیرہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں جسے رشید حسن خان فرماتے ہیں کہ مولوی صاحب کٹر دلی والے تھے اور ان کا یہ خیال تھا کہ زبان کے معاملے میں لکھنؤ والوں کو دلی والوں کی نقل کرنی چاہیے اور دلی سے باہر کا آدمی چاہے اس کا تعلق لکھنؤ ہی سے کیوں نہ ہو اہل زبان کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا۔

> ''اس بنا پر ہم کہتے ہیں کہ دہلی کے سوا کوئی دوسرا شہر ٹکسالی اور مرکز اردو قرار نہیں پا سکتا۔ اردو لکھ لینا اور ہے اور اس کا صحیح لہجہ ادا کرنا اور۔'' (آصفیہ جلد اوّل، ص ۶۶)[۴۸]

مذکورہ بالا مطالعہ سے کہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سید احمد دہلوی نے جو اعتراضات اور الزامات امیر پر لگائے تھے ان میں معاصرانہ چشمک کا عنصر نمایاں ہے اور اسی عنصر کے پس پشت جذبہ خود پسندی بھی چھپا ہوا ہے ایک طرف تو سیّد احمد کا تعلق دہلی سے تھا دوسری طرف وہ اردو کی ایک بڑی لغت مرتب کرر ہے تھے۔ جو کام اردو لغت نویسی پر وہ کرر ہے تھے تو ان کو یہ برداشت نہیں ہو رہا تھا کہ کوئی دوسرا بھی اس میدان میں اتر کر اپنا نام پیدا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے امیر مینائی پر الزامات لگائے اور اپنی فرہنگ میں ان کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کیے۔ ان اندازِ گفتگو کو پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ان کو کسی بات کی کوئی پروانہیں ہے اور یہ تمام الزامات انھوں نے ایک ایسی علمی کتاب میں شامل کر دیے جو کہ ایک لغت نویس کو نہیں کرنا چاہیے۔ اخبارات کی حد تک تو بے جا الزامات لگائے بھی جاتے ہیں اور چل بھی جاتے ہیں۔ لیکن لغت جیسی مستند کتاب میں یہ تمام اعتراضات اور الزامات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا ہے۔

۱۔ مذکورہ بالا تقابلی مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ''امیر مینائی'' نے ہزاروں کی تعداد میں الفاظ و محاورات تلاش کر کے ان کو شامل لغت کیا جب کہ ''فرہنگِ آصفیہ'' میں ان کا اندراج نہیں ہے اور اسی طرح سیکڑوں غیر ضروری اندراجات کو ترک کیا۔

۲۔ معنوی وضاحت کے شقوں میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔

۳۔ اسناد کے معاملے میں بھی ''امیر اللغات'' آگے ہے۔ جب کہ ''فرہنگِ آصفیہ'' میں بہت سے الفاظ و محاورات کی سند نہیں دی گئی ہے۔

۴۔ اندراجات کی قواعدی نوعیت کو ''فرہنگِ آصفیہ'' نے زیادہ واضح کیا ہے۔ جہاں تک اعراب لگانے کا مسئلہ ہے اس معاملے

میں بھی ''فرہنگ آصفیہ'' نے زیادہ اہتمام کیا ہے۔

بہ ہر حال لعت نویسی میں سرقہ کا الزام اس لغت نویس پر لاگو ہوتا ہے جو کسی دوسرے لغت کی معنوی وضاحت (تشریح) اور اسناد کی ہو بہو نقل اتارے جب کہ ''امیر اللغات'' اس الزام سے بری الذمہ ہے۔ بلکہ یہ امیر مینائی کا ایک کارنامہ ہے کہ انھوں نے ہزاروں اندراجات کو تلاش کیا جو کہ فرہنگ میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے اور خود اتنے بڑے شاعر ہونے کے باوجود اپنا ایک شعر بھی سند کے طور پر پیش نہیں کیا۔

حواشی:

۱۔ سید احمد دہلوی، ''فرہنگِ آصفیہ''، ج ۱، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۔

۲۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ''لغت نویسی اور لغات روایت اور تجزیہ''، فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، کراچی، ۲۰۱۵ء، ص ۱۶۴۔
ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ''لغوی مباحث''، مجلس ترقی ادب، لاہور، جون ۲۰۱۵ء، ص ۸۰۔

۳۔ ''فرہنگِ آصفیہ''، ص ۲۔۴۔۱۵۔

۴۔ ''لغت نویسی اور لغات''، ص ۱۶۴۔

۵۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ''اردو لغت نویسی تاریخ، مسائل اور مباحث''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۔
سید احمد دہلوی نے نور اللغات پر بھی سرقہ کا الزام لگایا ہے (فرہنگِ آصفیہ، ج ۱، ص ۱)

۶۔ ''فرہنگ آصفیہ''، ص ۵۔ سید احمد کے ننھیالی بزرگ عرب سرائے کے رہنے والے تھے ان لوگوں کو حاجی بیگم صاحبہ زوجہ ہمایوں بادشاہ نے ۹۶۸ھ مطابق ۱۳۶۰ء میں حضر موت۔ صوبۂ یمن واقع عرب سے لا کر بسایا تھا اور ان ہی کے نام سے ایک بستی بسائی گئی تھی (ج ۱، ص ۱۳)

۷۔ ایضاً، ص ۱۵۔

۸۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ''علم لغت، اصول لغت اور لغات''، فضلی سنز، کراچی، ۲۰۱۷ء، ص ۱۵۲ تا ۱۶۴۔
نیز ڈاکٹر رؤف پاریکھ ''اردو لغت نویسی، تاریخ، مسائل اور مباحث''، ص ۵۱۔ اس مضمون کے حاشیے میں قاضی عبدالودود فرماتے ہیں کہ صراحتاً کہیں نہیں لکھا کہ ارمغانِ دہلی کا کیا حشر ہوا مگر دیباچے (ص ۳ تا ۶) میں اپنے یہاں آتش زدگی اور اس کی وجہ سے اسی تصنیف مطبوعہ وغیر مطبوعہ کے ضائع ہو جانے کا ذکر کیا ہے۔ ظاہراً ارمغان دہلی بھی نذرِ آتش ہوئی ہوگی۔

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ''علم لغت، اصول لغت اور لغات''، ۲۰۱۷ء، ص ۱۵۲۔۱۶۴۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ کے پاس اس نسخہ کی جو عبارت ہے اس میں قیمت درج تھی لیکن ان کے مطابق پڑھی نہیں جا سکتی تھی۔ غالباً کسی کتب فروش نے مٹادی ہے۔ راقمہ کے پاس جو عبارت ہے اس میں ارمغان دہلی کی قیمت ۱۲عہ درج ہے اور لکھا ہوا ہے کہ مصنف کی بغیر اجازت کوئی نہیں چھاپ سکتا۔

۱۱۔ ''فرہنگِ آصفیہ''، ج ۱، ص ۳۶۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے ''ہندوستانی اردو لغات'' کی کچھ قسطوں کی فہرست اپنے مضمون ''فرہنگِ آصفیہ'' کی تدوین و اشاعت: چند غلط فہمیوں کا ازالہ'' میں دی گئی ہے۔ (علم لغت و اصول لغت اور لغات، ص ۱۵۷)

۱۲۔ ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن مشہور لغت نویس ہیں۔ سید احمد نے فیلن کی اردو انگریزی لغت کی تیاری میں مدد کی تھی۔ اس کام کے لیے سید احمد ے سال ۱۸۷۳ء تا ۱۸۷۹ء تک دیناپور میں رہے۔ واضح رہے کہ سید احمد پر فیلن کی لغت کا چربہ اڑانے کا الزام لگا ہے۔ جس کی تردید کی گئی ہے۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے: ''فرہنگِ آصفیہ''، ج ۱، ص ۳۔ نیز لغت نویسی اور لغات روایت اور تجزیہ''، ص ۲۳۱، حاشیہ ۱۰۔

۱۳۔ ''علم لغت، اصول لغت اور لغات''، ص ۱۵۹۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۵۸۔ نیز ''فرہنگِ آصفیہ'' مرتب خورشید احمد خان، س ن، مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ، ابتدائی صفحات میں یہ ترتیب دی ہے: ۰ ج، طبع اوّل، لاہور، ۱۹۰۸ء، ص ۵۶۸۔ ۱۹۱۸ء، ص ۶۶۸۔ دہلی، بھارت ۱۹۷۴ء، (۶۵۶، ۱۶ + ۶۶۴ = ۶۸۰ صفحات)۔ (ج ۲، لاہور، ۱۹۰۸ء۔ دہلی

بھارت، ۱۹۷۴ء، ص۴۲۴)۔(ج ۳، لاہور، ۱۸۹۸ء، لاہور۔ دہلی بھارت، ۱۹۷۴ء، ص۲۲۴)۔ (ج ۴، ۱۹۰۱ء، ص ۸۶۸۔۱۹۷۴ء، ص۷۹۶=۸۶۸)

۱۵۔ ''فرہنگِ آصفیہ''، ج۱، ص۶۔

۱۶۔ ایضاً، ج۱، ص۱تا۱۷۔

۱۷۔ ایضا:، ج۴، ص۷۹۵تا۸۶۰۔

۱۸۔ کرم الدین احمد، امیر مینائی اوران کے تلامذہ، ''آئینہ ادب''چوک مینار، انارکلی، لاہور،۱۹۸۲ء، ص۱۴۔ واضح رہے کہ کریم الدین نے امیر مینائی کا سن ولادت ۱۸۲۶ءلکھا تھا جس کی تصحیح ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے تقویم کے اعتبار سے ۱۸۲۹ء درست ثابت کی ہے تفصیلات کے لیے (لغوی مباحث:ص۱۰۱، حاشیہ۱) ملاحظہ کیجیے۔

۱۹۔ ''امیر مینائی اوران کے تلامذہ''، ص۱۵۔

۲۰۔ رام بابوسکسینہ، ''تاریخِ ادب اردو''، غضنفر اکیڈمی پاکستان، کراچی، ص۳۱۵۔

۲۱۔ ''امیر مینائی اوران کے تلامذہ''، ص۱۵۔

۲۲۔ ڈاکٹر ابومحمد سحر، ''مطالعۂ امیر''، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۶۵ء، ص۱۰۴۱۔ نیز لغوی مباحث، ص۲۷تا۷۷۔

۲۳۔ مجلّہ ''تحقیق''، جلد۱۸، شمارہ۱، سندھ یونیورسٹی، جام شورو، ۲۰۱۰ء، ص۵۴۔

۲۴۔ امیر مینائی، ''امیراللغات''، ج۱، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص۳۔

۲۵۔ ایضاً، ص۱۔

۲۶۔ ''لغوی مباحث''، ص۷۷۔

۲۷۔ شاہ ممتاز علی آہ، ''امیر مینائی''، ادبی پریس، لکھنؤ، ۱۹۴۱ء، ص۱۱۲۔

۳۵۔ امیر مینائی، ''امیراللغات''، جلدسوم، پنجاب اورینٹل کالج لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۱۲۔

۳۶۔ ''فرہنگِ آصفیہ''، دیباچہ، ج۱، ص۱۔

۳۷۔ ''فرہنگِ آصفیہ''، دیباچہ، ج۴، ص۴۔ مشمولہ کتاب ''اردولغت نویسی، تاریخ، مسائل اورمباحث'' از ڈاکٹر رؤف پاریکھ، مضمون، ص۳۸، حاشیہ۳

۳۸۔ ''اردولغت نویسی (تاریخ، مسائل اورمباحث)'' ص۴۱تا۴۴۔

۳۹۔ ایضاً، ص۵۱۔

۴۰۔ ایضاً، ص۸۳۳۔۸۳۴۔

۴۱۔ ''امیراللغات''، ج۳، تدوین ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ص۷۔

۴۲۔ حامد حسن قادری، ''داستان تاریخ اردو''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ص۹۰۳۔

۴۳۔ قاضی عبدالودود، ''زبان شناسی''، خدابخش لائبریری، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص۵۷۔

۴۴۔ ''فرہنگِ آصفیہ''، ج۴، ص۶۵۹۔

۴۵۔ ایضاً، ص۶۶۔۶۶۱۔

۴۶۔ ایضاً۔

۴۷۔ جمیل جالبی، ''تاریخ ادب اردو''، ج۳، طبع دوم وناظم مجلس ترقی ادب لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۵۳۔

۴۸۔ ''لغت نویسی اورلغات'' (روایت اورتجزیہ)، ص۲۳۴۔

فہرستِ اسنادِ محوّلہ:

۱۔ آہ، ممتاز علی، شاہ: ۱۹۴۱ء، ''امیر مینائی''، ادبی پریس، لکھنؤ۔

۲۔ احمد، کریم الدین: ۱۹۸۲ء، ''امیر مینائی اور ان کے تلامذہ''، آئینہ ادب، چوک مینار، انارکلی، لاہور

۳۔ امیر مینائی: ۱۹۸۹ء، ''امیر اللغات''، ج۲، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔

۴۔ ______: ۲۰۱۰ء، ''امیر اللغات''، جلد سوم، پنجاب اورینٹل کالج لاہور۔

۶۔ پاریکھ، رؤف، ڈاکٹر: ۲۰۱۵ء، ''لغت نویسی اور لغات روایت اور تجزیہ''، فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، کراچی۔

۷۔ ______: ۲۰۱۵ء، ''لغوی مباحث''، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۸۔ ______: ۲۰۱۰ء، ''اردو لغت نویسی تاریخ، مسائل اور مباحث''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

۱۰۔ ______: ۲۰۱۷ء، ''علم لغت، اصول لغت اور لغات''، فضلی سنز، کراچی۔

۱۲۔ خان، احمد، خورشید، مرتبہ: س ن، ''فرہنگِ آصفیہ'' مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ۔

۱۳۔ دہلوی، احمد سید: ۲۰۱۰ء، ''فرہنگِ آصفیہ''، ج۱، اردو سائنس بورڈ، لاہور۔

۱۴۔ ______: ۲۰۱۰ء، ''فرہنگِ آصفیہ''، ج۴،

۱۵۔ سحر، ابو محمد، ڈاکٹر: ۱۹۶۵ء، ''مطالعۂ امیر''، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ۔

۱۶۔ سکسینہ، رام بابو، ۱۹۹۳ء، ''تاریخ ادب اردو''، غضنفر اکیڈمی پاکستان، کراچی۔

۱۷۔ عبدالودود، قاضی: ۱۹۹۵ء، ''زبان شناسی''، خدابخش لائبریری، کراچی۔

۲۱۔ قادری، حسن، حامد، ۱۹۸۸ء، ''داستان تاریخ اردو''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی

مجلّہ:

☆ مجلّہ ''تحقیق''، جلد ۱۸، شمارہ ۱، سندھ یونیورسٹی، جام شورو، ۲۰۱۰ء، ص ۵۴۔

غیر مطبوعہ مقالہ:

☆ ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال: ۲۰۰۲ء، ''مکتوباتِ امیر مینائی کا تحقیقی جائزہ''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، سندھ یونیورسٹی، جام شورو۔

ABSTRACTS

Letters of Dagh- autobiographic reflection and their Critical reading

Letters are the valuable source of research while compiling biography and sketching personality of a writer, as they are the true reflection of one's thinking pattern. Dagh was an outstanding poet of nineteenth century who wrote romantic and sensuous poetry and laid a great emphasis on Urdu idioms and their usage. He wrote many letters to nawabs, his disciples and friends. They are rich source of biographical information. Dagh also wrote some letters to the courtesans of that times without hiding his inner feelings as such they present his amateurish nature. This article is a research based study of his letters as a vital source of Dagh's biographical information and personality analysis.

ڈاکٹر سمیرا اعجاز

مکاتیبِ داغ: سوانحی و شخصی آثار کی تنقیدی قرأت

داغ (انیسویں صدی) کے وہ شاعر ہیں جن پر بحیثیت انسان مثبت اور منفی تنقید کی گرد اُڑتی رہی ہے۔ خاص طور پر اُن کی سوانح کے حوالے سے جو بھی تحریریں منظرِ عام پر آئیں اُن میں سے بیش تر پر اُن کا منفی تاثر غالب رہا۔ داغ کے خطوط[۱]، اُن کی سوانح اور شخصیت کے مطالعے کا بہترین ماخذ ہیں۔ نجی اور خانگی خطوط بہ طور خاص اُن کے کردار، عمل اور اخلاق کے بارے میں جاننے کا اہم حوالہ بنتے ہیں مگر داغ نے شاگردوں، دوستوں اور امرا کے نام جو خط لکھے، ان میں بھی خود کو چھپانے کی کوشش نہیں کی یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہ خطوط، انسانی جذبات کے تمام تر تنوعات کی پیش کش کرتے ہیں اور ہم داغ کی زندگی کو اُن کے مکاتیب میں بے نقاب دیکھ سکتے ہیں۔ داغ کے مکاتیب کی سوانحی اہمیت کے حوالے سے رشید حسن خان لکھتے ہیں:

> ''داغ کی زندگی کے بہت سے گفتنی اور ناگفتنی واقعات کی جیسی سچی یادداشتیں ان خطوط میں محفوظ ہوگئی ہیں وہ حوالے کہیں اور نہیں ملیں گے اور ان حوالوں کے بغیر داغ کی سوانح حیات مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ داغ کے سوانح نگار کے لیے ایسے خط بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔''[۲]

امیر مینائی کے نام ایک خط مرقومہ ۱۸۹۱ء میں، اُنھوں نے اپنی تاریخ پیدائش ۱۱/ذوالحج ۱۲۴۰ھ بمطابق ۱۸۳۱ء درج کی ہے اور کنور اعتماد علی خاں حسرت کے نام خط مرقومہ ۱۸ جمادی الاوّل ۱۳۰۶ھ میں، روپے منگوانے کی غرض سے دہلی کی رہائش گاہ کا پتا بتایا ہے کہ وہ ''دلی چاندنی چوک کوچہ نیچہ بندان میں خلیفہ عبدالعزیز مہر کن کے پاس''[۳] رہتے ہیں۔ داغ دہلوی جب تک رام پور میں رہے بڑے

لطف و عیش سے زندگی بسر کی لیکن نواب کلب علی خاں فائق کی وفات کے بعد اُن کے معاشی حالات خراب ہو گئے۔ ۱۸۸۷ء میں وہ رام پور سے دہلی آ گئے مگر دل نہ لگا۔ داغ نے اپنے معاشی حالات کی خرابی کا ذکر بھی بہت سے خطوط میں کیا ہے کہ وہ مشکل سے گزران کرتے رہے اور قرض خواہی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ امیر مینائی کے نام خط مرقومہ ۱۸۹۱ء میں اُنھوں نے دہلی میں ملازمت کے حوالے سے مایوسی کا اظہار کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ وہ نہایت مقروض ہو گئے ہیں۔ معاشی حالات کی ابتری اور قرض خواہی کا ذکر خطوط میں بھی آیا ہے۔ کنور اعتماد علی خاں حسرت کے نام ۶ر جولائی ۱۸۸۹ء کے ایک خط میں وہ اس بات سے آگاہ کرتے ہیں کہ وہ اس خیال سے گھر سے باہر نہیں نکلتے کہ قرض خواہ تکلیف دیتے ہیں۔ انھی کے نام ایک اور خط مرقومہ ۱۸ر جمادی الاوّل ۱۳۰۶ھ میں وہ کنور صاحب سے سو روپیہ ماہوار اپنے لیے اور پچاس روپے ماہوار اپنی اُستانی کے لیے بہ طور قرض طلب کرتے ہیں۔ اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ دلی کے چاندنی چوک میں شمبھو ناتھ نامی بزاز سے بھی دو ہزار روپیہ قرض لے رکھا ہے جو گاہے گاہے تھوڑا تھوڑا ضرورت کے مطابق اس سے لیتے رہے مگر اب وہ بھی قرض کی واپسی کا تقاضا بڑی شدت سے کر رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ داغ نے شمبھو ناتھ کو پیسوں کی واپسی کے لیے کنور صاحب سے پیسوں کا مطالبہ کیا۔

شمبھو ناتھ کے نام ایک خط کے جواب میں، جس میں اُس نے داغ سے رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا، ۳ جمادی الاوّل ۱۳۰۶ھ میں شمبھو ناتھ کے نام خط لکھ کر شرمندگی کا اظہار کیا ہے۔ اُن کے سابقہ لطف و کرم، دوست نوازی اور غم خواری کا دم بھرتے ہوئے قرض کی واپسی کے لیے مہلت طلب کی ہے کہ ان شاء اللہ جلد حالات بدل جائیں گے اور رقم کی واپسی ممکن ہو گی۔

کلکتہ کی مشہور طوائف ملکہ جان کے نام ۹ر اگست ۱۸۸۶ء کے ایک خط میں اپنی زندگی کے مختصر حالات درج کیے ہیں جن سے درج ذیل معلومات ملتی ہیں۔

۱۔ الحمد اللہ کہ مجھ کو خدا نے عالی خاندان کیا۔

۲۔ دلی میرا وطن ہے جب وہ برباد ہوئی تو احتیاج روزگار ہوئی، رام پور میں نوکر ہوں۔

۳۔ چالیس پچاس آدمی کا رزق خداوند کریم دیتا ہے، رئیس مرا قدر دان ہے۔

۴۔ منفعت دنیا پر اگر نظر کرتا تو بہت کچھ پیدا کر لیتا۔

۵۔ ہندوستان میں کون سی جگہ ہے جہاں سے اس عاجز کی طلب نہ ہوئی۔

۶۔ کار ریاست اس قدر سپرد ہیں کہ جس سے مرنے کی بھی فرصت نہیں۔

۷۔ حجاب سے جو دل لگی ہوئی تھی ایک داستان طول طویل ہے اکثر وہ حال تم کو مثنوی ''فریادِ داغ'' سے ظاہر ہوا ہو گا، سر مو فرق نہیں۔

۸۔ وہ تلوار کی دھار پر مجھ سے ملی جس کی شہرت تو کیا رسوائی تمام ہندوستان میں ہوئی۔ پھر جدا بھی ایسی ہوئی کہ ملاقات کی اُمید نہ رہی۔

۹۔ میں ایک ریاست کا نوکر ریل کار کلکتے میں ہمیشہ کیوں کر رہ سکوں۔۔۔ ترکِ روزگار کیوں کر ہو سکے کہ یہ وسیلہ آبرو اور

حیلۂ معاش ہے۔ بائی جی کی یہ ضد بے ہودہ ہوئی کہ تمام عمر رام پور کی صورت نہ دیکھوں۔

۱۰۔ ملنے کو بلایا، لکھتے لکھتے انگلیاں گھس گھس گئیں، دفتر سیاہ ہو گئے مگر وہ نہ آئیں اور مولوی آل احمد صاحب کی پابند ہو گئیں۔

۱۱۔ اب تک کوئی آدمی مجھ کو مہرباں، مزاج داں نہ ملا کہ حجاب کا داغ، داغؔ کے دل سے مٹا دیتا۔[۴]

داغ کو مختلف خطابات سے نوازا گیا۔ ان خطابات کا ذکر بھی اُنھوں نے اپنے ایک خط بنام امیر مینائی، مرقومہ ۱۱رمحرم ۱۳۱۲ھ بمطابق ۱۸۹۴ء میں ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''داغ ناچیز کا جو اعزاز بعنایت الٰہی یہاں ہوا کسی پردیسی کو کہاں نصیب، اکثر امرا اور روٴسا ملکی بھی ہنوز محروم ہیں۔ ادنیٰ خطاب خاں بہادر اس کے بعد جنگ، افسر جنگ وغیرہ وغیرہ۔ ابھی جنگ سے آگے نہیں بڑھے اور بہت لوگ سو سو برس سے اس تمنا میں بلکہ مر گئے۔ مجھ کو خداوند عالم نے ایک ہی بار میں سب خطابوں سے سرفراز فرمایا۔''[۵]

داغ نے اپنے خطوط میں اپنی نگارشات کی اشاعت کے حوالے سے بھی معلومات دی ہیں۔ خط بنام مہاراج یوراج پرکشن بہادر بیدار میں تو انھوں نے اپنی کتاب ''آفتاب داغ'' کی اشاعت کی اطلاع دی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ یہ کتاب مطبع انوار الاخبار لکھنوٴ سے شائع ہوئی اور قیمت ایک روپیہ ہے۔[۶]

منی بائی حجاب کی چھوٹی بہن حمیدن بائی نقاب کے نام مکتوب، مرقومہ ۵رستمبر ۱۸۸۵ء میں اس بات سے آگاہ کرتے ہیں کہ ''مثنوی نایاب ہو گئی ہے۔ ''گلزارِ داغ'' نہیں ملتا۔ 'آفتابِ داغ'' کا ایک نسخہ سرکار میں آیا، ابھی تک نصیب نہیں ہوا۔'[۷]

داغ، کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ وہ اصلاحِ سخن بھی فرماتے رہے۔ وہ نہ صرف اشعار میں بحور و اوزان کی اصلاح کرتے بلکہ الفاظ کی بحث بھی چھیڑتے اور دلیل کے لیے بڑے شعرا کے کلام سے مثالیں بھی پیش کرتے۔ ذوق اور بہادر شاہ ظفر کے اشعار اس حوالے سے سند کے طور پر ملتے ہیں۔ افتخار عالم کے نام خط میں اُن کے اشعار کی درستی کرتے ہوئے نشان دہی کرتے ہیں کہ لفظ ''پھنسنا'' نون کے بغیر لکھنا چاہیے اور بتاتے ہیں کہ انھوں نے خود بھی لفظ ''پھنسا'' لکھا ہے اور دلیل کے لیے رند کا شعر درج کیا ہے۔[۸]

امیر مینائی کے نام خطوط میں بھی الفاظ کی بحث ملتی ہے۔ ۱۹۰۰ء میں لکھے ایک خط میں بتاتے ہیں کہ لفظ چٹی بہ معنی ڈنڈ یا دستک عین دلی کی زبان ہے۔ احسن مارہروی کے نام خط میں لکھتے ہیں کہ ٹوپی پہننا صحیح ہے۔ ٹوپی اوڑھنا غلط ہے۔ اسی طرح تذکیر و تانیث کے مسائل کی نشان دہی بھی جا بجا ملتی ہے۔

داغ اصلاح کے ساتھ ساتھ شعراء کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے۔ کنور اعتماد علی خاں حسرت کے نام خط، مرقومہ ۱۲راگست ۱۸۸۹ء میں، اُن کی غزلوں کے بے ساختہ پن کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ: ''ان زمینوں میں ایسی بے ساختہ غزلوں نے تو میرا جی چھٹوا دیا۔''[۹]

حسرت بدایونی کے نام خط مرقومہ ۴راکتوبر ۱۸۸۵ء میں، اُن کے اشعار کی اصلاح بھی کی ہے جس میں لفظ کے ساتھ شاعرانہ خیال پر بھی بحث ملتی ہے۔ مثلاً اُن کے ایک شعر میں عاشق محبوب کے آزار سے لطف کشید کرنے کی بات کرتا ہے جس پر داغ

کہتے ہیں کہ ''اس لطف کو میں نہیں سمجھا''۔ اسی طرح ایک شعر پر اصلاح کا انداز ملاحظہ ہو:

''شرماتے ہو کیوں دیکھ کہ مستانہ ادائیں
یہ آنکھ ہے کچھ ساغرِ سرشار نہیں

اس شعر میں کس کی اداؤں کا ذکر ہے۔ عاشق کی ادائیں دیکھ کر معشوق فرماتا ہے اگر اپنی ادائیں دیکھ کر شرماتا ہے تو ''اپنی'' کا لفظ چاہیے یا ''آئینہ'' کا لفظ چاہیے۔ مگر یہ ہو چکا کہ عاشق کی مستانہ ادائیں دیکھ کر شرماتا ہے۔ یہ آنکھ اسی پر دال ہے۔''[۱۰]

داغ کے اپنے خطوط میں جہاں رند، ذوق اور بہادر شاہ ظفر کا ذکر استاد شعرا کے طور پر ملتا ہے۔ داغ کی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے علاوہ نظامی گنجوی، سعدی، حافظ شیرازی، امیر خسرو، درد، شاہ نصیر اور ذوق سے اتنی عقیدت تھی کہ محمد دین فوق کے نام ایک خط میں انھیں اپنی شاگردی میں لیتے ہوئے ابتدا کے طور پر، ان شخصیات کے نام کی نیاز دلانے کا کہتے ہیں، وہیں اپنے ہم عصر شعرا کی تعریف کے ساتھ ساتھ معاصرانہ چشمک بھی نظر آتی ہے۔ امیر مینائی کے نام ایک خط میں وہ ایک طرف تو انھیں ''استادِ مسلم الثبوت'' قرار دیتے ہیں تو دوسری جانب معاصرانہ چشمک واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''i۔ اس زمانے میں اکثر گلدستے نکلتے ہیں۔ تمام ہندوستان کی شاعری معلوم ہوتی جاتی ہے۔ خوشی سے زیادہ افسوس ہوتا ہے۔۔۔

ii۔ یہ بھی خیال رہے کہ جو ذریات لکھنؤ کی یہاں جمع ہیں، مجھ پر چھری تیز کیے ہوئے ہیں۔ یہیں پر کیا منحصر ہے تمام ہندوستان مخالف ہے۔ سنتا ہوں کہ آزاد لکھنوی اور شحنۂ ہند میرٹھ پامال کہ مجھ پر یا میرے شاگردوں پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔ لوگ بغیر اطلاع جواب بھی دے رہے ہیں۔ اعتراض بھی لغو اور جواب بھی لوچ۔ یہ اُمور خلل انداز روزگار اور مانع اعتبار نہیں ہو سکتے۔ نہ ایسے حاسد فروغ پا سکتے ہیں۔ داغ کا سکہ جس دل پر بیٹھا، وہ مٹ نہیں سکتا۔۔۔ داغ کی مشق بڑھی ہوئی ہے۔ مہتاب کو چھپے دو برس کا زمانہ گزرا۔ اس دو برس میں بیس غزلیں کہی ہیں۔ کیا اس کا نام مشق ہے۔''[۱۱]

اسی طرح ایک اور خط میں اپنے معاصر شاعر ترک علی شاہ قلندر کی شاعری اور دہلی کے شاعر پیر ظہیر الدین جو ذوق کے شاگرد تھے، کا ذکر کیا ہے۔ عزیز یار جنگ کے نام ایک خط میں حافظ میر شمس الدین فیض کے مزار پر منعقد ہونے والے ایک مشاعرے کی روداد پیش کی ہے، جس میں معاصرانہ چشمک واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔

''شریف آدمی مفلسی میں بھی آبرو کا خیال رکھتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ان کا نمبر توڑ کر جلیل صاحب کو پڑھوایا گیا اور ان کے آگے سے شمع اٹھالی۔ یہ سب چالاکیاں ترکی صاحب کی تھیں۔ میری غزل جو پڑھی گئی تو ترکی صاحب نے کہا کہ ایک شعر اچھا کہا ہے اور جلیل صاحب کی غزل کی تعریف میں جو وہ کہتے رہے، سننے والوں کو ہنسی آتی تھی۔ داغ مضمون کہنا نہیں جانتا، جلیل مضمون کہنا جانتے ہیں۔ امیر کو تو یہ مجال نہیں ہوئی، جلیل کیا داغ کو مٹا سکتے ہیں۔ میری اصلاحی غزل کو خدا کی شان کہ ترکی صاحب سمجھیں اور نیک و بد بتائیں۔۔۔ ان کو اصلاحی غزل نہ

دکھلا یا کیجیے اور میرے پاس کبھی ان کو نہ بھیجئے۔ میں منافق سے ملنا نہیں چاہتا۔''۱۲؎

اس روداد سے جہاں معاصرانہ چشمک واضح ہوتی ہے وہیں عہدِ داغ میں مشاعروں کی صورتِ حال کا بھی بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔

امیر مینائی کے نام ایک خط مرقومہ ۱۸۹۱ء میں خاقانی پیر شیخ ابراہیم ذوق کے دیوان کے حوالے سے محمد حسین آزاد کا ذکر کیا ہے جس میں ایک طرف تو آزاد پر تنقید کی ہے کہ انھوں نے ذوق کے لیے دیوان میں موجودہ قصائد میں بہت تصرف کیا ہے اور دوسری جانب اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ میری کیا مجال کہ دخل دوں اور اب ہو ہی کیا سکتا ہے۔

خطوط محض دو افراد کے درمیان گفتگو اور حال احوال کا بیان نہیں ہوتا بلکہ یہ ایسی تحریر ہوتی ہے جس میں مکتوب نگار غیر شعوری طور پر اپنی شخصیت کا اظہار کرتا جاتا ہے۔ داغ نے بڑی تعداد میں خطوط لکھے، یہ خطوط سوانحی معلومات دینے کے ساتھ ساتھ شخصی آثار کی پیش کش کا وسیلہ بھی ہیں کیوں کہ بہ قول داغ ''وہ قلم برداشتہ خط لکھتے ہیں''۱۴؎، جن میں اُن کے مزاج، مذہب اور عقیدے سے متعلق معلومات ملتی ہیں۔ داغ کے بے تکلف، دوٹوک اور قلم برداشتہ خط لکھنے کے حوالے سے ڈاکٹر داؤد رہبر لکھتے ہیں:

> ''داغ کے خطوں میں نثر کی لے بھی درشت ہی ہے۔ صاف لگتا ہے کہ عبارت قلم برداشتہ لکھی گئی ہے اور جو کچھ کہنا تھا جلدی جلدی کہہ ڈالا گیا ہے۔ دوستوں، شاگردوں اور طوائفوں کو جو خطوط انھوں نے لکھے، ان میں تو اس طرح کی تحریر مراسم کے عین مناسب ہے ہی مگر نواب پور کے دو نوابوں اور حیدر آباد کے عالی منصب اشخاص کے نام ان کے جو خط ہیں وہ بھی تصنع سے بری ہیں۔''۱۳؎

داغ کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ وہ مذہب سے گہرا لگاؤ اور دل چسپی رکھتے تھے۔ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ محمد حیدر خاں دل کے نام خط میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ روزے رکھ رہا ہوں۔ اسی بات کا ذکر اُنھوں نے مشرف یار خان کے صاحبزادے اور اپنے شاگرد شرف کے نام ایک خط میں بھی کیا ہے۔ امیر مینائی کے نام ایک خط، مرقومہ ۱۶؍ ذیقعد ۱۳۱۸ھ میں اپنے مذہبی لگاؤ کا اعتراف کرتے ہوئے امیر مینائی کے مذہبی معاملات پر اس طرح حقیقت پسندانہ روشنی ڈالتے ہیں:

> ''میرے روزوں کا حال شب بیدار، تہجد گزار، خداشناس جانتے ہیں، آپ نے تو نہ کبھی پڑھی نہ قضا کی۔''۱۵؎

نواب کلب علی خاں، والئی رام پور کے نام خطوط سے بھی اُن کی مذہب سے قربت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک خط مرقومہ، ۳۰؍ مئی ۱۸۸۱ء میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ اپنی خالہ عمدہ بیگم کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ان کے آنے سے ''انھیں بہت تقویت معلوم ہوئی ورنہ نوبت یٰسین پہنچ گئی تھی''۔ اسی خط میں اُنھوں نے حضرت باقی باللہ علیہ کے مزار پر حاضری اور مزار کی صورتِ حال کے بارے میں بھی آگاہ کیا ہے۔ مزار پر حاضر ہو کر داغ نے نواب کلب علی خاں کے لیے دعائے صحت کی۔ مزار کے احاطے میں موجود کنویں کی صورتِ حال سے آگاہ کیا کہ غدر کے زمانے سے اس میں لاشیں پڑی ہیں جس کی وجہ سے پانی کی کمی ہے۔ احاطہ مزار شریف کی دیوار شکستہ ہونے کے سبب جانور درگاہ کے اندر پھرتے ہیں۔ اسی طرح قدم رسول کی چھت خراب ہے لکڑی بالکل گل گئی ہے۔ مزار

اور احاط میں موجود کنویں کی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اصلاح کا تخمینہ بھی لگایا ہے۔ اس خط میں، داغ کا بیان یہ ظاہر کرتا ہے کہ انھیں حضرت باقی باللہ کے مزار سے بے حد عقیدت تھی۔ جہاں اُنھوں نے نذر و نیاز کی اور نواب کلب علی خان کے لیے دعائے صحت بھی کی۔

اپنے ایک شاگرد ابوالحسن پسر نوح ناروی کے نام خط، مرقومہ ۱۳ر ستمبر ۱۹۰۴ء میں اجمیر شریف کی زیارت کا ارادہ بھی اُن کی عقیدت کا اظہار ہے۔ نواب کلب علی خاں کے نام ایک خط، مرقومہ ۳۱ر مئی ۱۸۸۱ء میں، حضرت باقی باللہ کے مزار کی دیوار، احاطہ و مسجد و حجرہ مزار شریف کی مرمت کا تخمینہ بتاتے ہیں اور اس بات کی بھی نشان دہی کرتے ہیں کہ مذہبی حوالے سے دو فرقے آپس میں برسرِ پیکار ہیں۔ ان فرقوں کی صورتِ حال ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> ''ایک فرقہ مقلد اور دوسرا غیر مقلد ہے۔ اہل تقلید نے حضور کو اپنا معاون تصور کیا ہے اور فدوی بھی شریک ہو گیا ہے۔ غیر مقلد کو مدد بھوپال سے کما حقہٗ مل رہی ہے۔ آج مقدمہ پیش ہے۔ شام کو حال مفصل معلوم ہو گا۔ اتنا تو ضرور ہے کہ غیر مقلدوں کو حکم ہوا ہے کہ تم اپنی مسجد اور بناؤ کہ تمہارا مذہب نیا ہے۔ اس میں چکرار ہے ہیں۔''[۱۶]

۱۸ر ستمبر ۱۸۸۵ء میں اجمیر کے ایک شاعر حبیب اللہ کے نام ایک خط میں اپنی بہتریٔ صحت، رفع عسرت، ادائے قرض، ترقی اقبال اور رفع معاندین کے لیے نہا کر عطر لگا کر، آستانۂ غریب نواز پر حاضری دینے اور دعا مانگنے کی تاکید کرتے ہیں۔

داغ کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ ان کے مزاج میں عاجزی، انکساری، قناعت، احسان مندی اور خدمتِ خلق نمایاں تھے۔ تخلیق کاروں کے مزاج میں عام طور پر ایسی بے چینی ہوتی ہے جس کے سبب اُن کے اندر ناقدریٔ زمانہ کی شکایت پیدا ہوتی ہے اس کے برعکس داغ کے مزاج میں اطمینان اور ٹھہراؤ نظر آتا ہے۔ امیر مینائی کے نام خط، مرقومہ ۱۶ر ذی الحجہ ۱۳۰۹ھ میں اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر چہ فنِ شاعری مر چکا ہے اور جتنی قدر کی جا رہی ہے وہ غنیمت ہے۔ امیر مینائی ہی کے نام ایک خط جو ۱۱ر محرم ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء کو لکھا گیا، میں یہ قناعت اور انکساری اتنی نمایاں ہو جاتی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ انھیں اب تک ملا ہے، ان کی لیاقت سے بھی زیادہ ہے۔ یہی عاجزی اور انکساری انھیں احسان مندی کے جذبے سے بھی سرشار کرتی ہے۔ کنور اعتماد علی خاں حسرت، داغ کے دورِ اوّل کے بہت مخلص اور ہمدرد شاگردوں میں سے تھے۔ داغ شاگرد سے زیادہ انھیں اپنا دوست تصور کرتے تھے۔ ان کے دیوان کا نام ''چمنستانِ داغ'' بھی داغ نے دیا۔ داغ سمجھتے تھے کہ اُنھوں نے اس زمانے میں اُن کی مدد کی جب حالات موافق نہ تھے۔ اُن کے ایک خط سے اقتباس ملاحظہ ہو، جس سے اُن کے جذبۂ احسان مندی کا اندازہ پوری طرح لگایا جا سکتا ہے:

> ''میرے دوستوں میں آپ کا خاص مرتبہ ہے۔ آپ نے وقتاً فوقتاً جو میرا خیال رکھا اور مجھے فکروں سے نجات دی اس کی میرے دل میں بڑی قدر ہے۔ آپ کے اس احسان کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ خدا کسی سے سابقہ نہ ڈالے۔ ضرورت اور مدد کے وقت یگانے بیگانے ہو جاتے ہیں۔ جانے پہچانے انجان بن جاتے ہیں۔ آپ نے اس وقت میری دست گیری فرمائی جب کہ میرے دن مجھے موافق نہ تھے۔''[۱۷]

خدمتِ خلق کا جذبہ بھی داغ کے مزاج کا حصہ تھا۔ ضلع گورداس پور کی ریاست کشن کوٹ کے رئیس ہرکش بہادر بیدار کے نام ایک خط، مرقومہ ۹ر فروری ۱۸۸۶ء میں اپنے ایک دوست حکیم خورشید حسن کی سفارش کی اور انھیں لکھا کہ وہ بہت اچھے طبیب ہیں اور

معاش کی تلاش میں ہیں۔لہٰذا اُن کو کچھ سہارا دے دیں۔داغ کے مزاج کی یہی نرمی تھی کہ وہ مہمانوں کی میز بانی میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔نوح ناروی، داغ کے شاگردوں میں سے تھے اور ضلع الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ کچھ عرصہ حیدر آباد، داغ کے پاس رہے۔داغ نے ان کی خوب میز بانی کی اور اُن کی کم خوری پر اپنی تشویش کا اظہار اُن کے بیٹے ابوالحسن ناروی کے نام ایک خط مرقومہ ۱۳ر ستمبر ۱۹۰۴ء میں ان الفاظ میں کیا:

''ایک بات سے سخت حیرت ہے کہ وہ اپنی اشتہا وہاں فروخت کر آئے ہیں یا گروی کر آئے ہیں یا خیرات۔ میں نے جو امتحان کیا تو مینا سے بھی وہ کم کھاتے ہیں۔نہیں معلوم کہ میرے گھر کا کھانا انھیں پسند نہیں آتا یا بھوک ہی گھٹ گئی ہے یا نارہ والے سب اتنا ہی کھاتے ہیں۔اگر یہ کہتا ہوں کہ کچھ فرمائش کرو تو وہ نہیں سنتے۔تم صاف صاف لکھو وہاں ان کو کون سا کھانا پسند تھا۔کون سی چیز مرغوب تھی۔ یہاں بھی وہی پکوایا جائے۔نمکین کون سا کھانا پسند ہے اور شیریں کون سا۔''[۱۸]

لطف یہ ہے کہ اسی خط میں اختتام پر وہ نارہ آنے کے ارادے سے تو مطلع کرتے ہیں مگر اُن سے ملاقات کے فوراً بعد واپسی کا ارادہ بھی ظاہر کرتے ہیں اس لیے کہ انھیں خیال یہ رہتا ہے کہ اُس کے ساتھ سات آٹھ آدمی ہوں گے اور خاطر تواضع میں اُن پر مالی بوجھ پڑے گا۔

داغ کے خطوط کی زبان انتہائی سادہ، سلیس، رواں، فصیح اور شگفتہ ہے۔ بے تکلف دوستوں کے ساتھ شگفتہ انداز میں بات کرتے ہیں۔امیر مینائی کے نام خطوط میں یہ بے تکلفی بہت نمایاں ہے۔محمد الدین فوق لکھتے ہیں کہ: لاہور کے مشہور جرنلسٹ اور داغ کے شاگرد تھے۔''پنجۂ فولاد'' کے نام سے ایک اخبار نکالتے تھے۔اخبار کے نام کی بابت، بے تکلفی اور خوش طبعی کی ملی جلی فضا فوق کے نام ایک خط، مرقومہ ۳۱ر مئی ۱۹۰۲ء میں نظر آتی ہے:

''نہیں معلوم کس مناسبت سے اخبار کا نام آپ نے ''پنجۂ فولاد'' رکھا ہے۔گزشتہ محرم میں مجھے سلام کرنے ایک طوائف آئی تھی۔نام پوچھا تو بولی۔ مجھے ''فولاد جان'' کہتے ہیں۔میں نے پوچھا تم میں کیا کیا جوہر ہیں۔اس نے مرثیہ کے بند سنائے۔میں نے اسے رخصت کر دیا لیکن آج معلوم ہوا کہ ''پنجۂ فولاد'' فولاد جان کا نر ہے۔''[۱۹]

داغ کے وہ خطوط جو اُنھوں نے نوابوں، امراء یا تلامذہ کو لکھے، وہ کسی قدر پرتکلف اور سادہ ہیں مگر نجی اور خانگی نوعیت کے خطوط میں اُن کے اخلاق، کردار، مذہب، مروت اور خودداری کے نمونے واضح ہیں۔ یہ خطوط اُن کی شرافت، انسان دوستی اور اخلاص کے آئینہ دار ہیں۔ان کے علاوہ وہ خطوط جو داغ نے خواتین کے نام لکھے، وہ ان کی شخصیت کا بالکل منفرد تعارف ہیں۔ان خطوط میں داغ کا اسلوب شاعرانہ اور بے باک ہے۔ان خواتین میں بنی جان، ملکہ جان، حمیدن بائی اور منی بائی حجاب شامل ہیں۔ یہ خطوط نہیں، ان کے دل کے ٹکڑے ہیں۔داغ بنیادی طور پر عاشقانہ مزاج اور حسن پرست واقع ہوئے تھے۔ملکہ جان کے نام خط، مرقومہ ۱۳/ مارچ ۱۸۸۶ء میں لکھتے ہیں کہ:

''کہوں جی! خدا نے مجھے کیوں عاشق مزاج بنایا، اس بلا میں کیوں پھنسایا، پتھر کا دل، لوہے کا کلیجہ کیوں نہ

بنایا، جس میں کوئی اچھی ادا دیکھی، طبیعت لوٹ گئی۔ خصوصاً کوئی معشوق خواندہ ہو اور شعر گو بھی ہو۔ مرزا داغ کی موت ہے۔''[۲۰]

چنانچہ خوب صورتی اور شعر گوئی، داغ کی کمزوری تھی۔ بنی جان، الہ آباد کی طوائف تھی۔ جس سے داغ کی کبھی ملاقات تو نہ ہوئی مگر نوح صاحب ناروی جب حیدر آباد تشریف لائے تو اس کی تصویر داغ کے لیے لائے۔ نوح ناروی جب بھی اپنے استاد کی قدم بوسی کے لیے حیدر آباد تشریف لے جاتے تو استاد کے لیے تحفے میں ایک طوائف کی تصویر لے جاتے تھے۔[۲۱] تصویر دیکھ کر اور سیرت کی خوبیاں سن کر داغ، خط لکھنے میں پہل کرنے سے نہ رہ پاتے۔ مذکورہ بالا خط، مرقومہ ۲۳/ جنوری ۱۹۰۲ء سے ان کی ملاقات کے لیے بے تابی کا نقشہ ملاحظہ ہو:

''کیوں جی تم سے کیوں کر ملیں۔ تم کو کیوں کر دیکھیں۔ کیوں کر سنیں اور نہ دیکھیں تو کیوں کر جئیں۔''[۲۲]

اس خط میں بھی وہ اپنے عاشق مزاج اور حسن پرست ہونے کا اعتراف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: ''جو شخص ازلی عاشق مزاج ہو، خیال کرو اس کا کیا حال ہوگا'' بنی جان کی تصویر کی شان میں اُنھوں نے جو رُباعی لکھی وہ ملاحظہ ہو:

کیا بات ہے کیا گھات ہے اللہ رے شریر	سوجھی ہے نئی طرح کی تجھ کو تدبیر
کب دیکھنے والوں پہ کھلا دل کا حال	کھنچوائی ہے کیا سینہ چھپا کر تصویر [۲۳]

سید قطب الدین اشک جلیسری کے نام ایک خط مرقومہ ۱۲/ ستمبر ۱۸۹۹ء میں بھی وہ جلیسر کی کسی کافر ادا طوائف کے کوائف سن کر اس سے ملنے اور تصویر دیکھنے کے لیے بے تابی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں بھی اُن کی تحریر میں رنگینی اور بے باکی نمایاں ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اگر آپ سے ہو سکے تو اس فسوں گر کا فوٹو اُتروایئے اور مجھے بھیجیے وہ کس رئیس سے متعلق ہے یہ آپ نے نہ لکھا۔ میں اس کافر ادا کے تفصیلی حالات کا جویا ہوں۔ آپ ضرور لکھیں۔ آپ نے جو سراپا کھینچا ہے دل میں اس نے عجب شوق پیدا کر دیا ہے۔ حسن و جمال اور موسیقی میں بے مثال بہت کم ملتے ہیں۔ ایسی صورتیں شہروں میں تو ممکن ہیں آپ نے تو ایک گاؤں سا کن لکھا ہے۔ آخر وہاں رہ کر یہ خوبیاں کیوں کر پیدا ہوئیں۔ مفصل لکھیں تو پتہ چلے۔''[۲۴]

ملکہ جان کے نام دو خطوط ملتے ہیں۔ ایک خط ۱۲/ مارچ ۱۸۸۶ء جب کہ دوسرا ۱۹/ اگست ۱۸۸۶ء میں لکھا گیا۔ ''ملکہ جان، کلکتہ کی مشہور طوائف تھی اور صاحبِ دیوان تھی۔ یہ دیوان ''مخزن الفت ملکہ'' کے نام سے چھپا۔ انگریزوں سے تعلقات کی بنیاد پر ''میم صاحب'' کے نام سے بھی مشہور تھی۔ داغ سے اُن کے مراسم میر قطب الدین اشک کے ذریعے ہوئے اور ان دو خطوط کے وسیلے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے درمیان خط و کتابت رہتی تھی۔ داغ نے ان خطوط میں منی بائی حجاب سے اپنی قلبی وابستگی اور بے تابی سے آگاہ کیا ہے۔ اہم بات یہ کہ اس بات کی نشان دہی بھی ہوتی ہے کہ جب منی بائی حجاب کو داغ اور ملکہ جان کے مابین خط کتابت کا علم ہوا تو انھوں نے داغ کے نام ایک طویل عتاب نامہ بھیجا۔ ان خطوط کی خاص بات وہ القاب و آداب ہیں جن سے داغ نے ملکہ جان کو مخاطب کیا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ ملکہ اقلیم سخن وری، بنارس کی صنم،کلکتہ کی پری! دام جما لہا و کمالہا

۲۔ دل رُبا، سخن آرا، حور لقا، پری ادا، دام جمالہا و کمالہا

حمیدن بائی کے نام تین خطوط ملتے ہیں ۔ایک خط ۵/ستمبر ۱۸۸۵ء کولکھا گیا جب کہ باقی دوخطوط پر تاریخ درج نہیں۔ ''حمیدن بائی، منی بائی حجاب کی چھوٹی بہن تھیں۔شاعرہ تھیں اورنقاب تخلص کرتی تھیں''۲۵؎ان خطوط میں داغ نے منی بائی حجاب کے ساتھ تعلق خاطر کے حوالے سے گلے شکوے کیے ہیں۔

داغ کے مکاتیب کا اہم حوالہ وہ خطوط ہیں جوانھوں نے منی بائی حجاب کے نام لکھے ہیں۔منی بائی حجاب کلکتے کی ایک طوائف تھیں جوشاعری بھی کرتی تھی اورتخلص حجاب تھا۔رام پور میں منعقد ہونے والے''میلہ ٔ بےنظیر''میں داغ کی پہلی ملاقات منی بائی حجاب سے ہوئی۔داغ، حجاب پرفریفتہ ہوگئے اوردونوں کے درمیان تعلق بڑھنے لگا مگرمنی بائی حجاب کے کچھ اورقدردان بھی پیدا ہوگئے جس کے سبب داغ رقابت کے جذبات سے دوچار ہوئے۔۱۸۶۵ء سے۱۸۸۲ء کے درمیان یہ تعلق خاطر قائم رہا۔داغ کی مثنوی ''فریادِ داغ''اسی عشق کی داستان ہے۔۱۸۸۲ء میں جب داغ نے چندروز کلکتے قیام کیا تو یہ محبت سرد پڑ گئی اورمحض خط وکتابت تک محدود رہ گئی۔۱۹۰۱ء میں اس محبت نے دوبارہ جوش کھایا اور۱۹۰۲ء میں منی بائی حیدرآباد تشریف لائیں اوردوتین برس رہیں۔مگراب ان کے تعلق میں وہ گرم جوشی نہ رہی اور۱۹۰۴ء میں منی بائی واپس کلکتہ چلی گئیں۔اس سب کے باوجود داغ کے دل ودماغ پرمنی بائی حجاب کا عکس کبھی دھندلا نہ ہو پایا۔۲۶؎منی بائی حجاب کے نام ان خطوط میں سے بیشتر پرتاریخ درج نہیں البتہ چندخطوط پرتاریخ لکھی ہے۔یہ خطوط داغ کی منی بائی حجاب کے لیےمحبت، بےتابی، تنہائی، رقابت اورشکایتوں سے بھرپور ہیں۔باقی خواتین کے نام لکھے گئے۔خطوط میں داغ کی حسن پرستی غالب ہے جب کہ ان خطوط میں داغ کے مزاج کا جذباتی پہلونمایاں ہے جو بیک وقت محبت، رقابت اور شکایتوں سے پُر ہے۔جابجا اپنی جذباتی کیفیات کی عکاسی کے لیےاشعار کا استعمال ملتا ہے۔ان خطوط میں مکتوب الیہ کوجذباتی کیفیت کے مطابق انتہائی سادگی سےمخاطب کیا گیاہے۔ان خطوط میں القاب وآداب کا استعمال یہ ہے:

(i) دشمن جانی!سلام شوق!

(ii) ستم گروستم پیشہ!

(iii) بائی جی!سلام شوق!

(iv) بےمہروبےوفا!

(v) دل دارودل نواز!

(vi) جنابِ من!

(vii) نیک بخت، پاک دامن، بےلوث منی بائی صاحبہ حجاب!

(viii) میزبان داغ مہماں سلامت رہو

(ix) منی جان، تمھیں اللہ کی امان!

(x) مہربان داغ قدردان داغ، سلامت رہو

مذکورہ ان خطوط سے پتا چلتا ہے کہ داغ کو منی بائی حجاب کے خط کا بے تابی سے انتظار رہتا تھا اور جب ان کا نامہ موصول ہوتا تو کئی بار پڑھتے، آنکھوں سے لگاتے، چومتے اور چھاتی پر دھرتے۔ منی بائی حجاب سے دوری پر تڑپ تڑپ جاتے۔ ۵ر ستمبر ۱۸۸۰ء کے خط سے اقتباس ملاحظہ ہو، جو ان کی قلبی کیفیت کا واضح عکس ہے:

> ''غضب تو یہ ہے کہ دور بیٹھی ہو، پاس ہوتیں تو سیر ہوتی۔ کبھی تمھارے گرد گھومتا اور شعلۂ جوالا بن جاتا، کبھی تمھیں شمع قرار دیتا اور پتنگا بن کر قربان ہو جاتا۔ کبھی بلائیں لیتا اور کبھی صدقے قربان ہو جاتا۔۔۔۔ میں تمھارے لیے بلبلا رہا ہوں۔ یہ خوفناک کالی کالی راتیں اور تنہائی کیا کہوں۔ کیوں کر تڑپ تڑپ کر صبح کی صورت دیکھتا ہوں۔ یقین جانو ایسا تڑپتا ہوں جیسے بلبل قفس میں۔'' ۲۷

داغ، منی بائی حجاب کے عشق میں شدت سے مبتلا تھے یہی وجہ ہے کہ جب وہ منی بائی حجاب کے قدردانوں کے بارے میں جانتے تھے تو ''ان کے جسم میں خون ہانڈی کی طرح پکنے لگتا''۔ رقابت کے جذبات کے تحت لکھے جانے والے خطوط میں طنز و تعریض کے ساتھ ساتھ محبت کا جذبہ بھی غالب ہے۔ درج ذیل خط سے اقتباس دیکھیے جو محبت اور طنز کے ملے جلے جذبات سے عبارت ہے:

> ''ستم گر و ستم پیشہ! تم دو روز سے نواب صاحب (نواب حیدر علی خاں) کے یہاں تھیں۔ یہاں دل پر عجیب عالم گزر گیا۔ میں نہیں مانوں گا کہ تم مجبور ہو گئیں۔ اس ریاست میں ایسی بھی خدا کی بندیاں موجود ہیں کہ رئیس کے ہزار دباؤ پر بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتیں جن سے وفاداری کا عہد کر چکی ہیں، اپنے قول پر قائم ہیں۔ ایک طرف دولت ہے، ریاست ہے اور ہر طرح کی شان و شوکت لیکن محبت کا نام وہاں عنقا رکھا گیا ہے۔ تمھارا دل دادہ ان کے مقابلے میں کوئی خوبی نہیں رکھتا مگر تمھاری الفت میں جان سے ضرور گزر سکتا ہے۔ کیا میرے رقیب بھی ایسا کر سکتے ہیں؟'' ۲۸

رقابت کے یہی جذبات، ایک خط میں انتہائی شدت اختیار کر جاتے ہیں اور داغ کی زبان میں سختی اور درشتی واضح دیکھی جا سکتی ہے:

> ''تم یقیناً یزید کی معشوق بنتیں۔ میرے جسم میں خون ہانڈی کی طرح پک رہا ہے۔ تمھیں یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب شکرے مل کر نوچا کھسوٹا کریں۔ آخر یہ کیا سر میں سمائی ہے۔ کون جانے اس کا کیا انجام ہو۔ یہی لیل و نہار ہیں تو داغ کا سلام قبول ہو۔ دل پر جبر کی سِل رکھوں گا مگر تمھارا نام نہ لوں گا آخر بے حیائی کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔'' ۲۹

پروفیسر عتیق احمد صدیقی، داغ کے خطوط میں اس صاف گوئی اور بے باکی کو موضوعِ بحث بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اُنھوں نے ان خطوط کے ذریعے اپنی کمزوریوں پر کوئی پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ مصنوعی نقاب اوڑھے، نہ اپنی ذات کے گرد کوئی ہالہ بنایا۔ نہ ذاتی کوائف کو آفاقی رشتوں میں منسلک کیا بلکہ صرف حسبِ ضرورت خط

لکھے جن میں یا تو معاملات کا مختصر اور صاف بیان ہے یا دل پر گزرنے والی واردات کا ذکر۔''[۳۰]

داغ کے وہ خطوط جن میں اُنھوں نے منی بائی حجاب کے ساتھ غم و غصے کا اظہار کیا ہے وہاں مکتوب نگار کے طور پر محض ''داغ دہلوی'' یا ''بدنصیب داغ'' لکھا ہے۔ دراصل اُنھوں نے اپنے خطوط میں کسی جذبے کو خفیہ رکھنے کی بجائے کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ ڈاکٹر سید محمد علی زیدی، مکاتیب داغ کا اِن الفاظ میں محاکمہ کرتے ہیں:

درج بالا مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ خطوط چوں کہ کسی بھی شخصیت کی نجی اور ذاتی تحریر ہوتے ہیں، لہٰذا ان خطوط کو بروئے کار لائے بغیر کسی بھی شخصیت کی سوانح اور شخصیت کا بے لاگ تجزیہ ممکن نہیں۔ داغ کے یہ خطوط محض پر تکلف نوابوں، امراء، دوستوں اور شاگردوں کے نام نہیں بلکہ خالصتاً ذاتی نوعیت کے بھی ہیں۔ ان خطوط سے، داغ بہ حیثیتِ اُستاد، دوست اور شخص واضح طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ طوائفوں کے نام لکھے گئے خطوط میں اُن کی شخصیت کا شوخ، جذباتی اور بے باک پہلو سامنے آتا ہے۔ ان خطوط میں نہ صرف داغ کی سوانح اور تصانیف سے متعلق معلومات ملتی ہیں بلکہ اُن کی شخصیت کا اظہار بھی ملتا ہے جس کے بغیر داغ کی بے لاگ تفہیم ناممکن ہے۔

حواشی:

۱۔ داغ کے خطوط کا پہلا مجموعہ ''انشائے داغ'' کے نام سے انجمن ترقی اُردو ہند سے ۱۹۴۱ء میں، ان کے شاگرد احسن مارہروی نے مرتب کیا جو کل پینسٹھ (۶۵) خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ تین فصلوں میں منقسم ہے۔ پہلی فصل میں والیانِ ریاست، حکام، عمال اور امرا کے نام؛ فصل دوم میں اعزہ، خاص احبا اور عام شناساء و تلامذہ کے نام اور فصل سوم میں بسلسلۂ شاعری شاگردوں کے نام خطوط شامل ہیں۔ داغ کے خطوط کا دوسرا مجموعہ 'زبانِ داغ' ہے جسے احسن مارہروی کے بیٹے سید رفیق مارہروی نے ۱۹۵۶ء میں مرتب کیا اور نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع کیا۔ دوسو اکانوے (۲۹۱) صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں کل دوسو اڑتیس (۲۳۸) خطوط شامل ہیں۔ اس مجموعے میں ماقبل شائع ہونے والے مجموعے ''انشائے داغ'' میں شامل خطوط بھی شامل ہیں۔

ان مجموعوں کی اشاعت کے بعد بھی چند خطوط رسائل میں شائع ہوئے جو ان کے ماقبل شائع ہونے والے مجموعوں میں شامل نہیں۔ ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

i۔ ''نقوش'' کے ''مکاتیب نمبر''، شمارہ ۶۵/۶۵، نومبر ۱۹۵۷ء میں، ص ۳۱۵ تا ۳۱۶ پر چار (۴) خطوط شائع ہوئے۔ یہ چاروں خطوط داغ نے نواب نامدار کے نام لکھے تھے۔

ii۔ نقوش کے ''خطوط نمبر''، شمارہ: ۱۰۹، اپریل/مئی ۱۹۶۸ء میں، ص ۱۳۰ تا ۱۳۱ پر داغ کے چار خطوط شائع ہوئے جن میں دو خطوط بنام نواب حسن علی خاں امیر جاگیر دار کے نام اور دو خطوط لقمان الدولہ دل کے نام ہیں۔

۲۔ رشید حسن خان، مکاتیب داغ مشمولہ داغ دہلوی، مرتب: شاہد ماہلی، نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۰۱ء، ص ۱۰۔

۳۔ مرزا داغ دہلوی، زبانِ داغ، مرتبہ: سید رفیق مارہروی، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۵۶ء، ص: ۶-۷۔

۴۔ ایضاً، ص ۲۶۹۔

۵۔ ایضاً، ص ۱۲۵۔

۶۔ ایضاً، ص ۱۵۴۔

۷۔ ایضاً، ص ۱۹۷۔

۸۔ ایضاً، ص ۱۰۵۔

۹۔ ایضاً، ص ۱۷۳۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۰۰۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۲۴۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۲۶۔

۱۳۔ ڈاکٹر داؤد رہبر، مشاعرے کا فاتح: نواب مرزا داغ، کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۱۹۹۹ء، ص: ۱۲۲۔
۱۴۔ مرزا داغ دہلوی، زبانِ داغ، مرتبہ: سید رفیق مارہروی، ص: ۲۶۹۔
۱۵۔ ایضاً، ص ۱۱۸۔
۱۶۔ ایضاً، ص ۲۴۵۔
۱۷۔ ایضاً، ص ۱۷۹۔
۱۸۔ مرزا داغ دہلوی، انشائے داغ، مرتبہ: علی احسن مارہروی، دہلی: انجمن ترقی اُردو، ۱۹۴۱ء، ص: ۸۳۔
۱۹۔ ایضاً، ص ۱۲۱۔
۲۰۔ مرزا داغ دہلوی، زبانِ داغ، مرتبہ: سید رفیق مارہروی، ص ۲۶۷۔۲۶۶۔
۲۱۔ سید رفیق مارہروی، مرتب: زبانِ داغ، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۵۶ء، ص: ۱۴۷۔
۲۲۔ مرزا داغ دہلوی، زبانِ داغ، ص ۱۴۷۔
۲۳۔ ایضاً، ص: ۱۴۸۔
۲۴۔ ایضاً، ص: ۱۱۲۔
۲۵۔ سید رفیق مارہروی، مرتب: زبان داغ، ص: ۱۹۴۔
۲۶۔ ایضاً، ص ۱۸۱۔
۲۷۔ مرزا داغ دہلوی، زبانِ داغ، ص: ۱۸۴۔
۲۸۔ ایضاً، ص: ۱۸۳۔
۲۹۔ ایضاً، ص: ۱۸۵۔
۳۰۔ عتیق احمد صدیقی، مکاتیبِ داغ، مشمولہ داغ دہلوی: حیات اور کارنامے، مرتب: ڈاکٹر کامل قریشی، دہلی: اُردو اکادمی، ۱۹۹۷ء (اشاعتِ دوم)، ص: ۱۵۵۔
۳۱۔ ڈاکٹر سید محمد علی زیدی، مطالعۂ داغ، لکھنؤ: کتاب نگر، ۱۹۷۴ء، ص: ۲۹۲، ۲۹۳۔

فہرستِ اسنادِ محوّلہ:

۱۔ اقبال، جاوید، سید، ڈاکٹر (مرتب): ۲۰۱۵ء، ''خط نگاری: مباحث، روایت اور اہمیت''، قصر الادب، حیدر آباد۔
۲۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر: ۲۰۱۲ء، ''تاریخ ادب اردو''، (جلد چہارم)، مجلس ترقی ادب لاہور۔
۳۔ رہبر، داؤد، ڈاکٹر: ۱۹۹۹ء، ''مشاعرے کا فاتح: نواب مرزا داغ''، انجمن ترقی اردو کراچی۔
۴۔ زیدی، محمد علی، سید، ڈاکٹر: ۱۹۷۴ء، ''مطالعہ داغ''، کتاب نگر لکھنؤ۔
۵۔ قریشی، کامل، ڈاکٹر: ۱۹۹۷ء، ''داغ دہلوی: حیات اور کارنامے''، اشاعت دوم، اردو اکادمی دہلی۔
۶۔ مارہروی، رفیق، سید، (مرتب): ۱۹۵۶ء، ''زبان داغ''، نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔
۷۔ مارہروی احسن: ۱۹۴۱ء، (مرتب) ''انشائے داغ''، انجمن ترقی اردو دہلی۔
۸۔ ماہلی، شاہد، (مرتب): ۲۰۰۱ء، ''داغ دہلوی''، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی۔
۹۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر: ۱۹۹۶ء، ''داغ دہلوی''، (کتابیات)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

رسائل

۱۔ ''نقوش''، نومبر ۱۹۵۷ء، مکاتیب نمبر، شمارہ ۶۵، ۶۶، لاہور۔
۲۔ ''نقوش''، اپریل، مئی ۱۹۶۸ء، خطوط نمبر، شمارہ: ۱۰۹، لاہور۔

ABSTRACTS

Qaimkhani Dialect: its linguistic, syntexitcal and morphological characteristics.

Karm Chand the son of Mote Rao Chauhan Prince of Dadrera, accepted Islam during the reign of Feroz Shah Tughlique and was named Kaimkhan . Later on his descendents and boli (dialect) inherited this term. Qaim Khani boli is sub dialect of Rajistani languages. Actually we cannot fixed its relation with one language, it is very close to Marwari language; and is also called sub dialect of the Marwari language. Qaim Khani language has no separate alphabets. it is written in Urdu in Pakistan whereas in India it is written in Devnagri letters. The dialect has absorbed words from other dialects or languages that has enriched its vocabulary.

ساجدہ پروین

’’قائم خانی بولی: لسانی، حرفی اورنحوی خصوصیات‘‘

(۱)

زبان، انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور انسان کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ہی زبان کا وجود بھی عمل میں آیا۔اس سے پہلے یقیناً اشاروں اور حرکات سے اپنی ضرورت اور احساس کا اظہار کیا گیا ہوگا۔ چوں کہ زبان فطرت کا ایک عطیہ ہے اور اس کا تمام تر دارومدار انسان کی قوت گویائی پر ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں: ’’زبان مقررہ صوتی علامات کا ایک ایسا مواصلاتی نظام ہے جس کی مدد سے کسی سماج کے افراد آپس میں مل جل کر کام کرتے ہیں‘‘ [۱]

زبان اپنے ملک، ماحول اور سماج کی علامت ہوتی ہے اسی لیے ہر زبان انسانی معاشرے میں ہی زندہ رہتی اور نشوونما پاتی ہے۔علم اللسان یا لسانیات کا اہم موضوع ’’زبان‘‘ ہے۔جیسے کہ ان زبانوں کی پیدائش اور ارتقاء کیسے ہوا؟. جو بولی ہم استعمال کرتے ہیں اس کی اصل کیا ہے؟.وہ کن دوسری زبانوں اور بولیوں سے ملتی جلتی ہے؟[۲] اُس کی مزید علاقائی تحتی بولیاں (Regional Dialect) کون سی ہیں؟.اور وہ خود کس زبان کی ذیلی بولی (sub+dialect) کی ایک شکل ہے؟۔چناں چہ اصلی اور نسلی اعتبار سے لسانی سرمائے کا جائزہ لیا جائے تو قائم خانی بولی کا مولد اور موجودہ وطن برصغیر پاک و ہند کی سرزمین ہے اس سلسلے میں تفصیل جاننے کے لیے ہندوستان کی زبانوں کے متعلق پروفیسر سید احتشام حسین ہندوستان کے قدیم باشندوں اور ان کی زبانوں کی بابت معلومات فراہم

کرتے ہیں۔ ۳ اور اب تک جو آثار دستیاب ہوئے ہیں ان میں ابتدائی حجری تہذیب کے علم بردار "نگریٹو" (Negrito) حبشی نسل کے لوگ کا سب سے پہلے سندھ میں آباد ہونے کے آثار، دوسری قوم جس کے ہندوستان میں آنے کا سراغ ملتا ہے انھیں "آسٹرک" (Austric) کہا جاتا ہے ۴ اور غالباً آریوں کے آنے سے قبل وہ دراوڑں کے ساتھ مل کر ترقی کرتے رہے۔ آسٹرک قبائل کی ہندوستان میں آمد اندازاً پانچ ہزار قبل مسیح سے پہلے کی لگائی جاتی ہے۔ ۵ تاریخ فرشتہ میں ہندوستان کی قدامت کے متعلق ابوقاسم فرشتہ لکھتے ہیں کہ :

"بیٹا ارشد ۶ کا حام کہ ہندنام رکھتا تھا، "ملک ہند" اس کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا بھائی سند ۔۔۔۔۔۔۔

"ملک سند" میں فروکش ہوا، شہر ٹھٹھہ اور ملتان اپنے فرزندوں کے نام پر بنا گیا ۔" ۷

ان کی رائے کے مطابق ہندوستان کے مختلف حصوں کے جو نام ہیں انھیں بھی حضرت نوحؑ کی اولاد کے ناموں سے منسوب کیا ہے۔ ہندوستان میں آنے والوں کا تیسرا بڑا گروہ دراوڑ نسل کے لوگوں کا ہے۔ یہ بھی بحیرۂ روم ہی کی طرف سے آئے اور ابتدا میں وادیِ سندھ میں بسے پھر آہستہ آہستہ پھیلتے پھیلتے ملک کے دوسرے حصوں میں آباد ہوتے چلے گئے خاص کر شمالی حصوں میں ان کی بڑی آبادی کے آثار ملتے ہیں۔ ۸ آریاؤں سے پہلے یہی ایک نسل ہے جس کا لسانی ورثہ ایک خاندان السنہ کی حیثیت سے ہندوستان میں موجود ہے آریوں کی آمد کے وقت ہندوستان کے باقی حصے جہالت کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے صرف سندھ ہی وہ علاقہ تھا جہاں تہذیب وتمدن کی روشنی تھی۔ اس طرح سندھ اور سندھی بولی کی قدامت کا بھی پتا چلتا ہے۔

جیسا کہ محترم سراج الحق میمن اپنے مقالے میں سندھی بولی میں قدیم تہذیب کی نشانیوں کی بابت لکھتے ہیں: "سندھی اگر سنسکرت کے لفظوں کی مرہون منت ہے، تو سنسکرت تو سندھی کی اس سے زیادہ قرض دار ہے" ۹

سراج الحق میمن کے نظریے کے مطابق برصغیر پاک و ہند کے خطے کی قدیم تہذیب اور بولیوں کی بنیاد سندھ کا علاقہ ہے. جب کہ مولانا سید سلیمان ندوی ہندوستان کی قدیم بولیوں کی تلاش کی بابت رقم طراز ہیں کہ:

"ہندوستان کے اصلی رہنے والے دراوڑی اور ہندوستان کی اصل زبانیں ٹامل، تلگو اور کنڑی وغیرہ دراوڑی زبانیں ہیں، سنسکرت اور پرانی ہندی خود باہر کی زبانیں ہیں جن کا اس ملک سے چند ہزار برس سے زیادہ کا تعلق نہیں آریا جو زبان بولتے ہوئے اس ملک میں آئے، معلوم نہیں وہ اس کو کب تک بولتے رہے، بہرحال اس میں میل ہوا اور اس سے اتر کر ایک دوسری زبان کا خاکہ تیار ہوا، جو ذرا ذرا سے فرق سے ہر صوبے میں الگ الگ ہو گئی۔ ۱۰

اس سے پتا چلتا ہے کہ آریاؤں سے پہلے جنوبی ہند میں چار بڑی زبانیں خاندان السنہ کی حیثیت سے موجود تھیں یہ تامل، تلگو، کنٹری اور ملیالم ہیں. آریاؤں کا اثر ہندوستان کی زبان کے ساتھ ساتھ اس کی تہذیب وتمدن پر بھی بہت گہرا پڑا مگر پھر اس کے بعد آریا بھی اپنی زبان کو دراوڑی اثرات سے محفوظ نہیں رکھ پائے یہی وجہ ہے کہ ہند آریائی زبانیں سنسکرت سمیت دراوڑی زبانوں سے

متاثر ہیں۔[11]

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب، آریاؤں کے بعد ایرانی، یونانی ترکی اور دراوڑی کے سیاسی ولسانی اثرات کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ:

''جس طرح سے ''دارا'' کی فتوحات سے'' قدیم ایرانی زبان'' کا راستہ ہموار ہوا اسی طرح ''عظیم فاتح'' سکندر'' کی فتوحات نے ''یونانی زبان'' کے اثرات کا کا دروازہ کھولا، اور اس نے اپنے لسانی اثرات مرتب کیے۔ پھر اسی طرح ''ساکا'' اور ''ستھین'' کی وجہ سے ترکی اور داردی زبانوں کو پھیلنے میں مدد ملی ،کوشاں شاہ کنشک کے دور میں پالی پراکرت کو اثر انداز ہونے کا موقع ملا اور پارتھیوں کے حملوں نے بھی ترکی اور داردی زبانوں کو اثر انداز ہونے کا موقع دیا۔'' [12]

قانونِ ارتقا کے تحت جس طرح ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں داخل ہو کر اس کا حصہ بن جاتے ہیں. بالکل اسی طرح دراوڑی زبانوں کے الفاظ تہذیبی اور تمدنی ضرورتوں کے مطابق آریائی زبانوں نے بلا شبہ قبول تو کر لیے مگر ان کی صرفی ونحوی خصوصیات اور باقی زبان کے اصل ڈھانچے میں ان خارجی اثرات کی وجہ سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ دیکھا جائے تو آریا قبائل کی زبانوں کے لسانی اعتبار سے تین ادوار اہم ہیں .

۱۔ سنسکرت اور اس کی ہم عصر بولیوں کا دور

۲۔ پراکرتوں کا دور

۳۔ اپ بھرنشوں کا دور

آریا نسل کے قبائل کا ہندوستان میں داخلہ ہماری لسانی تاریخ میں بہت اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس سے برصغیر پاک و ہند کی زبانوں اور بولیوں پر گہرے اثرات مرتب ہوئے ڈاکٹر محی الدین قادری زور بھی اپنی تصنیف ''ہندوستانی لسانیات'' میں برصغیر پاک و ہند کے طول وعرض میں بولی جانے والی چھوٹی بڑی سو زبانوں میں سے پانچ سات کو چھوڑ کر باقی تمام کا تعلق آریائی خاندان سے ہی بتاتے ہیں۔[13] ڈاکٹر گیان چند جین، سنسکرت کو ہندوستان کی قدیم ترین زبان اور آریاؤں کی زبان بتاتے ہیں کہ وہ تقریباً ۱۵۰۰ء ق م (پندرہ سو قبل مسیح) تک ہندوستان کی سرحدوں میں داخل ہو چکے تھے .اور یہاں کے مقامی باشندوں کول، بھیل[14] اور دراوڑ ں کو زیر کرتے ہوئے آگے مشرق اور وسط ہند کی جانب پیش قدمی کر چکے تھے۔[15] مسلمانوں کی آمد ہندوستان کی تاریخ میں نسلی ولسانی اعتبار سے ایک نئے عہد کا آغاز کرتی ہے جدید آریائی زبانوں کا ظہور ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا رہین منت ہے اگر چہ مسلمان ہندوستان میں نہ بھی آتے تو بھی ان زبانوں میں تغیر وتبدل لازمی تھا مگر پھر شاید ان کا روپ مختلف ہوتا، کیوں کہ زبانیں تو اپنے فطری ارتقاء کا سفر جاری رکھتی ہیں۔ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد یوں تو برصغیر کی سبھی زبانوں نے عربی و فارسی کے اثرات قبول

کیے۔مگر راجپوتانہ میں بولی جانے والی راجستھانی بولیاں بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی ۔اس لیے بھی کہ راجستھانی بولیاں بہت قدیم ہیں۔اس سلسلے میں ڈاکٹرعزیزانصاری لکھتے ہیں کہ:

''راجستھانی اردو ہندی زبانوں سے کہیں زیادہ قدیم ہے اور مسلمانوں کی آمد سے قبل دہلی اوراس کے اطراف میں بھی راجستھانی بولی جاتی تھی۔'' [۱۶]

اپنے پی ایچ ڈی مقالے''اردواورراجستھانی بولیاں'' میں وہ اردو کے راجستھانی پر اثرات کے ساتھ ساتھ راجستھانی کی قدامت کا بھی لکھتے ہیں کیوں کی راجستھانی کی طرح اردو کی اصل بھی آریائی زبان کوقرار دیا جاتا ہے [۱۷] بہرحال آریاؤں کی آمد کے بعد مختلف گروہوں کی زبانیں اشتراک واختلاف کا شکار ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ ہرعلاقے کی زبان بالکل الگ ہوگئی اسے ماہرین لسانیات نے ابتدائی یا قدیم پراکرتوں کا دور کہا ہے اس دور کی ادبی زبان سنسکرت تھی سنسکرت اور پراکرتیں ارتقاء کے مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی ہماری موجودہ ہندآریائی زبانوں اردو اور راجستھانی وغیرہ کی صورت میں نمودار ہوئیں ۔''زمانہ قدیم میں گجرات،مارواڑ،جنوبی پنجاب،راجپوتانہ کے علاقوں میں ایک ہی زبان''اپ بھرنش'' بولی جاتی تھی دراصل یہ کوئی زبان نہ تھی بلکہ ماگدھی وغیرہ مختلف پراکرت بھاشاؤں کی بگڑی ہوئی مخلوط بھاشا کا نام ہے۔''[۱۸] اس کے بعد''پراکرتوں کا زوال شروع ہوا تو ان کی جگہ جو بولی یازبان معرض وجود میں آئی اُسے اپ بھرنش کا نام دیا گیا اور یہ زبان دسویں گیارہویں صدی تک رائج رہی پھر اس کے بعد جدید زبانیں ابھرنے لگیں۔''[۱۹]

ڈاکٹر مسعود حسین خان،بھی راجستھانی بولیوں کا سرچشمہ سوراسینی پراکرت کو بتاتے ہوئے اپنی تصنیف''تاریخ زبان اردو'' کے مقدّمے میں لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے فتح دہلی سے قبل راجپوتی عہد میں زبان کا جو کینڈا تھا وہ نہ برج بھاشا ہے اور نہ کھڑی بولی بل کہ اس عہد کی قدیم اپ بھرنش روایات میں جکڑی ہوئی زبان ہے جس پر راجستھانی کا اثر نمایاں ہے۔''[۲۰]

اپ بھرنشوں کے عروج کے زمانے میں ہی لسانی تغیرات کا عمل شروع ہوا ڈاکٹر فیروز احمد بھی اپنی تصنیف''راجستھانی اور اردو'' میں راجستھانی کی اصل پراکرت کو بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ خود پراکرت کے وجود میں آنے کا بنیادی سبب سنسکرت ہے۔وہ رقم طراز ہیں کہ:

''جس طرح مغربی ہندی کی بولیوں کا ماخذ کسی اور زبان میں ہے اسی طرح راجستھانی بھی اپنی اصل کے اعتبار سے اسی زبان سے متعلق ہے جس سے مغربی ہندی،یہ زبان عام طور پر شورسینی اپ بھرنش ہے جو ہندوستان کی جدید زبانوں کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔'' [۲۱]

ڈاکٹر عزیز انصاری نے بھی راجستھانی اور اس کی ذیلی بولی مارواڑی کی قدامت کے سلسلے میں اپ بھرنش عہد میں راجستھانی کے ادبی روپ''ڈنگل'' کا ذکر کیا ہے جب کہ مرزا خلیل بیگ اردو کی اصل بھی شورسینی اپ بھرنش کو قرار دیتے ہیں جو

شورسینی پراکرت سے پیدا ہوئی اورشورسینی پراکرت کے حدوداربعہ وہی تھے جو قدیم ہندآریائی دور میں مدھیہ پردیش یعنی شمالی وسط ہند کے تھے اور جہاں سنسکرت پروان چڑھی تھی غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو مدھیہ پردیش کی اسی قدیم زبان کی آخری کڑی ہے۔[۲۲]

اردو اور راجستھانی کے تعلق کے ضمن میں ڈاکٹر فیروز احمد مزید لکھتے ہیں کہ:

''اردو کا لسانی رشتہ شورسینی اپ بھرنش سے رہا اور چوں کہ اسی شورسینی اپ بھرنش کی ایک ذیلی شاخ سے راجستھانی کا جنم ہوا اس لئے منطقی اعتبار سے راجستھانی اور اردو کا رشتہ متعین ہو جاتا ہے۔''[۲۳]

اسی طرح ''اکبر کے زمانے میں ابوالفضل نے آئین اکبری میں جن زبانوں کے نام گنوائے ہیں ان میں مارواڑی ایک باقاعدہ بولی کی حیثیت سے چوتھے نمبر پر نظر آتی ہے۔''[۲۴] راجپوتانہ کے تمام علاقے میں مارواڑی کی شاخیں ملتی ہیں اس بنا پر اس کو مجموعی طور پر راجستھانی بھی کہا جاتا ہے۔اس کے علاوہ یہ بات اور بھی ہے وہ یہ کہ راجستھانی کسی ایک بولی کا نام نہیں ہے۔قائم خانی بولی بھی راجستھانی بولی ہے اور مارواڑی کی تحتی بولی بھی۔لہٰذا اس طرح قائم خانی بولی کا اردو زبان سے قدیم رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔ راجستھانی بولیوں کے متعلق سر جارج گریئرسن لکھتے ہیں کہ یہ ایک ہی زبان کی مختلف بولیاں (Dialects) ہیں۔ ہندوستان میں آکر بس جانے کے بعد مقامی اثرات کے باعث ان بولیوں کا فرق نمایاں ہوا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ وہ خود علیحدہ علیحدہ زبانیں شمار ہونے لگیں۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زبان اور بولی میں کیا فرق ہے؟

تو زبان، بولی ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت ہوتی ہے۔جس کا اپنا الگ رسم الخط اور ادب ہوتا ہے اس کے بولنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے جب کہ ''بولی'' صرف بول چال کی حد تک مستعمل رہتی ہے البتہ اس میں زبان ہی کی طرح ذخیرۂ الفاظ،قواعد اور تلفظ شامل ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند جین بولی کی تعریف میں لکھتے ہیں:

''ڈائیلیکٹ (dialect) یا تحتی بولی کی تعریف یہی بیان کی گئی ہے کہ یہ کسی زبان کی وہ شاخ ہے جس کے بولنے والوں کو آپس میں کسی لسانی اختلاف کا احساس نہیں ہوتا۔ یوں بھی ہر زبان ڈائیلیکٹوں کا ہی مجموعہ ہوتی ہے اور لسانیاتی طور پر زبان اور ڈائیلیکٹ میں کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا''[۲۵]

زبان اور بولی ایک ایسا اہم رکارڈ ہوتی ہے۔جس سے کسی بھی قوم اور خاندان کے رہنے سہنے کے طور طریقوں اور سماجی و تہذیبی قدروں کا پتا چلتا ہے۔جب جب کسی خاندان کے حالات میں فرق آتا ہے تب تب اس کا اثر ان کی بولی پر پڑتا ہے کبھی تو وہ خود ترقی کر کے ایک معیاری زبان کا روپ لے لیتی ہے اور پھر اس سے کتنی ہی مزید علاقائی بولیاں جنم لیتی ہیں اس کا بھی ارتقا جاری رہتا ہے اور اکثر کچھ ڈائیلیکٹ ترقی پاکر معیاری زبان بن جاتے ہیں۔[۲۶]

اس طرح ہر ڈائیلیکٹ کی مزید علاقائی شکلیں یا تحتی روپ ہوتے ہیں جنھیں ذیلی بولی یا سب ڈائیلیکٹ کہتے ہیں یعنی زبانیں اور بولیاں ارتقا کے مراحل طے کرتی رہتی ہیں اور نسلی اعتبار سے زبانوں کے باہمی رشتے کا تعین بہت مشکل ہے تاریخی اعتبار سے ہماری زبانوں کی

اصل اور قدیم ماخذ کی تحقیق میں علمائے لسانیات کے مختلف اور متضاد نظریات ہیں۔ زمان و مکان کی تبدیلی کے ساتھ کچھ بولیاں ختم بھی رہی اور ایسی کتنی ہی بولیاں ہیں جن پر ابھی تک تحقیقی کام نہیں ہوا ہے اور یہ مٹتی جا رہی ہیں قائم خانی بولی بھی ان ہی بولیوں میں سے ایک ہے۔ جس کا چراغ آنے والے سالوں میں بجھنے کا امکان ہے کیوں کہ تعلیمی ترقی کی بدولت اب یہ صرف دیہی علاقوں تک محصور ہو کر رہ گئی ہے۔

موجودہ دور میں قائم خانی بزرگ (خصوصاً خواتین) کی بولی جانے والی قائم خانی ہی اب ہمارا ''اصل'' ہے جب کہ آج کے بچوں کی قائم خانی بولی کا ایسا ''ارتقا'' ہے، جو اردو کے اثرات سے اسے ایک نیا روپ دے رہے ہیں۔

جہاں تک قائم خانی بولی کی اصل کا تعلق ہے تو راجستھان آزادی سے قبل مختلف ریاستوں میں منقسم تھا۔ ان ریاستوں کے علاوہ مزید چند چھوٹی ریاستوں اور راجپوتوں کے ٹھکانے بھی تھے جو لسانی نقطہ نظر سے بہت اہمیت کے حامل ہیں کیوں کہ یہ چند بڑی زبان کی علاقائی تحتی بولیوں (Regionl Dialect) کے علاقے ہیں۔ ان بولیوں میں سے چند اہم بولیاں جن سے قائم خانی بولی کا لسانی تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ وہ: مارواڑی، میواڑی، باگڑی، ڈھونڈھاری، ہاڑوتی، میواتی، ڈھاٹکی اور مالوی ہیں۔

اس میں 'مالوی' (مالوہ کے علاقے) پر بھی راجستھانی کے اثرات کا معلوم ہوتا ہے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ بھی بتاتے ہیں کہ مغربی ہندی اور راجستھانی رشتے کے لحاظ سے سگی بہنیں ہیں اور ان کا تعلق اس قدیم پراکرت سے ہے جو بہار سے سندھ تک اور پنجاب سے مالوہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ ۲۷ جب کہ ڈاکٹر فیروز احمد نے بھی ''راجستھانی اور اردو'' میں ان بولیوں کی علاقائی تقسیم بیان کی ہے۔ ۲۸ وہ رقم طراز ہیں کہ:

> ''راجستھان ایک وسیع و عریض خطہ ہے جو مختلف ریاستوں میں بٹا ہوا تھا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کسی ایک ریاست میں کوئی ایک مخصوص بولی ہوگی یقیناً ان بولیوں کی مزید شکلیں یا علاقائی تحتی بولیاں اور ان کی بھی ذیلی بولیاں ہوں گی مگر مجموعی طور پر یہ راجستھانی بولیاں ہی کہلاتی ہیں ان بولیوں میں مارواڑی سب سے اہم اور قدیم ہے مارواڑی کا ایک دوسرا نام مروبھاشا / مارو گرجر بھی ہے۔'' ۲۹

۱۹۶۱ء کی مردم شماری رپورٹ کے مطابق راجستھان میں تہتر (۷۳) چھوٹی موٹی بولیاں ہیں ۳۰ راجستھانی کا شمار جدید آریائی زبانوں میں ہوتا ہے مغربی اور مشرقی راجستھان کی مخصوص اور توانا راجستھانی بولیاں درج ذیل ہیں۔ ۳۱

مغربی راجستھان :

	بولی کا نام	علاقے
۱۔	مارواڑی (مروبھاشا)	جودھپور، جیسلمیر، بیکانیر، ناگور، سروہی، شیخاواٹی ۳۲
۲۔	میواڑی	میواڑ، اودے پور، بھیلواڑہ اور ارد گرد کے چند علاقے
۳۔	مالوی	کوٹہ، بھالاواڑ، چتوڑ گڑھ، مالوہ میواڑ کے درمیانی حصے میں بھی بولی جاتی ہے

۴۔ باگڑی/واگڑی ڈونگر پور، بانسواڑہ (بھیلوں کی بولی) اودے پور کے علاقے (یہ گجرات سے ملحق ہیں)

مشرقی راجستھان:

۱۔ ڈھونڈھاری جے پور، کشن گڑھ، ٹونک، لاوا

۲۔ میواتی، الواری الور، بھرت پور، دھولپور، قرولی (یہ دہلی کے جنوبی گاؤں گڑگانواں میں بھی بولی جاتی ہے۔ ۳۳

۳۔ آہیرواٹی بہروڑ، کوٹ پتلی وغیرہ ۔

۴۔ کھیراڑی شاہ پور، (بھیلواڑہ) اور بوندی کے کچھ علاقے۔ ۳۴

۵۔ ہاڑوتی کوٹہ، بوندی، باراں، شاہ پورہ میواڑ کے مشرقی حصے کی بولی ہے۔

۶۔ برج بھاشا لسانی اعتبار سے یہ راجستھانی سے مختلف ہے مگر اس کے گہرے اثرات الور کے مشرقی بھرتپور، دھولپور اور قرولی کی اطراف میں نظر آتے ہیں۔ ۳۵

مذکورہ بولیوں کے بھی سب ڈائیلیکٹ (تحتی بولیاں) ہیں جیسے کے میواتی بولی کی ذیلی بولی خانزادہ بولی بھی ہے۔ ۳۶

قائم خانی برادری جب مارواڑ اوا اور فتح پور میں تھی تب قائم خان کے بھائیوں کی اولادیں ناگور اور ڈیوڈوانہ سے لے کر ہریانہ کی سرحد میں ڈھوسی تک آبادیاں تھیں۔ ان میں مارواڑ کے قریب ہونے کی وجہ سے لوگ مارواڑی سے ملتی جلتی بولی بولتے تھے اور کیڈھ سے ڈھوسی تک مشرق کا علاقہ جو ہریانہ سے ملتا ہے وہاں کی بولی پر شیخاواٹی اور ہریانہ کی بولی کا میل جول ہے۔ ۳۷ اس کے بعد حصار کا علاقہ جب اُنھیں ملا تو ہریانوی کا لہجہ بھی شامل ہوا مگر یہ بولی مارواڑی کا ڈائیلیکٹ ہونے کی وجہ سے اس ہی سے متاثر ہے آگے جا کر یعنی قیامِ پاکستان کے بعد یہ بولی قائم خانیوں کے نام سے منسوب ہو کر ''قائم خانی بولی'' کہلائی۔

مارواڑی جسے مرو بھاشا بھی کہتے ہیں راجستھان کی قدیم زبان ہے اسی قدیم زبان کی تاویل ''ڈنگل'' سے کی گئی ہے۔ راجستھان میں تخلیق کی زبان صرف دو ہیں عام طور پر انھیں ''ڈنگل'' اور ''پنگل'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ ان میں ڈنگل قدیم ہے یہی ڈنگل مغربی راجستھان میں مارواڑی کہلاتی ہے۔ ڈاکٹر مینا ریا رقم طراز ہیں:

> ''ڈنگل اپنے ابتدائی دور میں ہی نہیں بلکہ صدیوں تک عموماً چارن بھاٹوں کی زبان تھی جو اپنے سرپرستوں (جو راجہ یا جاگیردار ہوتے تھے) کی تعریف میں ڈینگ ہانکا کرتے تھے اسی لیے ان کی شاعری بھی ڈینگل (یعنی ڈینگ سے بھری ہوئی) کہلائی۔'' ۳۸

بعد ازاں یہ ڈینگل لفظ ''ڈنگل'' میں تبدیل ہو گیا۔ ''ڈنگل'' کی نسبت ''پنگل'' اپنے صوتی آہنگ میں عوام الناس میں مقبول ہوئی بہر حال یہ دو الگ الگ بولیاں ہیں۔ ڈاکٹر ہیرالال مہیشوری کے مطابق پنگل کا ارتقاء شورسینی اپ بھرنش اور ڈنگل کا گرجری اپ بھرنش سے ہوا۔ ۳۹ آگے مزید لکھتے ہیں: ڈنگل کی لسانی خصوصیات میں ''اَی، اَے، اَوَ اور اَو'' کی مثالیں ملتی ہیں جب کہ مارواڑی کا

رجحان عام طور پر ''او، اِی، اُوٗ'' کی جگہ پر ''اَ'' (الف پر زبر) کا رہا ہے مزید یہ کہ مارواڑی میں صیغۂ حال کے لیے چھے، مستقبل کے لیے ''ہا'' یا ''چھوٗ'' کا چلن زیادہ ہے یہی نہیں بلکہ اس زبان میں ''کے'' کے لیے زیادہ تر ''نے'' کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔[۴۰] شورسینی اپ بھرنش کے جس ناگر روپ سے راجستھانی زبان کا آغاز ہوا اُسے کبھی ڈنگل، کبھی مارواڑی اور کبھی مرو بھاشا کے نام سے موسوم کیا گیا اسی راجستھانی کا دوسرا روپ ''پنگل'' تھا جو برج سے متاثر ہو کر مدتوں تخلیقی زبان کے طور پر رائج رہا۔ ان دونوں بولیوں میں متعدد ''راسو''[۴۲] بھی لکھے گئے ''راسو'' ایک راجستھانی صنف ہے اس میں ''پرتھوی راج راسو'' مصنف ''چند بردائی''، ''سمیر راسو'' ''مصنف شنکر دھر''، ''قائم راسو'' مصنف ''نعمت جان خان کوی'' (متخلص جان قائم خانی) معروف ہیں۔ ان ''راسو'' میں کسی خاص قوم کے اوصاف یا کسی جنگ یا کسی خاص شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا جاتا ہے۔

''قائم خان راسو'' قائم خانی معاشرے اور تاریخ پر پہلی کتاب ہے۔ یہ جان کوی نعمت خان کا لکھا ہوا ایک تاریخی منظوم مکالمہ ہے۔ نعمت خان ریاست فتح پور (شیخاواٹی) کے ساتویں نواب الف خان قائم خانی کے دوسرے فرزند تھے۔ نعمت جان کوی اپنے والد اور بھائیوں کے متعلق ایک دوہا لکھتے ہیں۔

بڑو دولت خانو ہے دوجو نعمت خاں جاں
خاں سریف، ظریف خاں پونی فقیر خاں

ترجمہ: نواب الف خان کے پانچ بیٹے ہوئے۔ ان میں بڑا دولت خان تھا دوسرا نعمت خان، پھر شریف خان، ظریف خان اور سب سے چھوٹا فقیر خان

ایک اور دوہے میں والد کی تاج پوشی کا بتاتے ہیں:

جب بھئی بس کال کے تاج خانو سرمور
الف خانو دیوان تب بیٹھے ان کی ٹھور[۴۳]

ترجمہ: جب نواب تاج خان کا انتقال ہوا تو الف خان ان کی جگہ گدی پر بیٹھے۔

نعمت خان جان کوی کا تصنیفی عہد ۱۶۱۳ء تا ۱۶۴۴ء تسلیم کیا گیا ہے۔[۴۴] تاہم اس مسودے کی پہلی اشاعت تقریباً ۳۷۷ سال کے بعد ۱۹۵۳ء میں پہلی مرتبہ ہوئی۔[۴۵] جان کوی کے ۷۵ مسودے مختلف موضوعات پر دستیاب ہوئے جس میں بیش تر شائع ہو چکے ہیں جان کوی نے اپنی تخلیقات میں ہندو دھرم کے گرنتھوں، شاشتروں اور کتھاؤں کے متعلق لکھا ہے اور اپنے چوہان راجپوت ہونے پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔ جان کوی کی تخلیقات میں مختلف زبانوں کا استعمال کیا گیا ہے چوں کہ فتح پور (شیخاواٹی) کی ریاست ہمیشہ دلی کے حکمرانوں کے زیرِ تسلط رہی اور دلی کی دفتری اور درباری زبان فارسی تھی جب کہ عوام الناس میں اردو کی مقبولیت تھی اس لیے فتح پور میں بھی فارسی کا اثر تھا۔

ڈاکٹر دشرتھ شرما ''جان کوی نعمت خان'' کی زبان و بیان اور اس کے شعری اسلوب کے متعلق لکھتے ہیں:

''جان کے یہاں چارن شعراء کی ڈنگل اور اس کے اثرات بہت کم ملتے ہیں اس کے برخلاف شورسینی اپ بھرنش نے جان کی زبان پر خاصا اثر ڈالا ہے'' [۴۶]

نعمت خان جان کوی کی تخلیق ''قائم خان راسا'' میں فارسی، عربی، سنسکرت، قدیم اردو کے متروک الفاظ اور کہیں کہیں پنجابی کے لفظ بھی استعمال کئے گئے ہیں لیکن زیادہ تر الفاظ پرانی راجستھانی اور برج بھاشا کے ہیں جسے راجستھانی، گوجری، مارو گجر اور ڈنگل لکھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر فیروز احمد نے ایسے کئی الفاظ دیئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''نعمت خان جان کے عہد میں بعض وہ الفاظ بھی رائج معلوم ہوتے ہیں جو اردو میں اب متروکات کے ذیل میں آتے ہیں لیکن قدیم اردو میں ان کا بخوبی استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً: پلک بمعنی پلنگ، پلکا پر پگ نادھروں [۴۷]

جان کوی نے ہانسی کے ایک بزرگ شیخ محمد چشتی کو اپنا استاد بتایا ہے ان کا ایک دوہا ہے۔

شیخ محمد میرو پیر ہانسی ٹھام کنیں گمبھیر

شیخ محمد پیر مھارو نام جگت اجیارو [۴۸]

''قائم خان راسا'' نعمت جان کوی کا منظوم رزمیہ مکالمہ ہی نہیں ان کے خاندان کی تاریخ، بولی اور فتح پور ریاست کے سیاسی تخلیقی اور ادبی شعور کی عمارت کا سنگ بنیاد ہے۔

(۲)

لسانی خصوصیت: قائم خانی بولی کا کوئی علیحدہ رسم الخط مقرر نہیں ہے اس لیے عربی حروف میں قائم خانی بولی کی مخصوص آوازوں کی ادائیگی مشکل ہے ہندوستان میں یہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور دیوناگری حروف تہجی عربی کی خاص آوازوں کو ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ عربی حروف سے قطع نظر اس کی نحوی ساخت (تمام تر)، صرفی تشکیلی خصوصیات کسی قدر اور نظام اصوات (بیشتر) میں اردو زبان کے ساتھ ہم آہنگی پائی جاتی ہے یہی نہیں ذخیرہ الفاظ کا ایک خاصہ حصہ مشترک ہے۔ مگر مارواڑی کے اثر سے قائم خانی بولی کی اپنی ایک الگ پہچان ہے اگرچہ اردو بولنے والے اہل زبان اس بولی کو گنواری کا درجہ دیتے ہیں. لیکن آج بھی یہ اپنا علیحدہ صوتی آہنگ رکھتی ہے جو اس بولی کو ایک خوب صورت روپ دیتا ہے۔

اردو زبان کے اثرات قبول کرنے سے پہلے قائم خانی بولی کی لسانی خصوصیات بھی راجستھانی خصوصاً مارواڑی کے اثرات لیے ہوئے تھی۔

۱۔ قائم خانی میں 'ل'، 'ڑ' کی ایک مخصوص اور مخلوط آواز ہے جو تالو سے زبان لگا کر پیدا کی جاتی ہے جیسے 'ہلڑ' (ہل)

۲۔ اسی طرح 'ن'، 'ڑ' کی آواز ہے جیسے 'کھانڑا' (کھانا)

یہ خصوصیت اردو زبان میں نہیں ہے البتہ راجستھانی بولی میواتی میں یہ یہی آواز 'ن'، 'ل' کا استعمال بہت سختی سے ہوتا ہے 'ن' ہندی کے انا سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے اسی طرح 'ل' کی آواز تامل زبان کے 'ٹ' کے مانند ہوتی ہے۔[۴۹] جب کہ ہریانوی میں یہی آوازیں بہت نرمی سے ادا کی جاتی ہیں۔

۳۔ قائم خانی بولی میں اردو کے مخلوط حروف جن کا دوسرا اور آخری 'ھ' ہوتا ہے سب کے سب قائم خانی بولی میں بطور ایک مکمل حرف مستعمل ہیں ان کے علاوہ کچھ اور حروف جن کے ساتھ 'ہ' کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً چھ، نھ، مھ، تھ وغیرہ

۴۔ قائم خان راسا میں عموماً 'ل' اور 'ڑ' کی جگہ 'ر' کا استعمال بھی ملتا ہے۔

بہت پیار سوں گرے لگایو

لرے الف خان ، پرت ہے گھما سان [۵۰]

۵۔ قائم خانی بولی میں 'ڑی' اور 'ڑا' کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے جیسے بھائی سے بھائڑا، بائی سے بائڑی قائم خانی بولی کی صوتی حیثیت کا جائزہ لیں تو عربی کے متشابہ الصوت حروف ''ز، ذ ،س، ص، ت، ط، ح، ہ، ع وغیرہ کو ادا کرنا قائم خانی بولی میں ممکن نہیں یہ حروف اپنے ہم صوت حروف کے مقابلے میں آ کر اختلاف معنی ہو جاتے ہیں اور یہ فرق کم و بیش تمام راجستھانی بولیوں میں ملے گا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر گیان چند رقم طراز ہیں:

> ''ص، ث، ط، ظ'' وغیرہ عربی میں واضح آوازیں بھی ہیں اور صوتیے بھی، لیکن ہندو پاک میں جب یہ ایک ہی آواز کی تکرار سے زیادہ نہیں تو انھیں صوتیہ تو درکنار صوت کا مرتبہ بھی نہیں دیا جا سکتا۔ پھر ان کے لیے علاحدہ تحریری علامات برقرار رکھنا کیا معنی؟ زبان کی اصلی اور بنیادی شکل تقریر ہے نہ کہ تحریر، تحریر کا کام تقریر کو صحت کے ساتھ قلم بند کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ علم (جھنڈا) کو اگر الم لکھا جائے تو اس سے زیادہ فرق نہ ہوگا جو بار بمعنی بوجھ اور بار بمعنی پھل میں ہوتا ہے۔''[۵۱]

عربی کے ان زیر بحث حروف کی آوازیں قائم خانی بولی میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اس لیے عملاً ان کا استعمال نظر نہیں آتا اور بولنے میں ان کا تلفظ ایک جیسی آواز کا ہوتا ہے۔ ''ذ، ظ، ض، ز'' کا تلفظ ایک ہی ہوگا، اسی طرح ''ص، ث، س'' کی الگ الگ آواز نکالنا قائم خانی بولی میں ممکن نہیں پھر ''ط، ت'' کی بھی کوئی علاحدہ آواز نہیں ''ح'' اور ''ہ'' کا تلفظ ایک جیسا ہے اور ''ع، ء'' میں کوئی فرق نہیں۔

۶۔ اردو کے مشکل المخارج اور یک ساں آواز والے عربی و فارسی حروف ''ض، ظ، غ، ف، ق'' بھی قائم خانی بولی میں ہیں۔ قائم خانی افراد ایسے الفاظ کی آواز کو اپنے مخصوص لب و لہجے کے مطابق بدل لیتے ہیں۔ اس فرق کی وضاحت کے لیے درج ذیل مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

ذرہ	جرح	'ذ' کو 'ج' سے بدل دیا اور تشدید بھی استعمال نہیں ہوگی۔

زرہ	جرا	''ز'' کو ''ج'' سے بدل دیا
قبضہ	کب جا	'ق' کو'ک' سے اور ''ض'' کو''ج'' اور''ہ'' کو'ا' سے بدل دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ ایسے حروف جن کے اقلی جوڑے۵۲ بنائے جائیں تو وہ اپنے ہم صوت حروف کی جگہ آ کر معنی کا اختلاف پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً:

اردو زبان	**قائم خانی بولی**
اصراف (خرچ)	اسراف (فضول خرچی)
ازل (وہ زمانہ جس کی ابتدا معلوم نہ ہو)	اذل (ذلیل)
اثم (گناہ)	اسم (نام)
کثرت (زیادتی)	کسرت (ورزش)

مصوتے: قائم خانی بولی کے مصوتے اردو سے کئی جگہ مختلف ہیں مگر یہ فرق بہت زیادہ نہیں ہے بس قائم خانی خواتین کا تلفظ کئی مصوتوں کی آوازوں بدل دیتا ہے. جیسے:

۱۔ اعجاز (معجزہ) میں الف کے نیچے زیر کے بجائے زبر لگایا جاتا ہے ۔

۲۔ عود (خوشبو دار لکڑی) کا پیش زبر سے بدل کر اود (نمی) ہو جائے گا

۳۔ آندھی (تیز طوفانی ہوا) آدھی کی صورت میں ادا ہوگا.

مصدر کے قاعدے: وہ کلمہ جس میں کسی کام یا حرکات کا بیان ہو اور اس میں زمانہ نہ پایا جائے یعنی اس کام اور حرکت کا کوئی وقت معین نہ ہو اس کو مصدر کہتے ہیں۔۵۳ مصدر سے اسم اور فعل دونوں مشتق ہوتے ہیں۔

مثلاً: کھانا سے کھاؤ اور کھاتا ہے۔

اسم مصدر کی علامت اردو میں: 'نا' مارواڑی میں 'بوٗ'، 'نوٗ' یا **ن، ڑ** کی مخلوط آواز 'نڑ' ہے۔ جیسے: مارواڑی کا مصدر ''کھابوٗ'' قائم خانی بولی میں کھانڑاں۵۴

قائم خانی میں: ن، ڑ کی مخلوط آواز 'نڑ' کا بطور مصدر ہوتا رہا مگر اردو کے اثرات کے بعد اب 'نا' ہی علامت مصدر ہے۔ اگر **نا، بوا** اور **نو** کو ہٹایا جائے تو صرف مصدر یعنی امر رہ جاتا ہے۔ ذیل میں قائم خانی بولی اور اردو کے مشترک مصادر درج کیے جا رہے ہیں ان میں کوئی فرق نہیں سوائے اس کے کہ قائم خانی بولی میں حرف کی آخری آواز 'ن' اور 'ڑ' کی مخلوط آواز پیدا کرتی ہے. جو سندھی زبان کے '**ڻ**' سے کچھ ملتی جلتی ہے۔ یہاں صرف چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

اردو	**قائم خانی بولی**	**اردو**	**قائم خانی بولی**

"الف"	اڑنا	اُڈنا			
	اٹکنا	اٹکنڑاں			
"ب"	بتانا	بتانڑا	"بھ"	بھڑکنا	بھڈکنا
	بجانا	بجانڑا		بھانڈنا	بھانڈیو
"پ"	پڑھنا	پڈھنا	"پھ"	پھڑکنا	پھڈکنا
	پوچھنا	پوچھنا		پھرنا	پھڑنا
"ت"	تاپنا	تاپنا	"تھ"	تھاپنا	تھاپنڑا
	تاڑنا	تاڑنا		تھکنا	تھکنا
"ٹ"	ٹالنا	ٹالنا	"ٹھ"	ٹھوکنا	ٹھوکنا
	ٹانکنا	ٹاکنا		ٹھوسنا	ٹھوسنا
"ج"	جانا	جانڑا	"جھ"	جھاڑنا	جھاڑنا
	جلنا	جلنڑا		جھپٹنا	جھپٹنا
"چ"	چلنا	چالنا	"چھ"	چھانٹنا	چھانٹنا
	چڑھنا	چڈھنا		چھیلنا	چھیلنڑا
"خ"	خریدنا	کھریدنا			
"د"	دابنا	دابنڑا	"دھ"	دھرنا	دھرنا
"ڈ"	ڈالنا	ڈالنا	"ڈھ"	ڈھلنا	ڈھلنڑا
	ڈرنا	ڈرنا		ڈھکنا	ڈھکنڑا
	ڈسنا	ڈسنڑا		ڈھونڈنا	ڈھونڈنا
"ر"	رٹنا	رٹنا	"س"	ساندنا (جوڑ ملانا)	ساندنا
	رچنا	رچنا		ستانا	ستانا
"ش"	شرمانا	سرمانا	"غ"	غرانا	گورانا
"ف"	فرمانا	پھرمانا	"ق"	قبولنا	کبولنا
"ک"	کاتنا	کاتنا	"کھ"	کھانا	کھانڑاں

"گ"	گانا	گانڑاں	"گھ"	گھالنا	گھالنا
"ل"	لکھنا	لکھنڑاں	"م"	مانجنا	مانجھنا
"ن"	ناپنا	ناپنا	"و"	وارنا	وارنا
"ہ"	ہنسنا	ھانسنڑا			

تذکیروتانیث: بعض زبانوں میں اسم مذکر (نر کی جنس) اور اسمِ مونث (مادہ کی جنس) دو کلمے الگ الگ معنی رکھنے والے ہوتے ہیں اور اسم کے ساتھ بطور سابقہ یا لاحقہ استعمال ہو کر مذکر یا مونث کے معنی پیدا کرتے ہیں بعض زبانوں میں مذکر اور مونث کا فرق صرف اسم کی حالت واحد میں قائم رہتا ہے۔[۵۵]

بابائے اردو مولوی عبدالحق رقم طراز ہیں:

''سنسکرت میں جنس کی تینوں صورتیں ہیں یعنی مذکر اور مونث اور تیسری وہ صورت ہے جو نہ مذکر ہے نہ مونث، اسی طرح پراکرت میں بھی تینوں صورتیں پائی جاتی ہیں، لیکن جدید زبانوں میں جو زیادہ تر پراکرت سے پیدا ہوئی ہیں صرف گجراتی اور مرہٹی ایسی زبانیں ہیں جن میں جنس کی تین صورتیں ہیں۔[۵۶]

برصغیر پاک و ہند میں بولی جانے والی زبانوں میں بعض میں جنس کی دو اور بعض میں تین صورتیں پائی جاتی ہیں اس سلسلے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری ''اردو زبان کا ارتقاء'' میں فرماتے ہیں: سنسکرت اور پراکرت میں جنس کی تین قسمیں تھیں (۱) مذکر (۲) مونث (۳) بے جنس۔[۵۷]

قائم خانی بولی میں بھی اردو اور راجستھانی کی طرح جنس کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ان کے علاوہ مذکر سے مونث بنانے کے تمام قاعدے بھی مشترک ہیں اور اگر کہیں کوئی جزوی اختلاف ہے بھی تو وہ صوتی تغیر کی وجہ سے ہے۔

چناں چہ قائم خانی بولی میں بھی اردو قاعدے کی طرح مذکر کا آخری حرف اگر 'الف' ہوتا ہے۔ یا ہائے ہوز، تو تانیث بناتے وقت اس کو یائے معروف میں بدل دیتے ہیں اور اگر اسم مذکر کا آخری حرف پر ختم ہوتا ہے تو 'نی'، 'انی' بڑھا کر مونث بنا لیا جاتا ہے اور اگر اسم مذکر کا آخری حرف 'ی' ہو تو اسے گرا کر 'ن' کا اضافہ کر لیتے ہیں۔ جیسے:

اردو	**قائم خانی بولی**	
واحد	مذکر	مونث
ماسٹر	ماسٹر[۵۸]	ماسٹرنی
بڑھی	کھاتی	کھاتن
بھاٹ	بھاٹ	بھاٹنی، بھٹنی

یہ بہت کم مثالیں پیش کی گئی ہیں اس لیے کہ اردو کی تمام تذکیروتانیث قائم خانی میں بھی اسی صورت میں ہیں اور وہ الفاظ جو مونث ہیں اوران کے مذکرنہیں ہوتے قائم خانی بولی اوراردو میں مشترک ہیں۔مثلاً: چھت، کھاٹ، آبرو وغیرہ
وہ الفاظ جو دونوں میں مذکر ہیں اوران کی مونث نہیں ہوتی۔جیسے: پانی،موتی،سورج،چاند وغیرہ۔

مبتدااورخبر میں بھی قائم خانی بولی اردو سے قربت رکھتی ہے صورت واحد جمع مذکرومونث میں خبر کا اپنے مبتدا کے مطابق ہونا ضروری ہے۔البتہ کہیں کہیں قائم خانی بولی میں لفظ کا ابتدائی حرف اگر'ی' ہے تو 'ا' سے بدل دیتے ہیں ایسے میں 'ا' کی آواز دوالف کے برابر نکلے گی۔جیسے**:** یعنی: لگا ئیاں کی باتاں کا گئے اعتبار/اعتبارکونی (اردو،عورتوں کی بات کا کوئی اعتبارنہیں)''

فعل مثبت وفعل منفی امرونہی: فعل میں کسی فعل یا عمل کا صدور پایا جانا ایک لازمی شرط اور صدور سے مراد صرف کام کا کرنا یا ہونا ہی نہیں، نہ کرنا اور نہ ہونا بھی ہے فعل کی دوصورتیں امرونہی ہیں امر میں کسی کام یا التجا ہوتی ہے اورنفی میں نہ کرنے کا حکم یا التجا۔قائم خانی بولی میں اردو ہی کی طرح مصدر سے علامتِ مصدر گرا کر فعل امر بنا لیا جاتا ہے .اورفعل نہی کے لیے فعل امر سے پہلے حرف نفی 'نہ' لگایا جاتا ہے۔[۵۹]

مثلاً :اردو میں: آ، جا،نکل،کھا،کر، دھو،رو،لکھ، میں نہی کے لیے امر کے بعد 'نہیں' کا اضافہ کر دیا جاتا ہے اور جمع میں **'و'** یا **'وئیں'** کا جب کہ قائم خانی بولی میں امر کے لیے تو اسی طرح آ، جا،نکل،کھا ،کر دھو،رو،لکھ ، ہے۔مثلاً: آنا سے آ، جانا سے جا، چلنا سے چل، پینا سے پی اور نہی کے لیے، نہ آ، نہ جا وغیرہ ۔جمع میں مثال کے طور پر:

اُردو: آئیں، جائیں، دیکھیں

قائم خانی: آواں، جاواں، دیکھاں

اعلام واسماءاو صفات: قائم خانی بولی میں بھی اردو کی طرح اسماء وصفات کے لیے''الف'' کا استعمال ہوتا ہے۔جب کہ پہلے مارواڑی کے اثر سے''واؤ''مستعمل تھا۔جیسے:

قائم خانی	اردو	
چھورو/چھوری کیجاں/رکت جاریاے/جاری اے		(واحد)
چھوریاں/چھورے کیجاں/رکت جاری او/جارےاو		(جمع)

قائم خانی بولی میں بھی اردو ہی کی طرح فاعل اورفعل کے صیغوں میں واحد جمع اورتذکروتانیث کے لحاظ سے ردو بدل ہوتا رہتا ہے چناچہ اگر فاعل واحد ہے تو صیغہ فعل بھی واحد ہوگا، صیغہ اگر جمع ہے تو وہ بھی جمع ہوگا۔لفظی طور پر دیکھیں تو قائم خانی بولی میں اسماء وصفات پر'مارواڑی' کا اثر رہا مگر قواعد کے اعتبار سے یہ اردو سے متاثر ہے۔

قائم خانی میں اسماء وصفات، تذکیروتانیث اورجمع واحد کے صیغوں میں تبدیلی اپنے موصوف کے مطابق ہوتی ہے جیسے اردو میں ہوتی ہے جب کہ مارواڑی میں یہ ترتیب قائم رہتی ہے اور ہر دو الفاظ ایک ہی انداز پر بدلتے رہتے ہیں۔ جیسے**:**

قائم خانی بولی	اردو
دھولا کپڑا میلا اُور یا اے	سفید کپڑا میلا ہو رہا ہے
دھولے کپڑے مَیلے اُور یے ایں	سفید کپڑے میلے ہو رہے ہیں

ضمائر اور ان کی تذکیر و تانیث، اسم ضمیر: وہ کلمات جو اسم کے بجائے استعمال کیے جائیں ضمیر کہلاتے ہیں۔ قائم خانی بولی میں بھی اردو ہی کی طرح قائم ضمائر خواہ فاعلی حالت میں ہوں یا مفعولی یا اضافی حالت میں محل استعمال ایک جیسا ہے۔

	اردو (متکلم ضمائر)	قائم خانی بولی		
	میں	مھیں/مھاں	واحد	فاعلی حالت
	ہم	اَپاں/مھاں	جمع	
	مجھے	مننے	واحد	مفعولی حالت
	ہمیں	مھانے	جمع	
	میرا	میرا	واحد	اضافی حالت
	ہمارا	مھاروا	جمع	
	مجھ میں	میرو میں	واحد	ظرفی حالت
	ہم میں	مھارے مھیں	جمع	
	مجھ سے	میرو سوں	واحد	طوری حالت
	ہم سے	مھارے سوں	جمع	
"ضمائر مخاطب یا حاضر"	تو	تھس/توں	واحد	فاعلی حالت
	تم	تھام/تھم	جمع	
	تجھے	تھم نے/تنے	واحد	معفولی حالت
	تمھیں	تھاں نے/تھمنے	جمع	
	تیرا	تھارا	واحد	اضافی حالت
	تمھارا	تھاروا	جمع	
"ضمائر غائب"	وہ	وا/بو	واحد	فاعلی حالت ''ضمائر غائب''
	وہ سب	وے ۶۰	جمع	
	اس کو	ایں نے/اُوں نے	واحد	مفعولی حالت

انھیں	اُنا نے	جمع	
اس کا	اُووکا/ایں کا	واحد	اضافی حالت
اُن کا	اُونا کا	جمع	

ضمیر موصولہ: ضمیر کی ایک قسم ضمیر موصولہ ہے یہ بھی ضمیر شخصی کی طرح کسی اسم کے بجائے آتی ہے مگر اس کے ساتھ ہمیشہ ایک جملہ ہوتا ہے جس میں اس اسم کا بیان یا توضیح ہوتی ہے۔٦١ ضمیر موصول اور اس کے جواب میں آنے والا لفظ اردو اور قائم خانی بولی میں ایک ہے .اردو میں ''جو'' کی غیر فاعلی حالت ''جس'' اور ''جن'' ہے. قائم خانی میں بھی ایسے ہی ہے۔ مثلاً:

اُردو	قائم خانی بولی		
جو/جس نے	جیں/جیں نے	واحد	حالت فاعلی
جو/جنھوں نے	جیں/جھاں نے	جمع	
جس کو/جسے	جینھیں/جین نے	واحد	حالت مفعولی
جن کو	جیں کو	جمع	
جس (کا، کی)	جیں (کا، کی)٦٢	واحد	حالت اضافی
جن (کا، کی)	جھاں (کا، کی)	جمع	

ضمائر تنکیر: ضمائر تنکیر اردو میں دو ہیں: ''کوئی'' اور ''کچھ'' قائم خانی میں بھی معمولی صوتی تغیر کے سوا کوئی فرق نہیں ہے۔ ان میں سے ''کوئی'' اشخاص کے لیے اور ''کچھ'' اشیاء کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

مثلاً: یہاں کچھ گڑ بڑ ہے (اردو)

اُرے کیمی گڑ بڑاے (قائم خانی)

ضمیر استفہام یا اسم استفہام: اسم یا ضمیر استفہام وہ کلمات ہیں جو پوچھنے، سوال کرنے یا استفہام کے لیے بولے جاتے ہیں۔ اردو میں استفہام کی ضمیریں یہ ہیں. کون، کیا، اور کون سا ہیں. جن میں کون جاندار کے لیے ''کیا''، بے جان کے لیے ''کون سا'' اشیا اور اشخاص دونوں کے ساتھ آتا ہے۔٦٣ قائم خانی بولی میں اردو ہی کی طرح ضمائر استفہام 'ک' سے شروع ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی اکثر زبانوں میں استفہامیہ ضمیروں میں ''ک'' قدر مشترک ہے. اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصل جز ''ک'' ہی ہے۔

اردو	قائم خانی بولی	ضمائر استفہام	
کون، کس نے	کونڑ، کنڑ	واحد	فاعلی حالت
کون، کس نے	کنڑ	جمع	
کس کو، کیسے	کئیں نے	واحد	مفعولی حالت

کن کو، کنھیں	کِنھانے	جمع	
کس (کا، کی)	کئیں (کو، کی)	واحد	اضافی حالت
کن (کا، کی)	کئیں (کو، کی)	جمع	

قائم خانی میں 'کذ' (کب)، 'کتٔ' (کہاں)، 'کدیٔ' (کبھی) کیئاں، کیئسو (کیسا) کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

حرفی خصوصیات: حروف سے مراد ایسے کلمات ہیں جو کلام مسلسل میں دوسرے بامعنی کلمات کے ملنے اور ساتھ آنے پر منحصر ہے۔ اس کی متعدد اقسام ہیں جیسے:

حروفِ ربط: ایسے حروف ہیں۔ جو ایک کلمے کا کسی دوسرے کلمے سے تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً:

حامد کا گھر، کا، کی، کے حروفِ اضافت ہوا۔ راجستھانی اور ماڑواڑی میں ''را'' ، ''ری''، ''رے'' بھی مستعمل ہے۔

قائم خانی بولی میں بھی یہ سب حروف ہیں۔ جیسے:

''حامد کا گھر'' کہیں کہیں ''کو'' کا استعمال بھی ہوتا ہے ''حامد کو گھر''۔

حروفِ جار: وہ حروف جو اسم کو فعل سے ملاتے ہیں۔ حرف جار قائم خانی بولی اور اردو میں اسمِ مجرور کے پیچھے آتے ہیں مثلاً:

اردو	**قائم خانی بولی**	**اردو**	**قائم خانی بولی**
تک	تلک	پُر/لیکن	پَے
کو	کوں/رَئے	میں	مھیں/ماں
جب	جد	سے	سوں/سیں

حروفِ عطف: حروف یا الفاظ میں جو دو یا دو سے زیادہ کلموں یا جملوں کو ملاتے ہیں۔ انھیں حروف عطف کہا جاتا ہے۔ مثالیں دیکھیے:

اردو	قائم خانی بولی	اردو	قائم خانی بولی
اور	اُر/اور	پھر	فیر
کر	کر	کے	کے

باقی حروف کا استعمال قائم خانی بولی میں اردو ہی کی طرح ہیں ان کی الگ سے ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔

نحوی خصوصیات: الفاظ جوڑ کر فقرے یا جملے بنانے کے لیے ہر زبان کا ایک دستور ہوتا ہے اصطلاح میں اسے نحو کہتے ہیں[۶۴] قائم خانی بولی کی مادری بناوٹ اور نحوی ترکیب اس میں افعال کے صیغہ جات کی مماثلت اور ان کا محلِ استعمال مبتدا و خبر وغیرہ کے قواعد اردو ہی کی طرح ہیں (جس کی تفصیل مقالے میں آگے دی گئی ہے) یہاں نحوی خصوصیات کے لیے قائم خانی بولی میں ایک پیراگراف درج ذیل ہے۔

قائم خانی: ایک جالم ھالڑی آپ کا کھنڈیاں ماں جال ڈال کر کمیڑی نئے پکڑ لیئا۔ سکار کھاتر پھانس لیئا، مارنا تائیں کونی پکڑو۔ کمیڑی آپ کا ٹابراں تائیں داناں لین جاری تھی، اَر اِب تڑے سوں کھنڈیاں ماں پنجراماں بندھ ری تھی۔ جد سام نئے گائیاں کو گوالیا آپ کا گھراں

جاروتھاتوہی کمیڑی روتاروتاہی نئے ھیلو رلیو۔

اردو: ایک ظالم کسان نے کھیت میں جال لگا کر فاختہ کو پکڑ لیا۔ شکار کے لیے قید کر لیا۔ مارنے کے لیے نہیں پکڑا تھا۔ فاختہ اپنے بچوں کے لیے خوراک لے جانے آئی تھی اور اب صبح سے کھیتوں میں پنجرے میں بندھی تھی جب شام کو گائیوں کا گولا اپنے گھر واپس جا رہا تھا تو فاختہ نے روتے ہوئے اس کو آواز دی۔

ذخیرۂ الفاظ: کئی کئی آوازیں ملنے سے ایک لفظ بنتا ہے اور لفظ ہی زبان ہے۔ کیوں کہ معنویت جو زبان کی جان اور پہچان ہے لفظ سے شروع اور لفظ پر ہی ختم ہوتی ہے۔ یعنی زبان نہ لفظ سے زیادہ ہے نہ کم جب کہ زبان کے الفاظ جس کتاب میں اکھٹے کیے جاتے ہیں اسے اردو میں لغت کہتے ہیں۔ دنیا کی کسی زبان کا آج تک کوئی مکمل لغت تیار نہیں ہو سکا ہے۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے ک پورے لسانی سرمائے کا جمع کرنا کسی ایک یا دو یا چار انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ زبانوں میں مسلسل نئے نئے الفاظ کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ کچھ دوسری زبانوں سے مستعار لیے جاتے ہیں کچھ اپنے الفاظ میں ردوبدل ہو جاتا ہے۔

مرزا قلیچ بیگ لفظ کی تعریف میں رقم طراز ہیں:

> بولی لفظوں سے جڑی ہوتی ہے اور لفظ پورا خیال پیدا کرتا ہے یعنی وہ مطلب ان لفظوں کے دستوری یا رواجی معنی یعنی اصطلاح پر منحصر ہے اور جملے کے بولنے میں جو الفاظ کام آتے ہیں ان کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ یا ان کا ایک دوسرے سے کیا نسبت ہے اس سے کیا مطلب نکلتا ہے؟ سو یہ گرامر سے معلوم ہوتا ہے۔'' ۶۵

جب کہ ڈاکٹر الانا لفظ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> ''لفظ پورا خیال ظاہر کرتا ہے اور وہ خیال اور مفہوم سے معلوم ہوتا ہے یا لفظ کی دستوری یا رواجی معنی ہوتی ہے اور وہ لفظ جس جملے میں کام آتا ہے اس سے نکلے معنی کو گرامر والی معنی کہتے ہیں۔'' ۶۶

اسی طرح قائم خانی بولی کے کچھ مخصوص الفاظ ہیں جو اب بھی مستعمل ہیں ان میں زیادہ تر الفاظ ہمیں راجستھانی بولی اور قدیم اردو میں ملتے ہیں، البتہ قائم خانی برادری کے افراد ان کو اپنے مخصوص لب و لہجہ کے مطابق بدل دیتے ہیں اور اس لہجہ Accent کو لکھنا بھی مشکل ہے اس کی ادائیگی سے ہی اصل لہجے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ذخیرۂ الفاظ، قائم خانی بولی کے مخصوص لہجے

(الف)

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
اَوجھ	پیٹ	اَدھ باوَلہ	نیم پاگل
اَوجُوں	دوبارہ	اُوکھلی مُوصل	ہاون دستہ
اُونڈی	گہرا	اِت	یہاں

اَوکھو	مشکل، عجیب	اَیڑی	ایڑھی
اَوچھا	چھوٹا	اِیکسُو	برابری
اُورا	یہاں	اُباسی	جماہی
اُجاں	یہاں	اَٹھا	یہاں
اُڈِ ینک	انتظار	اُولما	طعنہ
اَوڈک سی	چھوٹی سی، اتنی سی	اِ بار	ابھی
ِ اچھا	خواہش	اُتاوَلہ	بے چین
اَوڈ	اتنا	اوڈھنی	دوپٹہ
اَٹھے	یہاں	اِنّہ	اِدھر
اینہ	اس کو	اُکالنا	اُبالنا
اَوپرا	نرالہ، انوکھا	اَ بکے	اس بار، اس مرتبہ
اُتاول	جلد بازی۔عجلت	اَٹھے	یہاں۔اس جگہ (پنجابی اِتھے)
بٹھے	وہاں، اُس جگہ (پنجابی اُتھے)	اُٹھی نے	اس طرف، ادھر
بٹھنے	اُس طرف، اُدھر	اَوڈک	اتنی سی
اُوندری	چوہی (چوہے کی مونث)	اجایو	بے کار، ضائع (سندھی میں بھی مستعمل ہے)
اُرلا	اُس طرف کا	اُرے	قریب، پاس، پرے کی ضد
آ گورآ گا	سامنے کا ، اگلا	اَونڈو	گہرا۔عمیق۔اتھاہ
اُڈنا	اڑنا	اَوبالاں	جوش حرارت

(آ)

آمرِی	آم (کچا)	آنبرا	آسمان
آ	یہ	آلا	گیلا
آلہ	طاق	آڈابولنا	طنزیہ بولنا

(ب، بھ)

بَا	وہ	بَٹکا	دانت سے کاٹنا
بَڈلتو	بڑے والا	بھیجا	دماغ،مغز
بَاکھقاٹے	پوپھٹتے ہی	بیر	بھائی
بِیرنی	بہن	بین نی	بہو،دُلہن
بانھ	ہاتھ	بیُر	دشمنی
بھاٹا	پتھر	بَیرہ	معلوم، پتہ ہونا
بِیران	پریشان	بالنا	جلانا
بِل باوَنی	راجستھانی زہریلی بلا	بانس	بُو
باس	چھوٹا سا گاؤں،محلّہ	بھانڈے	برتن
بنڑا	دولہا	بنڑی	دُلہن
بِی صورتا	بدصورت	بَٹھے	وہاں
بٹھَا	وہاں	بت	وہاں
بیجاں	وہاں	باَوڑکی	مُڑکر
بےسوادہ	بےمزہ	بوَلو،بوڑو	بہرہ
بنّہ	اُدھر	بینہ	اُس کو
باَچھڑَیا	بچھڑا	بڈیا۔بڈھیا	اچھا،بہترین
بِرج دیا	منع کردیا	بھاج	بھاگ
بھاگ	قسمت	بوَکلے مارنا	چیخ کررونا
بھَیلاَ	جمع	بِچار	خیال
بسرَانا	ردکرنا، برائی کرنا	بوَلہ	بہت
بچلا	درمیانہ	بھاوَ	ٹائفائیڈ
بوَدری	خسرہ	بھنورایابھنوری	خاندان کے بڑے بیٹے کی پہلی اولاد
بوَلی تڑیڑ	ٹیڑھی میڑھی دیوار	باچھڑیو	گائے کا بچہ/بچھڑا
بھایا	بھائی	باپڑا/باپڑو	بے چارہ، بغیر باپ کا (مونث) باپڑی

بَارِی	کھڑکی	بالک/بَال	بچہ، بالک
َباوڑی	سیڑھیوں وال کنواں، باوَلی	پلِھتین	ایندھن
بووَاری	جھاڑو	بھاؤ	پتھر، روڑا
بھار	وزن	بھاَنڈنا/بھانڈیو	بکنا، گالی دینا
بُوا	باپ کی بہن۔ پھوپھی	باَن	تیر
بَل	زور	بَاندر	بندر
َبانتھیِ گھالنا	بانہیں ڈال کر گلے لگنا	بِلگ کے	مل کر
بَورَا (سندھی میں بھی مستعمل ہے)	بہرا	بِی	بھی
بیرَ	لڑائی	تھورو	تھوڑا
بیرَی	دشمن	بُد	عقل
بَدھنا	بڑھنا	باَس	بُو (خوشبو)
بنڑَا/بنڑی	دلہا، دلہن	بَھنوَرجی	دولہا جی/محبوب

(پ، پھ)

پگہ بھاَنا	ننگے پاؤں	پُرکھاں۔ پُرکھ	بزرگوں
پَسرنا	پھیل کر بیٹھنا	َپدھارنا	تشریف لانا
َپانسلی	پسلی	پنچ	پنچایتی
پوُنچھ	دم	پگ	پاؤں
پُون	ٹھنڈی	پوُنچھڑی کا	آخر کا
پھوگاَلیو	راجستھانی پھول جس کے بیج کا رائتہ بنتا ہے	پھیَر	دوبارہ
پاَچھا	دوبارہ، مڑکر	پیڑَی	زینہ
پچھہ	بعد میں	پوُٹھا	گوبر
پاَکِی	پکی	پُوت	اولاد

پُور	کپڑے، پرانے کپڑے	پاسا	طرف داری
پا گوَ	پایہ چارپائی یا کرسی کا	پتّا	ورق، کاغذ، درخت کا پتا
پِچھاڑی	پیچھے۔عقب میں	پچھیتی	بعد میں پیدا ہونے والی لڑکی
پگ	پاؤں، قدم	پھڈا	لڑائی، جھگڑا
پھوڑا	تکلیف، پھنسی	پھیرَا	چکر لگانا
پیلیا	یرقان، بیماری	پرِیوار	خاندان
پھوُنکڑی	آگ دہکانے کے لیے گول آلہ	پانکھ	پر، پنکھ
پِھر مڑے	شادی کے بعد داماد کا پہلی بار سسرال آنا۔	پَل پل	لحظہ بہ لحظہ
پھاَٹ	پھٹ، بک	پدمٹی	خوب صورت
پرَے	دور	پَھانس	خلش (کانٹا)

(ت، تھ)

تاوَ	تپش	تولہَ چونٹی	بے چینی، مرچیں لگنا
تھاور	ہفتہ	تلہ	نیچے
تین پانچ	بحث	تَسلیو	چھوٹا تھال
تیں	پیاس	تھےَ	آپ
تھارَا	تمھارا	تھارو	آپ کا
تتاں	تجھے	تھاناں	تم کو
تاپ	بخار	تاتا/تاتو	گرم
تھِپڑی	اُوپلے (گائے کے گوبر کے)	تڑکے	کل۔صبح سویرے
تھڑا	تھلہ، چبوترہ	تَد	تب
تاوڑی	دھوپ		

(ٹ، ٹھ)

ٹھٹھہَ	مذاق	ٹینگر	بچے

نَیھَٹھ	آخر تک	ٹیکِر	برتن
ٹِبہ	ٹیلا	ٹابَر	چھوٹا بچہ
ٹانگا ٹولی	ڈانڈا ڈولی	ٹاَنگڑِی	ٹانگ۔ پاؤں
ٹبو۔ٹیبو	اونچی جگہ۔ٹیلا	ٹھُساَ	نخرہ،اکڑ
ٹُھونٹھ	ان پڑھ۔جاہل	ٹِیکڑی	ٹیلہ، چھوٹی پہاڑی
ٹھاَڈو	تنگڑا		

(ج۔جھ)

جاَس	ٹوہ	جڑَدے	بند کردے
جِیب	زبان	جیرہ باَجی	فضول بحث
جَلمنَا	پیدا ہونا	جابڑی	جبڑا
جَاڈُو	سردی	جِھریاَ	چھلنی
جَتَھاں	جہاں	جَاپاَ	زچگی
جاڈَا	سردی،ٹھنڈک	جاَیاَ	بیٹا،فرزن
جےَ وَڑِی	رسی کا ٹکڑا، ڈوری	جَد	جب

(چ۔چھ)

چاسنَا	جلانا، روشن کرنا	چوُرمَو	ملیدہ
چِیٹِیَو	سہارے کی لکڑی	چُوسَو	چوہا
چوَکھَو	اچھا	چوُنترَی	چبوترہ
چاَوَکرنا	باتیں بنانا (کسی پہ ہنسنا)	چاَنچگہ	اچانک
چاَکرَی	خدمت،نوکری	چِساَدے	جلادے
چوُماسا	ملیدہ۔چوری ہوئی چیز	چوماسا	بارش
چھانَڑا	چھجہ، مچان	چھاَچھ	لسی
چھاکٹا	چالاک	چِیپڑ	آنکھ کا میل
چڑ	بڑھ کر	چنگیری	روٹی رکھنے والا برتن

چھوَرا	لڑکا	چھورِی	لڑکی

(د۔دھ)

دِن اُگیاَ	صبح ہی صبح	دِنگیَہ	صبح
دِن چُھپَے	شام	دَھاپ	مطمئن ہونا، پیٹ بھر جانا
دَادِیرو	دودھیال	دَھوِلی	سفید
دَوپیری	دوپہر	دَھردَے	رکھ دے
دَھار	علیحدہ	دَاوَن	چارپائی
داپھَڑ	جلد کے پھپھولے	دَھورَے	پاس دُوجاَ دوسرا
دوجا	دوسرا	دَھانسی	کھانسی
ڈَربا	مرغیوں کا گھر	دَھولوَ	سفید، چٹا
دِھیرَا	آہستہ۔صبر و تحمل	دَھاک	اندیشہ
دِھی	بیٹی	داَدکاَ	دادا کا خاندان
دَھرتی	زمین	دَانڑوپاَنڑی	دانا پانی
دَائجا	جہیز	دَر	بالکل

(ڈ۔ڈھ)

ڈَانڈَا	چہاردیوار	ڈَانگ	ڈنڈا
ڈُھوِلیا	پلنگ	ڈھیَر	کھیت
ڈَانَس	مچھر	ڈَاکَن	ڈائن (نظر بد رکھنے والی عورت)
ڈُبکِی	غوطہ، پانی میں سر چھپانا	ڈَوِلی	کھیت کی منڈیر، دیوار
ڈَھور	مال مویشی	ڈَھگرَے	کولہے
ڈُونگَو	گہرا	ڈَٹ جا	مان جا/رک جا

(ر)

راَج	حکومت	رُوسَنا	روٹھنا
رَاجِی	خوشی	رَسوئی	باروچی خانہ

رُت	موسم	رِینٹلا	جس کی ناک بہتی ہو
رَولوَ	شور، ہنگامہ	رَاڑ	لڑائی۔جھگڑا
رَانڈِیا	نامراد، ناکارہ	رِیس	غصہ، ناراضگی، دیکھادیکھی
رَابڑِی	راجستھان کے کسانوں کا کھانا جو باجرے یا مکئی کے آٹے کو چھاچھ میں پکا کر تیار کرتے ہیں		

(س)

سُوَاد	مزیدار	سَانگرِ	راجستھانی سبزی (ایک پَھلی)
سِیک (سیکھ)	نصیحت	سَرپنچ	چیئرمین
سَدائیں	ہمیشہ	سُنڈی	ناف
سِلڑِی	سل	سَوٹی	ڈنڈی
سَنڈَاسی	برتن چولہے سے اتانے کی چمٹی	سُوگلا	جس سے کراہت آتی ہو
سَمَچار	خبریں	سِینچَا	اگایا
سَپُوت	فرمانبردار	سَین کرنا	اشارے کرنا
سَاسرا/ساسرو	سسرال	سُرُوپ	خوب صورت
سَاکھ	شہادت، گواہی	سَانگل	زنجیر، دروازے کی زنجیر
سَاسُو	ساس	سُسُرا	سسر، خسر
سَل	تکلیف	سُوں	قسم
سَوگند	قسم	سِنَف	ٹانگ میں درد کی لہر اٹھنا

(ش)

''ش'' کی آواز قائم خانی بولیوں میں موجود ہے مگر اس کا اظہار بالخصوص اس وقت ہوتا ہے جب یہ آواز لفظ کے درمیان میں واقع ہو لفظ کا پہلا حرف اگر ''ش'' ہوتا ہے تو یہاں کے لوگ اسے بالعموم ''س'' ہی بولتے ہیں۔مثلاً ''سیرؔ'' (حلوا) سور (شور) وغیرہ، البتہ خواندہ افراد کا تلفظ صحیح ہوتا ہے۔

(ک۔کھ)

کَجاں	کہاں	کٹھا	کہاں
کِت	کہاں	کھاٹ	چارپائی

کِواڑ	دروازہ	کَس کَر	زور سے کھینچ کر
کَورِی	خالی	کھَاٹو	کھٹا
کُونِی	کہنی	کَاکَو	چچا
کَاٹھو	گاڑھا۔مضبوط	کَدَّائی	کبھی کبھی
کَاگلو	کوا	کَالجو	دِل
کِھیرَہ	انگارہ	کھَندلی	چھوٹی گدی
کَال ئی	کل ہی	کُھڈَا	دڑبہ
کَسّی	پھاوَڑا	کَاچِی	کچی
کُھونسڑَا	جوتے	کنٹھ	گلے،گلا
کُوکُوپتڑی	شادی کی تاریخ مقرر کرنے کا رُقعہ	کُمیڑی	فاختہ، مینا
کَال	قحط	کَچّھا	نیکر
کَاچ	شیشہ	کَلیو۔کَلیوا	ناشتہ
کُن (کنڑ)	کون	کُنسو	کون سا
کَوتک	لڑائی رہنگامہ	کُچرنِی	شیطانی،شرارت
کَوتکِی	لڑائی کرنے والا	کَوتھلِی	تھیلی
کھوسَنا	چھیننا	کنا	پاس
کَاکَا	چچا (پنجابی۔چھوٹا بچہ)	کَاگلا/کَاگلَو (کَاگلِی)	کوا
کَالھ	کل	کِواڑ، کیوانڑ	دروازہ
کُترنِی	قینچی	کچِڑَا	پلاسٹک، نرم قسم کا
کَد	کس وقت، کب	کَسارِی	ایک قسم کا کیڑا
کَسِّی	زمین کھودنے کی چھوٹی پھاوڑی	کھَاج	کھجلی۔خارش
کَتھے	کس طرف، کس جگہ	کھُرنٹ	زخم یا پھوڑے کی اوپر کی خشکی
کھَنکھار	بلغم، کھانسنا	کھَوج	تلاش
کِیڑی	چیونٹی	کھُوتی	بدذات

لفظ	معنی	لفظ	معنی
کھوسن	لوٹنا	کد	کبھی
کتّی	کتنی	گیئس	بال
کرپان	تلوار	گاڑھی	کالی
کنّے	قریب	گالس	کالک
کھیرے	جلے ہوئے کوئلے		

(گ۔گھ)

لفظ	معنی	لفظ	معنی
گسیل	غصہ والا	گھونگٹو	گھونگھٹ
گاواں	گاؤں	گھانو	کوہلو، جہاں تیل نکالا جاتا ہے
گوڈو	گھٹنا	گھنی	زیادہ
گیل	پیچھے	گاڈا	ریڑھا،ٹھیلہ
گیلنا	پیچھے کی طرف	گھڑا	مٹکا
گومڑ ویا گومڑی	سوجا ہوا زخم، پھنسی	گا	گائے
گدگاوڑی	گدگدی	گٹ	ناریل
گھنداوڑا	جس سے گھن آئے	گیان	دھیان،توجہ
گھٹّی	نوزائیدہ بچے کو پہلی بار کچھ چٹانا	گادڑیا	گیدڑ
گیرنا	گرانا	گھالنا	ڈالنا
گھوچڑیا	پلے	گوڈلیاں چالنا	گھٹنوں کے بل چلنا
گودی	گود	گانٹھری	گانٹھ،چھوٹا گٹھا
گجر	پھولوں کا ہار، کلائی کا ایک زیور	گری	گودا،مغز
گھمڑی	چکر	گھوٹو	گھوٹنا
گوندڑو	لیسوڑا	گوکھرا	(دیوار) سیاں
گوت	خاندان	گھنڑی	بہت
گت	حالت	گوج	جیب

(ل۔لھ)

لُگائی	عورت	لَو ڈِیَو	سل کا بٹہ
لِیر لِیر	پیچھے پیچھے	لاَج	شرم،گھونگھٹ
لاَ دو	ملا، پایا	لاَ رَا/لا رو	بہانہ
لَپَڑ	تھپڑ	لَک	رغبت ۔ بہکاوا
لُونجی	اچار	لُونڑ	نمک
لُونڑِیَو	ایک قسم کا ساگ	لِیُری	کپڑے کی دھجی
لِیک	جوں کا انڈا۔ پکیر کا مخفف	لِیکھ	قسمت،لکھا ہوا

(م۔مھ)

مُوندھ	اُلٹا	مَچلِیا	کھٹولہ
مَاچَا	چارپائی	مُوتھَا	سرپھرا
مُونڈَو	منہ	مَوڈُو بکرو	بغیر سینگ کا بکرا
مُومَاکھی	شہد کی مکھی	ماکھی	مکھی
مَگرَ یاں	کمر	مَاتھو	پیشانی
مَورِی	کھڑکی	مَوکلو	بہت زیادہ
مَان	برابر	مَھارَا/مھارو	ہمارا
مَھیں/مَھے	ہم	منہک/منخ	انسان
مُوٹیار	آدمی،مرد	مِینڑَو	بارش
ماَڑی	اونچی بلڈنگ	مَسی روٹی	بیسن کی روٹی
ماَڑا	کمزور	ماَنک	برابر
میل دا	رکھ دے	مَتیرا	تربوز
مؤبھی	پہلا، پہلوٹی کا	مُوگری	تھاپی
مَوکھلو	سوراخ	مَاٹی	مٹی
مُوت	پیشاب	مَاپ	ناپ
ماجَو	آبرو	مَت	سوجھ بوجھ

مٹکو	مٹی کا گھڑا	مکوڑو/مکوڑا	چیونٹا
مَنّے	مجھے۔مجھ کو	مُونج	بان،گھاس کی ڈوری
مھانے/مھارا	ہم کو	میڑی	اوپر کی منزل
مینڈھ	نر بھیڑ،دنبہ(اردو مینڈھا)	مِنڈھی	بالوں کی گتھی ہوئی لٹ
مَان	عزت،تکریم	مَوتھا	بے وقوف
مچھی(سندھی میں بھی مستعمل ہے) مچھلی			

(ن۔ں)

نیڑا	نزدیک	ناڑو/ناڑا	ازار بند/کمر بند
نانیرو	ننھیال	ناگو،ناگی	ڈھیٹ،شرارتی
نیندراں باسی	نہار منہ	ناڑ	گردن
نچلا بیٹھ	خاموش ہو جا۔آرام سے بیٹھ	ناتو	رشتہ
ناڑا	کمر بند،ازار بند(اردو،ناڑا)	نال	زینہ۔بندوق کی نالی
نپوتو	بے اولاد	نچِت	فارغ
ناتھو	روٹی رکھنے کا کپڑا	نَٹ نا۔نٹ بو	انکار ہونا
نیوتا	بلاوا،دعوت	نولیو/نولیا	نیولا
نیارا	جدا،الگ	نیٹھ	بمشکل
نیمڑو	نیم کا درخت	نان کا(نانکا)	نانا کا خاندان
نکاسی	شادی کے لیے گھر سے رات کی روانگی کا جلوس		

(و)

وَاسطے میں	واقعی	واڑا،واڑی	محلّہ
وَاندا(سندھی میں بھی مستعمل ہے)	بے کار،فالتو	واں کو	ان کا
واں کی	ان کی	وَٹھے۔اوٹھے	وہاں۔اس جگہ
وَٹھی نے۔اوٹھی نے	اس طرف۔ادھر	وئی	وہی۔ہو بہو

(ھ)

ھلوان کو گوشت	چھوٹے بکرے کا گوشت	ھاڈ	ہڈی، ڈھانچہ
ہَلکت	عادت	ہَانسی	ہنسی
ہبَڑ دھبَڑ	جلد بازی	ہَنسلی	گلے کی گول ہڈی، گلے کا زیور
ہنُکارتا/ ہنکاریوں	ہاں کی آواز لگانا، اقرار	ہوش	غیر مہذب، اجڑ
ہرَ و برو	خوامخواہ		

(ی)

یَاس	دھیان	یا	یہ
یوَ	یہ	یا اٹھے، اٹھے	اس جگہ
یاں کو	اِن کا	یاں کی	اِن کی

قائم خانی بولی اور راجستھان کی دیگر بولیوں میں صرف ونحو کی قرابت نظر آتی ہے جس سے ان کی نسبی تعلق اور لسانی روابط کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ گو کہ تذکیر و تانیث، جمع واحد کے صیغوں میں کہیں کہیں فرق ہے مگر اتنا نمایاں نہیں ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کا اشتراک اور افعال و مصادر کی لفظی یگانگت، صرفی ونحوی اعتبار سے یہ بولی اب اردو کے زیادہ قریب ہے۔

(۵) قائم خانی بولی کا رسم الخط اور اس میں ہونے والی تبدیلیاں

زبان کے دو لباس ہیں آواز اور حرف یعنی تقریر اور تحریر بنیادی اور فطری آواز ہے جو انسان کے گلے اور منہ سے نکلتی ہے دوسرا حرف ہے جس میں لیٹ کر یہ زمانی اور مکانی فاصلے طے کرتی ہے یعنی مستقبل کے لیے محفوظ ہو جاتی ہے اور دور دراز کے مقامات تک لے جاتی ہے۔ آواز کو حرف پر اور تقریر پر ترجیح حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان بہت پرانے زمانے میں ایجاد ہوئی تھی۔ تحریر اس کے بعد کی ایجاد ہے۔ چناں چہ دنیا میں آج بھی ایسی بہت سے زبانیں یا بولیاں ہیں جو بولی جا رہی ہیں مگر لکھی نہیں جاتی۔ قائم خانی بولی کا بھی یہی معاملہ ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

> ''تقریر اندھیرے اجالے میں ہر وقت ممکن ہے اس کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے لیکن تحریر روشنی تک ہی محدود رہتی ہے اس کا سلسلہ تاریکی میں کٹ جاتا ہے۔ تقریر میں جن طریقوں (مثلاً لب ولہجہ، زور اور تاکید، آواز کا اتار چڑھاؤ، وقفہ اور تسلسل، جوش اور گرمی وغیرہ) سے تاثیر پیدا کی جاتی ہے وہ تحریر میں کام نہیں آسکتے۔ تقریر کو تحریر میں منتقل کرتے وقت زبان کو ہموار بنانے کی فکر میں اس کا بہت سا حصہ حذف کر دینا پڑتا ہے۔ جس سے فطری پن کی جگہ تصنع ابھر آتا ہے اور آواز میں جو زندگی کی گرمی ہوتی ہے حرف میں اس کی جگہ موت کی ٹھنڈک آجاتی ہے۔

آخری بات یہ کہ ''لپی'' زبان کی آوازوں کو پوری طرح گرفت میں نہیں لے پاتی۔حرف کا کوئی جامد زبان کے قد پر موزوں نہیں ہو پاتا یا اس میں کہیں جھول آجاتا ہے۔ یا وہ کہیں سے کس جاتا ہے۔آج تلکو ئی لپی زبان کوٹھیک ٹھیک قلم بند نہیں کر پایا یہی وجہ ہے کہ جب کوئی تحریر پڑھی جاتی ہے تو نہ زبان کا اصل تلفظ سننے کوملتا اور نہ ہی اس کی ابتدائی تاثیر ہی محسوس ہو پاتی ہے۔''۶۷

یہی وجہ ہے کہ جن زبانوں کا رسم الخط ہوتا ہے ان کا فطری پن اور تلفظ کا پتا چلتا ہے رسم الخط کے متعلق ڈاکٹر الانا اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

رسم الخط کے معنی ہیں لکھنے کا طریقہ،۔دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ کسی ملک یا علاقے میں مروج لکھائی یا'' لپی'' رسم الخط اور صورت خطی میں خاص فرق یہ ہے کہ صورت خطی پورے ملک کے لوگوں کے لیے ہوتی ہے بے شک وہ لوگ الگ الگ مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔صورت خطی پر ملک میں ہر قوم، ہر قبیلے اور ہر خطے کے لوگ اختیار کرتے ہیں اور اسے سرکاری حیثیت حاصل ہوتی ہے۔مگر رسم الخط کے لیے یہ شرط لازمی نہیں ہوتی۔''۶۸

جہاں تک قائم خانی بولی کے'' رسم الخط'' کا تعلق ہے تو الگ سے شناخت کے لیے اس بولی کا کوئی رسم الخط نہیں ہے۔ پاکستان میں یہ اردو ہی میں لکھی جاتی ہے اور راجستھان میں جہاں قائم خانی بولی جاتی ہے وہاں ہندی میں تحریر کی جاتی ہے جب کہ اس کے لہجے کو رسم الخط میں لکھنا مشکل ہے،اس کا تقریری روپ ہی اِس کی پہچان ہے۔واضح رہے کہ زبان کی تصہین میں تقریری روپ ہی معتبر ہوتا ہے،تحریری یا ادبی روپ نہیں،تحریری روپ میں کئی اسلوب ہو سکتے ہیں جن میں لفظیات کی حد تک ایک دوسرے سے کافی فرق ہوسکتا ہے۔۶۹

کسی زبان کی بقا اور تحفظ کے لیے رسم الخط کی اہمیت کا انکار ممکن نہیں لیکن جب معاملہ زبان کے ابتدائی ایام میں اس کی تعمیر وتشکیل کا ہو تب رسم الخط کی اہمیت ثانوی ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر فیروز احمد کی رائے میں:

''راجستھانی کا رسم الخط فارسی نہیں بلکہ ناگری ہے جس میں موجودہ ہندی لکھی جاتی ہے۔اگرچہ بعض مورخین ادب، مارواڑی (راجستھانی کی قدیم شکل) کے لیے سدھ ماترک خط کا بھی ذکر کرتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ اس کا نام کا اگر کوئی رسم الخط تاریخ کے کسی دور میں تھا تو وہ رائج نہیں ہو سکا،البتہ اس رسم الخط کی ایک بڑی خصوصیت یعنی اس کا بائیں جانب سے لکھے جانے کا طریقہ قائم رہا جسے سنسکرت کی طرح ناگری نے بھی اپنالیا اور یہی رسم الخط راجستھان کے لیے بھی مختص کر دیا گیا جب کہ ہندآریہ زبان ہونے کے باوجود اردو رسم الخط فارسی رہا۔''۷۰

مارواڑی بولی کا رسم الخط مشکل ہونے کی وجہ سے اب ہندوستان میں قائم خانی ہندی رسم الخط ہی کو اپناتے ہیں جب کہ'' مارواڑی زبان ناگری (ہندی) رسم الخط میں لکھی جاتی ہے مگر اس کے لیے بڑی محنت درکار رہے۔یہ ہندی رسم الخط کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔محمد اسحاق صدیقی رقم طراز ہیں:

''راجستھانی کی تمام بولیوں کے لیے دیوناگری بطور ادبی رسم الخط کے استعمال کیا جاتا تھا روزمرہ کے کاموں کے لیے مارواڑی خط کام آتا ہے۔

اس خط کا ماخذ کیتھی خط ہے تلفظ کے معاملے میں اس میں کوئی احتیاط نہیں برتی جاتی زورنویسی کے خیال سے ماتراؤں کو بھی اڑا دیا جاتا ہے لہذا یہ شارٹ ہینڈ کا کام دیتا ہے۔اس کے پڑھنے میں کبھی کبھی بڑی دشواری واقع ہوتی ہے۔مشہور قصہ ہے کہ ایک مارواڑی تاجر کلکتہ گیا اس کے منشی نے گھر خط لکھا:

''باپوا جمیر گیو، بڑی بہی بھیجد یئے'' لیکن خط کو یوں پڑھا گیا: ''باپو آج مر گیو بڑی بہو بھیج دیجیے چناں چہ گھر پہ رونا پیٹنا شروع ہو گیا بعد میں جب حقیقت حال معلوم ہوئی تو احساس ندامت ہوا (یہ بات راجستھان میں لطیفہ کے طور پر مشہور ہے)۔''اے

راجستھان کا ایک رسم الخط (لپی) مریا بھی ہے جس کا اب صرف نام رہ گیا ہے۔یہ رسم الخط بغیر ماترائیں لگائے تحریر کیا جاتا تھا۔۲ے

راجستھان میں اردو کی مقبولیت و ترویج کے سبب مقامی بولیوں اور زبانوں کے بے شمار الفاظ ہیں جو اب راجپوتانہ کے خطے اور کسی علاقے کے لیے اردو اجنبی نہیں رہی۔دورِ قدیم ہی میں بعض ریاستوں کی دفتری زبان فارسی ہو گئی تھی جو بعد ازاں اردو میں تبدیل ہو گئی۔راجستھانی بولیوں میں (جو الفاظ بول چال کی حد تک محدود تھیں) اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ نئی زبان کا راستہ روکتیں اور پھر اردو وہاں کے لوگوں کے لیے کوئی نامانوس زبان بھی نہ تھی اس کے حروف تہجی میں تقریباً سب مقامی بولیوں کی آوازیں تھیں نتیجہ یہ ہوا کہ یہ زبان راجستھان کے شہروں اور قصبوں میں پھیلتی چلی گئی ہندو اسے ناگری اور مسلمان فارسی رسم الخط میں لکھنے لگے۔

سید سلمان ندوی لکھتے ہیں:

''راجپوتانہ میں اجمیر شہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ سارے کا سارا اردو بولتا ہے اس کی ریاستوں کی سرکاری زبان اردو ہی ہے۔وہاں کے رہنے والے یا تو ٹھیٹ ہندوستانی بولتے ہیں یا ایسی بولیاں جو ہندوستانی سے بالکل ملتی جلتی ہیں اور دہلی کے اثر سے متاثر ہیں ٹونک کی مادری زبان اردو ہے وہاں کے نواب و امراء اس زبان کے شاعر ہوئے ہیں دوسری ریاستوں میں بھی ہماری زبان کا سکہ چلتا ہے جے پور میں یہ بولی جاتی ہے ریاست کے محکمہ تعلیمات نے تمام سرکاری اور امدادی مدرسوں میں اردو کی تعلیم کو لازمی قرار دیا ہے۔مارواڑ وغیرہ میں بھی جو مقامی بولیاں ہیں وہ ہندوستانی ہی کی ایک قسم ہے گو لہجہ میں اس سے کڑی۔''۳ے

مارواڑی بولی میں اچھا خاصا ادبی ذخیرہ بھی ہے جو ڈنگل ادب کہلاتا ہے۔مگر اب یہ مارواڑی رسم الخط کے بجائے ہندی رسم الخط میں موجود ہے۔چناں چہ ہندوستان میں رہنے والے قائم خانی رسم الخط میں دیوناگری رسم الخط کا استعمال کرتے ہیں۔اس مطالعے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ قائم خانی بولی راجستھانی بولی کی ذیلی بولی (Sub-Dialect) ہے دراصل ہم کسی ایک بولی سے اس کا رشتہ متعین نہیں کر سکتے تاہم یہ راجستھانی بولیوں میں مارواڑی سے قریب ہے۔مگر جہاں جہاں قائم خانی آباد رہے وہاں کا لہجہ اور ذخیرۂ الفاظ بھی اُن

کی بولی میں شامل ہوتے رہے۔

حواشی:

۱۔ ڈاکٹر سہیل بخاری، ''تشریحی لسانیات''، فضلی سنز لمیٹڈ، اردو بازار، کراچی ۱۹۹۸ء۔ ص ۱۳۔

۲۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ''پاکستانی زبانیں، تحتی بولیاں اور قومی یک جہتی''، مجلّہ ''تحقیق''، شمارہ نمبر ۱۶، شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، جام شورو، ۲۰۰۸ء، ص ۵۳۔

۳۔ پروفیسر احتشام حسین، ''ہندآریائی مسلمانوں کی آمد سے پہلے''، مجلّہ: اردوئے معلّٰی، لسانیات نمبر، جلد سوم، شمارہ نمبر ۴۔۵، دہلی، ص ۲۷۔

۴۔ بحیرہ روم کی جانب سے ہجرت کر کے آئے۔

۵۔ آسٹرک اور نگریٹو دونوں گروہوں کی زبانیں کیا تھیں یا انھوں نے قدیم ہندآریائی زبانوں پر کیا اثر ڈالا اس بابت معلومات نہیں ملتی۔

۶۔ ارشد بن یافث بن حضرت نوح علیہ السلام۔

۷۔ ابوالقاسم فرشتہ، ''تاریخ فرشتہ، مطبوعہ نولکشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۳ء، ص ۱۲۔

۸۔ احتشام حسین، مضمون، ''ہندآریائی مسلمانوں کی آمد سے پہلے''، ص ۲۷

۹۔ سراج الحق میمن، ''سندھی بولی''، روزانو ھلال پاکستان کراچی، ستمبر ۱۹۸۳ء، ص ۱۱ تا ۱۷۔

۱۰۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی، ''نقوش سلیمانی''، مطبوعہ کلیم پریس، کراچی، ۱۹۵۱ء، ص ۳۴۷۔

۱۱۔ عین الحق فرید کوٹی، مضمون ''وادی سندھ میں دراوڑی زبان کی باقیات'' اردو نامہ کراچی، شمارہ نمبر ۱۶، ۱۹۶۳ء میں بہت سے الفاظ درج کیے ہیں۔ جو ہندآریائی زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔

۱۲۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، ''سندھی بولی جی ادبی تاریخ''، حیدرآباد، سندھ، ۱۹۸۰ء، ص ۱۱۔

۱۳۔ ڈاکٹر محی الدین زور قادری، ''ہندوستانی لسانیات''، طبع سوم، مکتبہ معین الادب، لاہور ۱۹۶۱ء، ص ۷۔

۱۴۔ ''کول''، بھیل مقامی افراد انھیں ''کولی'' کہتے ہیں۔

۱۵۔ ڈاکٹر گیان چند جین، ''تاریخ ادب اردو'' دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۷۔

۱۶۔ ڈاکٹر عزیز انصاری، ''اردو اور راجستھانی بولیاں''، حرا فاؤنڈیشن، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۶۷۔

۱۷۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، ''اردو زبان کا ارتقاء''، ڈھاکہ پاک کتاب گھر، ۱۹۵۶ء، ص ۱۰۵۔

۱۸۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی، ''نقوش سلیمانی''، مطبوعہ کلیم پریس، کراچی، ۱۹۵۱ء، ص ۲۵۔

۱۹۔ ڈاکٹر گیان چند جین، ''تاریخ ادب اردو''، ص ۲۱۔

۲۰۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان، ''مقدمہ تاریخ زبانِ اردو''، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۴ء، ص ۵۵۔

۲۱۔ ڈاکٹر فیروز احمد، ''راجستھانی اور اردو''، گلوبل کمپیوٹرس، راج گنج بازار، جے پور، ۲۰۱۰ء، ص ۳۴۔

۲۲۔ مرزا خلیل بیگ، ''اردو زبان کی تاریخ''، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۹۰ء، ص ۱۳۱۔

۲۳۔ ڈاکٹر فیروز احمد، ''راجستھانی اور اردو''، ص ۴۱۔

۲۴۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی، ''نقوش سلیمانی، ص ۲۳۔

۲۵۔ ڈاکٹر گیان چند جین، ''عام لسانیات''، اشاعت دوم، قومی کونسل برائے فروغ ادب اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۶۴۔

۲۶۔ ڈاکٹر روَف پاریکھ، ''پاکستانی زبانیں، تحتی بولیاں اور قومی یک جہتی''، ص ۵۴۔

۲۷۔ ڈاکٹر عزیز انصاری، ''اردو اور راجستھانی بولیاں''، ص ۵۷۔

۲۸۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے: ڈاکٹر فیروز احمد کی تصنیف ''راجستھان اور اردو''، ص ۳۲۔

۲۹۔ ڈاکٹر دشرتھ شرما، ''قائم خان راسا'' (ہندی مقدمہ) راجستھان اورینٹل پریس، جودھپور، ۱۹۸۳ء، ص ۸۔

۳۰۔ اس سے متعلق ڈاکٹر عزیز انصاری نے اپنے مقالے: ''اردو اور راجستھانی بولیاں'' میں ایک چارٹ دیا ہے۔

۳۱۔ نذیر فتح پوری، ''اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر''، اسباق پبلی کشینز، پونے، ۲۰۱۱ء، ص ۲۱۱

۳۲۔ ان علاقوں میں کئی بولیاں اور لہجے ہیں مگر تعداد اور رقبے کے اعتبار سے مارواڑی یہاں کی اہم بولی ہے۔

۳۳۔ اس زبان پر پنجابی، ہریانوی اور برج کے اثرات ہیں۔

۳۴۔ یہ بولی میں میواتی، میواڑی، ڈھونڈھاری، ہاڑوتی کا امتزاج ہے۔

۳۵۔ ڈاکٹر فیروز احمد، ''راجستھانی اور اردو''، ص ۳۳۔

۳۶۔ نثار احمد خانزادہ ایڈووکیٹ، ''خان زادہ بولی''، تحقیقی مضمون، الزبیر (سہ ماہی) شمارہ نمبر ۱-۲، تحقیقی وتنقیدی مجلّہ، اردو اکیڈمی بہاول پور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۴۴ تا ۱۵۳۔

۳۷۔ محبوب علی خان، ''تاریخ قوم قائم خانی''، مترجم: حاجی کپتان مظہر خان، پبلشر پرنٹرز الائیڈ پریس حیدر آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۳۲۸۔

۳۸۔ ڈاکٹر مینا ریا، ''ڈنگل میں ویرس''، ہندی، راجستھان اورینٹل پریس، جودھپور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۰ تا ۱۵۔

۳۹۔ ڈاکٹر ہیرالال مہشوری، ''راجستھانی بھاشا اور ساہتیہ'' کلکتہ، ۲۰۰۶ء، ص ۷

۴۰۔ ایضاً، ص ۳۴۔

۴۱۔ ڈاکٹر فیروز احمد، ''راجستھانی اور اردو''، ص ۴۰۔

۴۲۔ یہ سنسکرت کے لفظ راسک سے نکلا ہے۔ اس کے لفظی معنی نرگکی کے ہیں یہ ایک طرح کا رقص ہوتا ہے جو ایک دائرہ کی شکل میں کیا جاتا ہے ہر رقاص کے ہاتھ میں دو چھوٹے چھوٹے ڈنڈے ہوتے ہیں اور اسے آپس میں ٹکرا کر تال پیدا کی جاتی ہے اس طرح اس کو گایا جاتا ہے، راجستھانی، قائم خانی، گجراتی اور کچھی بولی میں اس کو ''راسوار'' بھی کہتے ہیں۔

۴۳۔ ڈاکٹر نذیر فتح پوری، ''اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر''، اسباق پبلی کیشنز، پونے، ۲۰۱۱ء، ص ۶۱۔

۴۴۔ ڈاکٹر فیروز احمد، ''راجستھانی اور اردو''، ص ۵۹۔

۴۵۔ ڈاکٹر نذیر فتح پوری، ''اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر''، ص ۶۱۔

۴۶۔ ڈاکٹر دشرتھ شرما، ''قائم خان راسا''، ص ۷۔

۴۷۔ ڈاکٹر فیروز احمد، ''راجستھانی اور اردو''، ص ۶۱ تا ۶۳۔

۴۸۔ ڈاکٹر نذیر فتح پوری، ''تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی''، پونہ، ۲۰۰۳ء، ص ۵۳۔

۴۹۔ حکیم مولوی عبدالشکور، ''تاریخ میؤ چھتری''، مرتبہ: حکیم اجمل خان، دہلی، ۱۹۷۴ء، ص ۱۴۳۔

۵۰۔ ڈاکٹر فیروز احمد، ''راجستھانی اور اردو''، ص۱۶۔
۵۱۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، ''اردو سندھی کے لسانی روابط''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص۱۹۸۔
۵۲۔ یعنی دو ہم وزن لفظوں میں کسی ایک آواز کے اختلاف سے معنی کا اختلاف پیدا ہو جائے اس کی مثالیں اور مواد شرف الدین اصلاحی کی تصنیف سے مدد لی گئی ہے، ص۱۹۵ تا ۲۰۰۔
۵۳۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ''جامع القواعد''، حصہ صرف، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص۲۳۳۔
۵۴۔ یہاں خفیف سی آواز ''ڑ'' کی نکلے گی، قدیم اردو میں بھی کھانڑا کا استعمال ملتا ہے۔
۵۵۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ''جامع القواعد''، حصہ صرف، ص۲۴۰۔
۵۶۔ مولوی عبدالحق، ''قواعد اردو''، لاہور، ۱۹۵۸ء، ص۵۶۔
۵۷۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، ''اردو زبان کا ارتقاء''، پاک کتاب گھر، ڈھاکہ، ص۱۸۷۔
۵۸۔ جودھپور (راجستھان ہندوستان) کے قائم خانی افراد ماسٹر کی جمع بناتے ہوئے ماسٹراں بھی کہتے ہیں۔
۵۹۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ''جامع القواعد''، حصہ صرف، ص۳۴۹۔
۶۰۔ اردوئے قدیم میں ''وے'' بجائے ''وہ'' جمع ضمیر غائب حالت فاعلی میں اور انھوں کا بجائے ان کا استعمال ہوتا تھا۔ یہی فرق قدیم اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے: مولوی عبدالحق ''قواعد اردو''، ص۳۷۔
۶۱۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ''جامع القواعد''، حصہ صرف، ص۳۱۶۔
۶۲۔ کہیں کہیں یہ ''کو، کی'' یا ''رو، ری'' بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کہ ہنگو کے قائم خانی۔
۶۳۔ مولوی عبدالحق، ''قواعد اردو''، لاہور، ۱۹۵۸ء، ص۱۱۲۔۱۱۳۔
۶۴۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوی، ''براہوی اور اردو کا تقابلی مطالعہ''، براہوی اکیڈمی پاکستان، کوئٹہ، ۱۹۷۹ء، ص۳۹۲۔
۶۵۔ مرزا قلیچ بیگ، ''سندھی ویاکرن'' (سندھی) حصہ۳، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد، ۱۹۶۰ء، ص۲
۶۶۔ ڈاکٹر غلام علی الانا، ''سندھی بولی جو ابیاس'' (سندھی) سندھیالوجی سندھ یونیورسٹی، جام شورو، ۲۰۰۵ء، ص۱۸۵۔
۶۷۔ ڈاکٹر سہیل بخاری، ''تشریحی لسانیات''، فضلی سنز، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص۳۱۔
۶۸۔ ڈاکٹر غلام علی الانا، ''سندھی بولی جو ابیاس''، ص۲۰۵۔
۶۹۔ ڈاکٹر گیان چند جین، ''اردو کے آغاز کے نظریے'' (مضمون) مشمولہ اردو زبان کی تاریخ، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۹۵ء، ص۴۱۔
۷۰۔ ڈاکٹر فیروز احمد، ''راجستھانی اور اردو''، ص۱۱۰۔
۷۱۔ محمد اسحاق صدیقی، ''فنِ تحریر کی تاریخ''، مطبوعہ ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، ص۳۳۲۔
۷۲۔ بانغ علی شوق، ''راجستھانی زبان وادب''، ص۲۷۔
۷۳۔ مولانا سید سلیمان ندوی، ''نقوش سلیمانی''، ایڈیشن ۵، مطبوعہ کلیم پریس کراچی ۱۹۵۱ء، ص۱۲۳۔

۔ فہرستِ اِسنادِ محولہ:

۱۔ احمد، فیروز، ڈاکٹر: ۲۰۱۰ء ''راجستھانی اور اردو''، گلوبل کمپیوٹرس راج گنج بازار، جے پور، راجھستان۔
۲۔ اصلاحی، شرف الدین، ڈاکٹر: ۱۹۷۶ء ''اردو اور سندھی کے لسانی روابط''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور۔
۳۔ الانا، غلام علی، ڈاکٹر: ۲۰۰۵ء ''سندھی بولی جو ابیاس''، سندھیالوجی سندھ یونیورسٹی، جامشورو۔
۴۔ انصاری، عزیز، ڈاکٹر: ۲۰۰۰ء ''اردو اور راجھستانی بولیاں''، حرا فاؤنڈیشن، کراچی۔
۵۔ بخاری، سہیل، ڈاکٹر: ۱۹۹۸ء، ''تشریحی لسانیات''، فضلی سنز لمیٹڈ، اردو بازار، کراچی۔
۶۔ براہوی، عبدارحمان، ڈاکٹر: ۱۹۷۹ء ''براہوی اور اردو کا تقابلی مطالعہ''، براہوی اکیڈمی پاکستان، کوئٹہ۔
۷۔ بلوچ، نبی بخش، ڈاکٹر: ۱۹۸۰ء، ''سندھی بولی جی ادبی تاریخ''، زیب ادبی مرکز، حیدرآباد۔
۸۔ بیگ، قلیچ مرزا: ۱۹۶۰ء، ''سندھی ویا کرن''، حصہ سوم، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد۔
۹۔ بیگ، خلیل احمد، مرزا: ۱۹۹۰ء، ''اردو زبان کی تاریخ''، مطبوعہ ترقی اردو ہند، علی گڑھ۔
۱۰۔ خان، مسعود حسین، ڈاکٹر: ۱۹۵۴ء ''مقدمہ تاریخ زبانِ اردو''، آزاد کتاب گھر، دہلی۔
۱۱۔ خان، علی محبوب: ۱۹۸۵ء، ''تاریخ قوم قائم خانی''، مترجم، حاجی کپتان مظہر خان، مطبع پرنٹرز الائیڈ پریس، حیدرآباد۔
۱۲۔ دشتھ، شرما، ڈاکٹر: ۱۹۸۳ء ''قائم خان راسا'' راجھستان اورینٹل پریس، جودھ پور۔
۱۳۔ زور، محی الدین، قادری: ۱۹۶۱ء ''ہندوستانی لسانیات''، مطبوعہ مکتبہ معین الادب، لاہور۔
۱۴۔ سبزواری، شوکت، ڈاکٹر: ۱۹۵۶ء ''اردو زبان کا ارتقاء''، پاک کتاب گھر، ڈھاکہ۔
۱۵۔ شوق، علی، باغ: ۱۹۹۲ء ''راجھستانی زبان وادب''، راجھستان ادب سبھا گز درآباد، چوہان اسٹریٹ، کراچی۔
۱۶۔ صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر: ۲۰۰۴ء ''جامع القواعد'' (حصہ صرف)، اردو سائنس بورڈ، لاہور۔
۱۷۔ صدیقی، محمد اسحاق: ۱۹۶۲ء ''فن تحریر کی تاریخ''، مطبوعہ ترقی اردو ہند، علی گڑھ۔
۱۸۔ عبدالشکور، حکیم، مولوی: ۱۹۷۴ء ''تاریخ میؤ چھتری''، مرتبہ: حکیم اجمل خان، مطبع جمال پریس، دہلی۔
۱۹۔ عبدالحق، مولوی: ۱۹۵۸ء ''قواعد اردو''، اکیڈمی سرکلر روڈ، لاہور۔
۲۰۔ فتح پوری، نذیر، ڈاکٹر: ۲۰۱۱ء ''اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر'' اسباق پبلی کشینز، پونے۔
۲۱۔ فرشتہ، ابوالقاسم: ۱۹۳۳ء ''تاریخ فرشتہ، مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ۔
۲۲۔ گیان چند جین، ڈاکٹر: ۱۹۹۸ء ''تاریخ ادب اردو''، جلد اول، مطبوعہ دہلی پریس، دہلی۔
۲۳۔ گیان چند جین، ڈاکٹر: ۲۰۰۳ء ''عام لسانیات''، اشاعت دوم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی۔
۲۴۔ مہشوری، ہیرالال، ڈاکٹر: ۲۰۰۶ء ''راجستھانی بھاشا اور ساہیتہ'' کلکتہ۔
۲۵۔ مینار یا، ڈاکٹر: ۲۰۰۰ء ''ڈنگل میں ویرس''، ہندی، راجستھان اورینٹل پریس، جودھپور۔
۲۶۔ ندوی، سلیمان، سید مولانا: ۱۹۵۱ء ''نقوش سلیمانی''، ایڈیشن ۵، مطبوعہ کلیم پریس کراچی۔

ABSTRACTS

The Religious Literature of 19th Century.

18th century has remained an important century for the Islamic Nation. The downfall of the greatest Moghal Empire that was at its peak in Aurang Zaib Alamgir time in sub-continent is the greatest tragedy of our history. The decline of Moghal Empire was not a fall of Government, but also of Muslims culture and civilization and even the very existence of Muslims themselves. After the demise of Aurang Zaib Alamgir in 1707A.D his sons were each others throat resulting in is fighting that provided opportunity to Marhatas, Jats, Sikhs and others to occupy territory of the Moghal Empire. It resulted in Chaos in the society and the moral fabric of the once well organized and disciplined Muslim culture and civilization was torn to pieces.

This decline of the Moghals also resulted in economic chaos leaking to the disruption in moral values. Moral turpitude reached its climax. However, in this darkness, group of seriously Concerned and conscientious Muslim citizen came forward to stop this plight. Most prominent among them was Shah Waliullah Dehalvi, who led the fight for renaissance of the Muslims of India, persuading masses to follow Islam in its true spiritual teachings.

He translated the Quran in Persian, wrote a number of books on tafseer and established Madarsas to spread Islamic teachings. Shah Walliullah, his sons Shah Rafiuddin as well Shah Abdul Qadir who also translated Quran in Urdu, contributed through their writings. Shah Walliullah movement letar joined by Syed Ahmed Shaheed and Shah Ismail who authored the famous "Mansab-e-Imamat"

Besides these outstanding leaders, a large number of contributions were also penned by a number of authors listed here.

برکت اللہ خان

اٹھارہویں صدی میں دینی ادب

اٹھارہویں صدی سیاسی، معاشرتی اور معاشی کشمکش کی صدی ہے۔ ارقبے، آبادی اور دولت کے اعتبار سے ایک عظیم سلطنت قائم تھی جس کا شہنشاہ اسّی سالہ اورنگ زیب عالمگیر تھا۔ خود برعظیم کی تاریخ میں اس سے پہلے ایسی سلطنت وجود میں نہیں آئی تھی۔ مغلوں

نے برعظیم کو نہ صرف سیاسی اتحاد سے روشناس کر کے ایک نیا قومی تصور دیا بلکہ ایک وسیع تہذیبی ہم آہنگی پیدا کر کے ایسا سیاسی وتہذیبی ڈھانچہ بھی تیار کیا تھا جس میں معاشرے کی تخلیقی وفکری صلاحیتیں پھل پھول سکیں۔

سترہویں صدی اس تہذیب کا نقطۂ عروج ہے اور اٹھارہویں صدی اس عظیم سلطنت کے زوال کی داستان ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) اس صدی کا پہلا اور سب سے اہم واقعہ ہے جس کے بعد پچاس سال کے عرصے میں نااہل جانشینوں کی بے طاقتی، خانہ جنگی، عیش پرستی، امراء کی باہمی آویزش، عسکری قوت کی کمزوری اور سلطنت کے وسیع تر مفادات میں اتحاد کے جذبے کے فقدان نے اس وسیع وعریض سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس کے بعد جو انتظامی حکومتیں قائم ہوئی تھیں وہ انتظامی صلاحیت سے عاری اور امراء کے ہاتھوں کٹھ پتلی تھیں۔ سلطنت کا توازن بگڑ تا گیا، دبی ہوئی منفی قوتیں سر اُٹھانے لگیں اور انتشار کے بادل معاشرے پر چھانے لگے۔ یوں تو کسی شخصی حکومت کے بدلنے کا عوام پر بہت کم اثر ہوتا ہے لیکن مغل حکومت کا زوال درحقیقت عوام کا زوال تھا۔ جو مصیبت مغل بادشاہوں پر آئی تھی اس کا اثر امراء ورؤسا سے لے کر عوام الناس تک سب پر برابر پڑا اور مسلم ہندوستان کے تہذیب، تمدن اور ذہن وفکر کے تمام شعبے براہ راست یا بالواسطہ اس سے متاثر ہوئے۔

مغل حکومت کے زوال کا سب سے واضح نتیجہ اقتصادی بدحالی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ مرہٹے، جاٹ، سکھ، روہیلے اور آخر میں انگریز سلطنت کے اچھے خاصے علاقے پر قابض ہو گئے۔ بیرونی حملہ آوروں نے قلعے کا خزانہ اور امرا ورؤسا کی حویلیاں بالکل خالی کر دیں۔ بادشاہ اور شہزادے مفلسی کا شکار ہو گئے۔ اس صورت حال میں عوام کی اقتصادی بدحالی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ شاہی خزانے میں روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے مہینوں اور بعض اوقات برسوں سپاہیوں کو تنخواہیں نہیں ملتی تھیں:

> شہنشاہ اکبر کے زمانے میں محلات شاہی کے ساز وسامان کی فہرست بنا کر دوکانداروں کو دے دی گئی تھی تا کہ اس کو فروخت کر کے سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کر دی جائیں۔[۲]

تاریخ عالمگیر ثانی میں لکھا ہے کہ:

> فوجیوں نے تنگ آ کر اپنے گھوڑے بیچ دیئے تھے، پیدل فوج کے پاس وردیاں نہ رہی تھیں، جانوروں کو چارہ نہ ملتا تھا اور وہ بھوک سے مرنے لگے تھے، فوجی اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے تھے بعض اوقات سپاہی سواری کی ہمراہی میں بھی نہ ہوتے تھے۔[۳]

اقتصادی بدحالی اور معاشی پریشانیوں میں اخلاقی قدروں کی پابندی کا ہوش نہیں رہتا۔ چنانچہ شریفانہ اخلاق وخصائل کم ہوتے گئے اور خودغرضی، حرص اور بددیانتی کا چلن عام ہونا شروع ہوا۔ ملک بھر میں عموماً اور دہلی ونواح میں خصوصاً بے چینی اور پریشان حالی کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ لوگ اپنی جان اور عزت بچانے کے لیے دہلی سے بھاگنا شروع ہو گئے۔ خصوصاً اہل ہنر سرپرستوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ معاشرے کے اس انتشار کا ردعمل لوگوں پر مختلف صورتوں میں ظاہر ہوا۔ ایک طبقے نے مادی دنیا اور اس کی آلائشوں سے منہ موڑ کر عالم آخرت کی طرف توجہ کی اور مذہب کا سہارا لے کر انفرادی نجات کی فکر میں لگ گیا۔

دوسرے نے دین اور عاقبت کے خیال سے بے نیاز ہوکر حسیاتی و جمالیاتی لذتوں میں پناہ ڈھونڈی (بعضوں نے ان دونوں کشتیوں میں بیک وقت سواری کرنے کی کوشش کی)۔ تیسرے نے حالات کے خلاف احتجاج کیا اور اپنے معاصرین کو ان کی برائیوں کی طرف توجہ دلائی۔ اور چوتھے نے محض احتجاج پر اکتفا نہ کرکے اصلاح احوال کی عملی کوشش کی۔ ان مصلحین کے سرکردہ شاہ ولی اللہ دہلوی تھے جو عالمگیری دور کے ممتاز عالم شاہ عبدالرحیم کے فرزند تھے۔ وہ ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے اور اپنے والد کی وفات پر سترہ سال کی عمر میں ان کے جانشین بن کر درس وتدریس میں مصروف ہوگئے۔ پھر حج کو گئے اور وہاں سے وطن واپس آکر ۱۷۳۲ء میں درسیات کے محدود حلقے سے قدم باہر نکالا۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کو اسلامی علوم کے مختلف شعبوں میں تربیت دے کر درس وتدریس کے کام پر مامور کردیا اور خود جہاد بالقلم میں مصروف ہوگئے تاکہ مسلمانانِ ہند کو مذہبی واخلاقی درماندگی سے نجات دلائیں۔

(۱)

شاہ ولی اللہ نے ایک ایسے مسلم معاشرے کا تصور پیش کیا جس میں لوگ انفعالیت کی شکار دنیا سے بےزار اور سلبی رویے کے قائل تھے اور نہ صرف اپنے انفرادی اور اجتماعی فرائض اور ذمہ داریوں کو بھلا کر عیش وعشرت میں غرق تھے بلکہ اس معاشرے میں لوگ منظم، مستعد، فرض شناس، قانون پسند اور محنت سے روزی کمانے کے خواہش مند تھے۔ وہ معمولی اور غیراہم یا کتابی باتوں پر ایک دوسرے سے برسرپیکار نہ تھے اور دنیوی اُمور میں افراط وتفریط اور عبادت و ریاضت میں مبالغے سے اجتناب کرتے تھے۔ اس معاشرے میں حکمران طبقہ فہیم اور عدل پسند تھا۔ وہ عوام کے استحصال کو جرم سمجھتا تھا اور انتظامی اُمور کی بجا آوری میں دیانت داری اور فرض شناسی سے کام لیتا تھا۔

مختصراً یہ کہ شاہ ولی اللہ نے ایک متوازن اسلامی معاشرے کا تصور پیش کیا اور اسے روبہ عمل لانے کی کوشش کی۔ اُن کے نزدیک اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے ضروری تھا کہ لوگ صحیح قرآنی تعلیمات اور صحیح احادیث نبوی سے واقف ہوں۔ قرآن شریف کو محض دینی فریضے کے لیے پڑھنا اور بات ہے اور اس کی ہدایت سے براہ راست مستفید ہونے کی کوشش کرنا اور بات۔ انھوں نے قرآنی تعلیمات کو عام کرنے کی خاطر کلام اللہ کا فارسی میں ترجمہ کیا اور ترجمے کے ساتھ ایک مقدمہ بھی لکھا جس میں مترجمین کی رہنمائی کے لیے مفید ہدایات دیں۔ آپ نے علم تفسیر پر بھی کتابیں لکھیں اور روایات اسرائیل اور رسوماتِ جاہلیت کے سلسلے میں صحیح رہنمائی کی۔ مسلمانوں کی اخلاقی وروحانی اصلاح کے لیے قرآن شریف کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے قابل فہم بنا دینے کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب نے احادیث نبوی کے مستند مجموعے ''مؤطا'' کی فارسی شرح لکھی اور حدیث کی تعلیم کے لیے علاحدہ مدرسہ قائم کیا۔ آپ نے جہاد کی اہمیت، اس کے احکامات اور ضروریات پر ایک مفصل رسالہ لکھا اور عہدِ انحطاط کے اس نظریے کی تردید کی کہ آئندہ اعلیٰ درجے کے دین دار پیدا نہیں ہوں گے۔ فقہ میں شاہ صاحب نے یہ مسلک اختیار کیا کہ چاروں اماموں کو معتبر جانا اور کہا کہ اگر علماء کسی مصلحت کی بنا پر ان آئمہ کرام میں سے کسی ایک کا قول اختیار کریں تو بالکل جائز ہوگا۔ اعتدال کی یہ راہ اختیار کرکے شاہ ولی اللہ نے اہل سنت کے تمام اختلافات اور مذاہب اربعہ کی بےمعنی وبےحاصل لڑائیوں کی بیخ کنی کی اور اجتہاد کا دروازہ کھول دیا۔ انھوں نے علوم ظاہری

کے علاوہ علوم باطنی کی بھی تعلیم پائی تھی اور اذکار و اشغال میں بھی مصروف رہے تھے۔ آپ کی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے قلب پر رموز و اسرار کا غلبہ ہوتا تھا لیکن وہ عام مروجہ تصوف اور متصوفین کے حرکات وافعال سے سخت بیزار تھے۔ عام لوگ جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈے، سحر وطلسم کو کرامات سمجھتے تھے اور ان چیزوں پر تصوف اور ولایت کی بنیادیں استوار کرنے والوں کو صوفی سمجھتے تھے۔ شاہ صاحب نے ان چیزوں کو باطل قرار دیا اور ہدایت کی کہ بدعتی پیروں کی بیعت ہرگز نہ کریں۔ اگر ان سے کوئی کرامت بھی دیکھو تو اس کا طلسمات سحر سمجھو، جس کا قرب الٰہی سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ نے اپنی تصنیفات میں اس بات کی توضیع بھی کی کہ تصوف کا کتنا حصہ اسلام ہے اور کون کون سے غیر اسلامی عناصر اس میں شامل ہو گئے ہیں:

> آپ نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے تصور کو تاویل وتعبیر میں پیش کر کے مولویوں کی اس بھڑک کو مٹا دیا جو ان بے چاروں میں صوفی وصوفیت کے متعلق پائی جاتی تھی۔[۴۲]

شاہ ولی اللہ نے جس طرح تصوف کی تعلیمات، تعلیقات اور مروجہ معمولات میں اسلامی اور غیر اسلامی عناصر کی تفریق کر کے بات صاف کی اسی طرح تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمین کے اصولی اور باریک تفریق کو بھی واضح کیا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ گذشتہ کئی صدیوں میں اسلام قبول کرنے والی اقوام کے درمیان فی الواقع اسلام کا کیا حال رہا ہے اور وہ کون کون سی جاہلانہ آمیزش ہیں جو مسلمانوں کے عقائد، افکار، علوم اخلاق، تمدن اور سیاست میں ہوتی رہی ہیں۔ تمام خرابیوں کی بنیاد انھوں نے دو باتوں کو قرار دیا، ایک تو اقتدارِ سیاسی کا خلافت سے بادشاہی کی طرف انتقال۔ دوسرا روحِ اجتہاد کا مردہ ہو کر تقلید جامد کا دماغوں پر تسلط۔

شاہ ولی اللہ نے ایک اور بڑا کام یہ کیا کہ اسلام کے پورے فکری، اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو ایک مرتب، منظّم و مربوط صورت میں پیش کیا۔ پہلے انھوں نے مابعد الطبعی مسائل کو سلجھا کر فلسفۂ اسلام مدون کیا۔ پھر اس پر ایک نظامِ اخلاق مرتب کیا اور دونوں راہوں میں یونانی، رومی، ہندوستانی اور ایرانی اثرات سے پہلو بچا کر خالص اسلامی تعلیمات کو پیش نظر رکھا۔ نیز نظامِ اخلاق پر انھوں نے ایک اجتماعی فلسفے کی عمارت اُٹھائی اور اس سلسلے میں تدبیرِ منزل، آدابِ معاشرت، سیاست، تمدن، عدالت، ضرب محاصل، انتظامی ملکی اور عسکری تنظیم وغیرہ کی تفصیلات بیان کیں اور ساتھ ہی ان اسباب پر روشنی ڈالی جس سے تمدن میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ نظامِ شریعت، عباداتِ احکام اور قوانین کو پیش کر کے انھیں ہر ایک چیز کی حکمتیں سمجھاتے چلے جاتے ہیں۔

آخر میں تاریخ وملل وشرائع پر نظر ڈال کر اسلام و جاہلیت کی تاریخی کشمکش کا تصور پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے جاہلی حکومت اور اسلامی حکومت کے فرق کو بالکل واضح کر کے لوگوں کے سامنے رکھ دیا اور اس بحث کو ایسے طریقوں سے پیش کیا جن کی وجہ سے اصحابِ ایمان کے لیے جاہلی حکومت کو اسلامی حکومت سے بدلنے کی جدوجہد کیے بغیر چین سے بیٹھنا محال ہو گیا۔

شاہ ولی اللہ نے محض مسلمانوں کی فکری، دینی اور اخلاقی اصلاح ورہنمائی ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قوم کی معاشرتی خرابیوں کی طرف بھی توجہ دلائی اور خصوصیت سے ان برائیوں کو دور کرنے کی تلقین کی جو ہندوؤں کے زیر اثر ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگیوں

میں داخل ہوگئی تھیں۔مثلاً بیواؤں کی دوسری شادی نہ کرنا،طلاق کو ناجائز سمجھنا،بڑے بڑے مہر باندھنا،خوشی اورغم کی تقریبوں پر محض دکھاوے کی خاطر اسراف سے کام لینا۔شاہ صاحب کواس کا پورا پورا احساس تھا کہ اجتماعی،اخلاق اس وقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک معاشرے میں ایسا اجتماعی نظام قائم نہ ہوجائے جوافراط تفریط ناہموار اور عدم توازن سے پاک ہواور جس کی اساس اصول عدل پر رکھی گئی ہو۔شاہ صاحب کا خیال تھا کہ اجتماعی اخلاق میں حسن وکمال ایسی صورت میں پیدا ہوسکتا ہے کہ حکومت کے معاشی نظام میں ایسا اعتدال ہوکہ اس میں نہ بے باکانہ عیش پسندی کی گنجائش ہونہ افلاس وفقر وفاقے کی۔اس نظام میں ایک طرف تو معاشی دستبرد اور آئینی استحصال کو کوئی دخل ہواور نہ وہ معیشت کے ترقی پذیر وسائل سے خالی اورمحروم ہو۔مختصر یہ کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے مسلمانوں کی روحانی،مذہبی،اخلاقی،فکری،سیاسی،اقتصادی،معاشرتی اور تعلیمی حالت کا شاہ صاحب نے گہرا مطالعہ کیا اوراس کے محرکات ومیلانات کا اصل سبب اوراس کا حل بھی پیش کیا۔

شاہ ولی اللہ نے ایسی اصلاحی تحریکیں شروع کیں جومسلمانوں کی اصلاح وبہتری کے لیے ضروری تھیں۔اس ضمن میں ان کے صاحبزادوں نے بھی ان کی تعلیمات کوعوام الناس تک پہنچانے کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔یہ درست ہے کہ علمائے حق کے اپنے خاص طریقے ہوتے ہیں اوران طریقوں کو بعض دفعہ عام رواج کے مطابق واضح نہیں کیا جاسکتا اور وہ بھی ڈیڑھ صدی بعد۔لیکن ایسی تحریکوں کی وضاحت کی راہ میں مشکلات اور رکاوٹیں بھی ہوتی ہیں کیوں کہ ان تحریکوں پرعقیدت اور تقدس کی اتنی گہری تہیں چڑھی ہوئی ہوتی ہیں کہ انھیں ہٹا کر تحریکوں کے پیچھے کام کرنے والے محرکات کا سمجھنا اور سمجھانا مشکل ہوجاتا ہے۔تحریکوں میں فکراوراس کی بنیاد پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے جوطریق کار اور داؤپیچ اختیار کیے جاتے ہیں وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اہم ہوتے ہیں اور کسی ایک کو دوسرے پرفوقیت نہیں دی جاسکتی۔لیکن جب طریق کارنا کام ہوجاتا ہے تو یہ بنیادی حد تک فکر ہی کی ناکامی تصور ہوتی ہے،کیوں کہ اصولی طور پر تو فکرخود ہی ان طبقوں اورگروہوں کی نشاندہی کرتی ہے جواس فکرکو بروئے کار لا سکتے ہیں۔مگر اُن کے فلسفے کی تمام عظمت کے باوجود اس میں اس سمت کوئی اشارہ نہیں کیا گیا۔چنانچہ پون صدی کے بعد جب ایک مخصوص طریق کار میں ناکامی ہوئی تو فوری طور پر ایک نیا طریق کار سوچا گیا اوریہی وہ طریق کار تھا جواس برصغیر میں پھر پون صدی تک مسلمانوں کے ایک بہت بڑے گروہ کومتاثر اور متحرک کرتا رہا اور پھر وہ وقت بھی آیا،وعظ ونصیحت کے شیدائیوں اورمنبر پر بیٹھ کر رُشد وہدایت کی راہ دکھانے والوں کوخود ہی شمشیر بکف میدان میں نکلنے پر مجبور کیا۔چنانچہ اب یہ طریق کار مروج ہوا کہ پھر اس کومتحرک کیا جائے اور ان کوشمشیر بدست دشمنوں سے لڑایا جائے۔یہی وہ تحریک تھی جوشاہ ولی اللہ اورشاہ عبدالعزیز کے فکری پرچم تلے منظّم ہوئی۔

اولاد شاہ ولی اللہ شاہ عبدالقادر نے قرآن مجید کا اردو میں ترجمہ کیا۔شاہ رفیع الدین،شاہ عبدالقادر سے عمر میں پانچ سال بڑے تھے اس لیے گمان یہی ہے کہ قرآن کا ترجمہ پہلے شاہ رفیع الدین نے کیا ہوگا۔

شاہ عبدالقادر کا دور: ۱۱۶۷ھ تا ۱۲۳۰ھ بمطابق ۱۷۵۳ء تا ۱۸۱۴ء[۵] مولانا عبدالقادر،شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے تھے اور تفسیر حدیث

اور فقہ کے عالم تھے۔

آپ کے علم وفضل کا بیان کرنا ایسا ہے کہ کوئی آفتاب کی تعریف فروغ اور فلک کی مدح بلندی کے ساتھ کرے، حقیقت میں یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں سے مقابلہ کرنے کے لیے ایسا ادب تخلیق کیا جو مشنریوں کی سرگرمیوں کا شافی جواب ہو۔ مسلمانوں میں بدحالی کے احساس کو پیدا کرنے کے ساتھ انھیں ترقی کا خیال دل میں پیدا کیا اور ان کی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ بحال کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

(۲)

ہندوؤں نے مسلمانوں کی حکمرانی کے ادوار میں ان کی زبانیں سیکھیں، ان کے تمدنی اثرات قبول کیے، بالکل اسی طرح جب مغربی تہذیب کی یلغار ہوئی تو انھوں نے اس یلغار کے ریلے کو روکنے کے بجائے اس کے ساتھ چلنے کا فیصلہ کیا۔ اس تہذیب کے اثرات کو بہت حد تک قبول کرنے کا فیصلہ کیا، کیوں کہ تجارتی اقوام اور طبقوں میں تہذیبی اثرات کو قبول کرنے کا ایک بنیادی مقصد ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بنگال کے ہندو زمین دار اور تاجر طبقے نے صرف دولت ہی نہیں کمائی بلکہ وہ ہندو معاشرے میں مغربی افکار اور تہذیب کے نقیب بھی بنے۔ انھوں نے انھی افکار سے متاثر ہو کر اپنے معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔

ہندو معاشرے میں جس وقت مغربی افکار اور تعلیم کا چرچا ہو رہا تھا اس وقت مسلم معاشرے میں مغرب سے آنے والے افکار و تہذیب کے خلاف نفرت کے سوتے پھوٹ رہے تھے، کیوں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی راہ میں آنے والے برطانوی تاجروں نے ان مسلمانوں کی دنیا تباہ کر دی تھی۔ ان کی زمین داریاں لُٹ گئیں اور امارات قصۂ پارینہ بن گئی تھیں۔ جس حکومت کے بل بوتے پر آسودگی کے دن گزارے تھے اس حکومت کی بساط ہی الٹ گئی تھی اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا ردعمل اس نئی طاقت، نئی تہذیب اور نئے افکار کے بارے میں کبھی ہمدردانہ نہیں ہو سکتا تھا اور یہی وہ دو بنیادی ردعمل تھے جو اس صدی میں ظہور پذیر ہوئے۔ ایک ردعمل نے حاجی شریعت اللہ اور دودھو میاں اور تیتو میر کی تحریک کو جنم دیا اور دوسرے ردعمل نے برہمو سماج کو جنم دیا۔ یوں انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب کے مقابلے کے لیے فضا ہموار ہوئی اور انگریزی زبان اور انگریزی افکار کو قبول کرنے کے لیے راستہ ہموار کیا گیا۔

اٹھارہویں صدی کے آخری نصف کے اختتام تک ایسٹ انڈیا کمپنی کا اپنے مقبوضہ علاقوں میں تعلیم کے رواج دینے کا کوئی واضح منصوبہ موجود نہیں تھا۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا وہ دور تھا جب اس کا دائرہ تجارت تک محدود تھا اور اس کی ضرورت تجارت تک محدود تھی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے چارلس گرانٹ کا مغربی تعلیم کے رواج کے بارے میں ایک رسالہ اس نے ۱۷۹۲ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۷۹۷ء میں یہ مکمل ہو کر شائع ہوا۔ اس رسالہ میں پہلی بار ایسٹ انڈیا کمپنی کے کسی ملازم نے اس مسئلے پر قلم اٹھایا۔ چنانچہ گرانٹ ہندوستانیوں کو مغربی علوم سے روشناس کرانے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتا ہے:

> اس تعلیم سے ہندوؤں کو جو سب سے اہم فائدہ حاصل ہوگا وہ ہمارے مذہب کا علم ہے جس کے اصول سیدھے سادے ہیں اور چھوٹے چھوٹے رسالوں اور کتابوں میں محفوظ ہیں۔ ان رسالوں اور کتابوں کو پڑھانے کے بعد

ان ہندوؤں کوتوحید کی تعلیم دی جائے گی اورانسان کی حقیقی تاریخ اورعظمت سے آگاہ کیا جائے گا اوران کے تمام عقائد کو باطل ٹھہرانے کے تمام ذرائع اختیار کیے جائیں گے جوحقیقت میں باطل اور جھوٹے ہیں اس کے بعد انھیں پاکیزہ اخلاق اور پاک فرائض کی تعلیم دی جائے گی۔ جزا اور سزا، آخرت اور آخرت کی باتیں بتائی جائیں گی۔ جہاں ایسے پاکیزہ عقائد کی تعلیم ہوگی وہاں بت پرستی، اوہام پرستی، لکڑی اور پتھروں کی پوجا ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گی۔[۶]

اس رسالے میں مسلمانوں کا خصوصی طور پر ذکر کیا، کیوں کہ مسلمانوں کو عیسائیوں کی توحید پرستی زیادہ متاثر نہیں کر سکتی تھی، اس لیے شروع میں ان کو نظرانداز کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ مسٹر گرانٹ ہی کے ایماء پر ۱۷۹۳ء میں مسٹر فورس نے برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے رواج کے متعلق ایک قرارداد پیش کی اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ حکومت کا فرض ہے کہ برٹش انڈیا کے باشندوں کی بہبود اور ترقی کے لیے ہر جائز اور ممکن وسیلہ عمل میں لایا جائے اور اس سلسلے میں ایسی کاروائی کرے جس سے تدریجاً ہندوستان کے باشندوں کو مفید علم حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آئے اور ان کی مذہبی اور اخلاقی ترقی کے لیے معاون ثابت ہو۔ نیز ہندوستان میں پروٹسٹنٹ مذہب کے عقیدے کے مطابق عبادت اور تعلیم کے لیے آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔ اس مقصد کے لیے وقتاً فوقتاً معلم بھیجے جائیں۔ پارلیمنٹ نے اس قرارداد کو منظور کرنے سے انکار کر دیا اس قرارداد کی مخالفت میں سب سے پیش پیش خود کمپنی کے ارباب حل وعقد تھے۔ چنانچہ کمپنی کے ایک ڈائرکٹر نے جو پارلیمنٹ کا رکن تھا اس قرارداد کی مخالفت کی اور کہا یہ منصوبہ بڑا ہی خطرناک ہے اور سیاسی طور پر بھی یہ مہلک ہے کیوں کہ اس اقدام سے ملک کا امن خطرے میں پڑ جانے کا امکان ہے، اس سے کمپنی کا پورا کاروبار تہس نہس ہوجائے گا اور بغاوت پھیل جائے گی۔ جس دن ہم نے ہندوستان میں تبدیلیٔ مذہب کے لیے کوئی قدم اُٹھایا وہ حکومت برطانیہ کے زوال کا پہلا دن ثابت ہوگا اور ہندوستان میں ان کی برتری ختم ہوجائے گی۔ یہ منصوبہ سیاسی طور پر بھی مہلک ہوگا کیوں کہ ایک مذہب کے قائم ہوجانے سے انسانوں کے مقاصد متحد ہوجائیں گے۔ اگر ہندوستان میں یکسانیت پیدا ہوگئی تو انگریزی حکومت کا خاتمہ ہوجائے گا۔ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو اپنے مذہب میں لانے کا اصول اس اٹھارہویں صدی میں خلاف مصلحت سے اگر تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ چند لاکھ عیسائی ہوگئے تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ فائدہ کے بجائے سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ امریکہ میں درس گاہیں اور کالج قائم کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا، اس طرح جب نوجوان پادری اندرون ہندوستان پھیلنے لگیں گے تو کمپنی کے تمام منافع کا خاتمہ ہوجائے گا اگر کسی ہندوستانی کو واقعی تعلیم حاصل کرنا ہو تو وہ انگلستان آکر تعلیم حاصل کرے۔

ولبرفورس کی یہ تجویز نامنظور ہوگئی اور اس طرح چارلس گرانٹ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اس نے محسوس کیا کہ ان منصوبوں کی تکمیل کے لیے پارلیمنٹ اور خود ایسٹ انڈیا کمپنی کے حلقوں میں ذاتی اثر ورسوخ ضروری ہے چنانچہ اس نے اس طرف توجہ کی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۷۹۴ء میں وہ کمپنی کا ڈائریکٹر منتخب ہوگیا اور ۱۸۰۲ء میں وہ پارلیمنٹ کا رکن بھی چن لیا گیا۔ اس

نے اپنے اثر ورسوخ کو پوری طرح استعمال اور ہندوستان میں تعلیم عام کرنے اورعیسائیت کے پرچار کے سلسلے میں کئی پمفلٹ اور رسالے بھی قلم بند کیے۔

وہ ایک رسالے میں لکھتا ہے:

> پادریوں اور معلموں کو ہندوستان بھیجنے کی اشد ضرورت ہے تا کہ وہاں کے غیر مہذب اور اخلاقی قدروں سے ناواقف لوگوں کو صحیح راستہ دکھا سکیں۔ ۷

اس پمفلٹ میں بڑی دردمندی سے اپیل کی گئی تھی کہ:

> ہمارے مقبوضات میں ایسے لوگ بستے ہیں جن کو سچے مذہب کا راستہ دکھانا ہم پر فرض ہے۔ اس سے ہمیں مذہبی فائدے سے بڑھ کر سیاسی فائدہ حاصل ہوگا کیوں کہ اگر ہم نے اپنی زبان، اپنا علم، اپنے خیالات اور مذہب ایشیائی ممالک میں داخل کر دیا تو ہماری حقیقی فتح ہوگی۔ ۸

اسلامی حکومت کے زوال کے بعد مسلمان عیسائیت کے خوف میں مبتلا ہو گئے تھے اُن کی حالت کچھ اس طرح گر گئی کہ ان کے پاس ایسے ذرائع بھی باقی نہیں رہے کہ جن سے وہ اپنے بچوں کو ایسی تعلیم دے سکیں جن سے آئندہ حکومت میں کسی عہدے پر فائز ہونے کے لائق بن سکیں۔ انھی حالات اور خیالات کے پیشِ نظر گورنر جنرل لارڈ ہیسٹینگز نے مدرسے کے قیام کی منظوری دے دی، لیکن آہستہ آہستہ پارلیمنٹ کی ایک مخصوص کمیٹی نے مذہبی پروپیگنڈے کے لیے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ مدرسہ عامہ کے قیام سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ اٹھارہویں صدی کے آخری نصف اختتام تک ایسٹ انڈیا کمپنی کا اپنے مقبوضہ علاقوں میں تعلیم کے رواج دینے کا کوئی واضح منصوبہ موجود نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ اس دور میں مغربی تعلیم کے رواج کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ لیکن چارلس گرانٹ اور مسٹر ولبر فورس اس کوشش میں رہے کہ کسی طرح مغربی علوم کو رائج کیا جائے اور عیسائیت کا پرچار کیا جائے۔ چارلس گرانٹ نے کمپنی کا ڈائریکٹر اور پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہونے کا پوری طرح اپنا اثر رسوخ استعمال کیا اور ہندوستان میں تعلیم عام کرنے اور عیسائیت کے پرچار کے سلسلے میں کئی ایک پمفلٹ اور رسالے بھی قلم بند کیے۔

ایک بات مسلمہ ہے کہ مسلمانوں میں کوئی ایسا طبقہ وجود میں نہیں آیا تھا جو بحیثیت طبقے کے کمپنی اور دوسرے برطانوی تجارتی اور صنعتی طبقوں سے ہم آہنگ ہوسکتا اور اس کے مفادات کو اپنا سکتا۔ مسلمانوں کے مختلف طبقے ایسی صف میں کھڑے تھے جو کمپنی کے مفادات سے ٹکراتی تھی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں برطانوی تہذیب، زبان اور افکارِ علوم کے خلاف شدید رجحانات پائے جاتے تھے اور برطانوی حکام بھی ان رجحانات سے پوری طرح آشنا تھا۔ چنانچہ مختلف حکام کی طرف سے پارلیمنٹ کی مختلف کمیٹیوں کے روبرو جو شہادتیں دی گئی تھیں ان کی جانچ پڑتال کی جائے تو یہ حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ ان حکام کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کدورتوں کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ مذہبی پروپیگنڈے کے لیے کس ہوشیاری سے کام ہو رہا تھا اس بیان سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہم لوگوں کا اصل اصول یہ ہونا چاہیے کہ لوگوں کو اس سے بہتر علم کی تعلیم دی جائے جس تعلیم پر وہ رضامند ہوں۔ اس میں

کوئی شبہ نہیں کہ کوئی تعلیم جو مذہب عیسوی کے اصولوں پر مبنی نہ ہو وہ ناقص ہے۔اسی طرح ایک موقعے پر یہ بیان بھی دیا گیا کہ:

> لوگ عیسائی بنانے کے طریقے میں غلطی کرتے ہیں میرا تو ایمان ہے کہ جس طرح ہمارے آباؤ اجداد سب کے سب ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے اسی طرح یہاں بھی سب کے سب عیسائی ہو جائیں گے ملک میں عیسائی تعلیم بلا واسطہ پادریوں کے ذریعے اور بالواسطہ کتابوں، اخباروں اور یورپین لوگوں سے بات چیت اور میل ملاپ کے ذریعے سے نفوذ کرے گی۔ یہاں تک کہ عیسوی تعلیم سے ہر سوسائٹی متاثر ہو جائے گی تب جا کر ہزاروں کی تعداد میں لوگ عیسوی مذہب قبول کریں گے۔۹

ان مقاصد نے مسلمانوں کو مغربی تعلیم سے متنفر کر دیا اور یہ نفرت اس لیے بھی بہت دنوں تک قائم رہی کہ مسلمانوں میں وہ درمیانی طبقہ جنم ہی نہ لے سکا جو برطانوی تاجروں کے گماشتے یا ایجنٹ کے طور پر کام کرتا اور دنیاوی جاہ وجلال کے لیے اسے انگریزی میں کشش ہوتی۔

اس طرح سے **ایسٹ انڈیا کمپنی** کے دور حکومت نے بنگال کے دور حکومت میں بنگال کی سرزمین میں دو متضاد رجحانات کو جنم دیا۔ مسلمانوں کو ماضی پرستی کی طرف دھکیل دیا، ان کو ہر نئی چیز سے نفرت ہو گئی۔ مغربی افکار، انگریزی تعلیم، انگریزی زبان، انگریزی نوکری، غرض یہ کہ تمام چیزیں ان کے لیے نئی ثابت ہوئیں اور وہ ماضی کے دھندلکوں میں گم ہوتے چلے گئے اور یہ نفرت روز بروز بڑھتی چلی گئی، ان کی تحریکیں بھی ماضی کے احیاء پر مبنی تھیں۔ وہ ماضی میں سکون کی تلاش کرتے تھے۔ان کو ہندوؤں سے بھی نفرت ہو گئی جو نو آمدہ طاقتوں اور ان کے افکار سے ناتا جوڑ رہے تھے۔اس طرح ان کو ہندوؤں میں بھی اپنا دشمن نظر آنے لگا۔ پھر یہی ہوا، برصغیر کی دو بڑی قومیں ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں اور ان کی وہ صلاحیتیں جو مل کر دنیا کے سامنے آئیں ایک دوسرے سے جنگ کرنے، نفرت کرنے اور ہندو مسلم فسادات کی شکل میں ظاہر ہونے لگیں اور مذہب جو آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا، آج تک یہی سکھا رہا ہے۔

عیسائی مبلغین نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے بھرپور پرچار کیا اور نہ صرف بائبل کو اردو میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی بلکہ زبان کے قواعد بھی مرتب کیے۔اردو زبان میں مغربی اقوام نے غیر معمولی دلچسپی تبلیغِ عیسائیت کے لیے لی۔ گو کہ اس ضمن میں ان کے تجارتی اور سیاسی مقاصد بھی تھے۔ مغربی اقوام کے قدم آہستہ آہستہ یہاں جمتے گئے۔عیسائی اور ہندو اپنے مذہب کی ترویج اور اس کے پرچار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔شلزے جو ایک مبلغ تھا اس نے انجیل مقدس کا ترجمہ کیا۔

اٹھارہویں صدی میں بائبل کے ترجمے اردو میں ہوئے، ہندوؤں کی مقدس کتابوں کے ترجموں کا آغاز بھی اسی صدی میں ہوا۔ اٹھارہویں صدی کے حوصلہ شکن حالات نے مذہب کے احیاء کے لیے راستہ ہموار کیا، کیوں کہ یہ ایسا دور تھا جب عیسائی مبلغ اپنے مذہب کا پرچار کر رہے تھے تو دوسری طرف ہندو اور دیگر غیر مسلم قوتیں بھی اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہی تھیں۔اس دور میں علم دین کو عوام تک پہنچا کر ان میں اصلاح اور زندگی کا نیا حوصلہ پیدا کرنے کی کوششوں کا شعور ملتا ہے۔ یہ کام اس دور میں مسلمان علماء نے کیا۔اس کے علاوہ عیسائی مبلغوں نے بھی، جو برعظیم کے انتشار سے فائدہ اٹھا کر عیسائی مذہب کی تبلیغ میں مصروف تھے۔جس طرح قرآن مجید کا

پہلا ترجمہ اس صدی میں ہوا، اسی طرح بائبل اور بھگوت گیتا کے تراجم کی پہلی کوشش بھی اسی صدی میں ہوئی۔

اس صدی میں سات سمندر پار سے آئی ہوئی قوموں نے اپنے قدم اس سرزمین پر جمائے اور عیسائی مشنیریوں اور عیسائی مبلغوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے کوششیں شروع کیں۔ جس سے مسلمانوں کے دل میں بھی اپنے مذہب کی بقا اور اس کے پرچار کا شوق اُبھرا اور عیسائیت اور دیگر مذاہب کی نفرت ان کے دل میں بیٹھ گئی۔ پھر اس وقت کے علماء نے بھی ان مشنریوں سے مقابلہ کیا، مناظرے کیے اور جو خوف مسلمانوں کے دل میں پیدا ہو گیا تھا اس کے لیے ایسا دینی ادب تخلیق کیا جس سے ان غیر مذہب قوموں کو جواب دیا جا سکے۔

(۳)

مذکورہ صورت حال میں **شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید اور ان کی تحریک** کا ایک ہی مقصد رہا ہے کہ دعوت و تبلیغ سے عوام کو متحرک اور منظّم کیا جائے۔ سید احمد کی تحریک میں شاہ اسمٰعیل کا درجہ بہت بلند ہے اور بعض صورتوں میں تو ایسا ہوتا ہے جیسے اس تحریک کے خدوخال متعین کرنے میں ان کو اولیت حاصل ہے اور اس مقصد کے لیے ان کی تصنیف کا درجہ بلند ہے کیوں کہ ان سے اس تحریک کے طریق کار کے بارے میں خاصا اہم مواد ملتا ہے۔ اپنی معرکتہ الآرا تصنیف ''منصب امامت'' میں لکھتے ہیں "حق جل وعلیٰ اپنی حکمت کاملہ سے ان مقبولان بارگاہ کے مختلف مزاج لوگوں کی تربیت کا سلیقہ اور فصیح کلام اور بیان بلیغ کی قوت، مقدمہ، ہدایت، تقریر، اظہار، مافی الضمیر کے باب میں عطا فرما دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے حضرت داوٗدؑ کے حق میں فرمایا کہ ہم نے اس کو حکمت اور فعل خطابت عطا فرمائے، حکمت سے مراد یہی تربیت کا سلیقہ اور فعل خطابت کے معنی بیان بلیغ ہے اور حضرت محمد ﷺ کو ارشاد فرمایا کہ ان کے نفسوں سے بلاغت سے بات کرو۔ لیکن غور کرنا چاہیے کہ ہادیان مبعوث کی دعوت اور طرح کی ہوتی ہے اور دانش مندان فنون کی تعلیم دوسری طرح کی ان کے درمیان تمیز کرنا دو طرح پر ہے۔

دعوت کا پہلا طریقہ: یہ کہ ان کی دعوت کلام محاورات اور اہل عرف پر جاری ہوتا ہے جو کہ اپنے معاملات اور مکالمات میں اس کو استعمال کرتے ہیں اور دانایان علم کلام اور مصنفین کتب کی اصطلاحات پر جاری نہیں ہوتا کہ اپنی تحریر و تقریر کو اس کی بنا پر کریں۔

دعوت کے دو طریقے: دعوت و تبلیغ میں حکمت اور بصیرت سے کام لیا جاتا ہے۔ جاننا چاہیے کہ دعوت کے دو طریقے ہوتے ہیں اور یہ دعوت الٰہی دو طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے۔

بیان حکمت: اللہ رب العزت اپنی خاص رحمت سے ان کو قوت بیان اس طرح عنایت فرما دیتے ہیں کہ اپنے مافی الضمیر کے مقصد کو دلائل و براہین، تمثیلات و تشبیہات سے اس طرح روشن کرتے ہیں کہ ان کا مدعا سامعین کی نظر میں یہاں تک ظاہر ہو جاتا ہے کہ معقول معانی محسوس صورت میں ظاہر ہو جاتے ہیں اور اسی کی صورت ہو بہو سامعین کے صفحۂ خیال پر منقش ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ہر سامع پر صدق دل سے ان کی گواہی ظاہر ہوتی ہے۔ اور ہر سلیم الوجود کے دل کو ان کے صدق سے اطمینان حاصل ہوتا ہے ہر صاحب عقل کی عقل انھیں پسند کرتی ہے اور صاحب خیال کا خیال ان کی طرف پرواز کرتا ہے اگر چہ بہت سے سامعین اپنی ہٹ دھرمی سے انھیں منظور

نہیں کرتے اور تعصب کے سبب سے اپنی زبان سے ان کا اقرار نہیں کرتے لیکن دل میں وہ بھی جانتے ہیں کہ حق ان ہی کی طرف ہے اور تکبر خود اپنے آپ میں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

انھوں نے اس کا انکار کیا جو ہم نے ان کو کہا مگر ان کے دلوں کو یقین تھا کہ ظلم اور تکبر سے انکار کیا۔۴۱

کلام موعظت: کلام موعظت کا بیان یہ ہے کہ اکثر اوقات غافلوں کی بیداری، جاہلوں کی آگاہی اور پست طبقوں کی بلند ہمتی کے لیے شوق آمیز اور وجد انگیز کلام، محبت الٰہی کا بیان، وسعت، رحمت اور شدت غضب کا ذکر یا ان معاملات راز و نیاز کا بیان جو اللہ عزوجل اور اس کے بندوں کے درمیان ہو، سلف وخلف زمانے کی گردش، سکھ اور دکھ کے معاملات ان کی تفصیلات اور برزخ و قیامت اور دوزخ و بہشت کے احوال یا ان کے مانند ایسے حالات سناتے ہیں جس سے سامعین کے دل میں اُمنگ اور خواہش پیدا ہو۔

اگر چہ ایسے کلمات ہر زمانے میں واعظوں کا مقصد اسی حد تک ہوتا ہے کہ رقت، جگر گداز نعرے، وجد و اضطراب اور پیچ و تاب کی حالت حاضرین مجلس سے ظاہر ہو اور انبیاء علیہم السلام کا مقصد یہ نہیں ہوتا بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بندگان خدا کو احکام رب العزت میں مقام اطاعت اور فرماں برداری کے وسیلے کا رسوخ پیدا ہو، تا کہ ان کے تہذیب الاخلاق اور اصلاح اعمال کا باعث ہو، اسے موعظت حسنہ کہتے ہیں۔

ایک تیسرا طریقہ: شاہ اسمٰعیل اپنی کتاب منصب امامت میں دعوت کے ایک تیسرے طریقے کے متعلق بھی لکھتے ہیں اور اس طریقے کا انحصار دراصل اپنی تحریک کی تین منزلوں کا اشارہ ہے، اب یہ تیسرا طریقہ دعوت بھی دراصل اپنی اسی تحریک کی نئی منزل کا اعلان ہے۔

شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد نے اپنی تحریکوں میں تین موڑ مقرر کیے ہیں۔ کبھی کبھی یہ لوگ مقام دعوت کے ایک تیسرے طریقے کو بھی استعمال میں لاتے ہیں۔ یہ آخری موڑ تھا جس کا تقاضا جہاد تھا، اور اسی جہاد کو احسن طریقے سے منظّم کرنے کے لیے امامت کا مسئلہ اُٹھا۔ سید احمد کو امام تسلیم کیا گیا، چنانچہ تحریک کے اس موڑ کی اہمیت سب سے زیادہ تسلیم کی جاتی ہے، اس لیے کہ اسی امامت اور اسی مسلک کے تحت ایک نئے نظام حکومت کی ترویج کا اعلان کیا گیا تھا اور یہی نظام حکومت بعد میں اس تحریک کی ناکامی کا بھی ایک حد تک سبب بنا۔ اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ان حالات کو سامنے رکھا جائے جن کے تحت سید احمد کی امامت کا اعلان کیا گیا۔

سید احمد اور ان کے رفقاء کی یہ تمام کوششیں، تگ و دو، مسافرت کی صعوبتیں طول طویل راستوں کی مشکلات، حتیٰ کہ اپنے وطن اجداد کو ترک کرنے کی غرض و غایت اعلان کلمۃ الحق کا اجراء تھا۔ ہندوستان کو غیر مسلموں کی غلامی سے نجات دلانا تھا۔ صوبہ سرحد اور پنجاب کو سکھوں کے ناپاک قدموں سے پاک کرانا تھا اور ان کے مقاصد کے لیے جذبۂ جہاد اور ولولۂ خدمتِ اسلام نے انھیں ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے سرحد کے پہاڑوں تک پہنچایا، انھیں ابتداً اپنے نیک مقصد میں کامیابی بھی ہوئی۔ علاقے کے باشندے جوق در جوق ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے، ہر شخص ان کی تبلیغ سے متاثر ہو کر میدانِ جہاد میں کود جانے کا متمنی نظر آیا، ان کے ایک اشارے پر سب مر مٹنے کو ہمہ تن تیار دکھائی دیئے۔ بلاشبہ وقتاً فوقتاً ایسے علماء دین پیدا ہوتے رہے جنھوں نے ہر چیز سے بے نیاز

ہو کر صحیح معنوں میں اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کی۔لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کثرت ان ہی لوگوں کی تھی جن کی علمیت محدود تھی، جو قرآن وسنت کو پوری طرح سمجھ بھی نہیں سکتے تھے لیکن اپنے مخصوص ماحول میں انھیں عزت، وقعت اور اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ایسی قوم سے راہ ورسم پیدا کرنا، اسے اپنے صدیوں کے راستے سے ہٹا کر کسی نئی راہ پر چلانے اور خصوصاً ان اُمور کو ترک کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے کہ جنھیں وہ حکم خدا اور رسولؐ یقین کر چکے ہوں، بڑے ہی صبر وتحمل، فہم وفراست، سوچ بچار اور تدبیر وحکمت کی ضرورت تھی۔

سید صاحب اپنے پاک جذبات سے اس قوم میں آ کر مقیم ہوئے تو ان کے رسم ورواج یا ان کی عادات سے قطعاً واقف نہ تھے۔حالات کو دیکھ کر وہ یہی فیصلہ کر سکے کہ مروجہ رسومات شریعت اسلامیہ کے خلاف تھیں اسی وجہ سے پہلے ان کی اصلاح ہونی چاہیے اور اس کے لیے اقدام شروع کر دیا۔سید صاحب کو سرزمین سرحد پر بہت سے مخلص ساتھی مل گئے ان ہی کی وجہ سے قوت وطاقت بھی میسر آئی، انھوں نے اس طاقت کو استعمال کرتے ہوئے احکام شرعی کا نفاذ کر دیا۔

سید صاحب کے نزدیک مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کی جڑ یہ تھی کہ وہ صراط مستقیم سے منحرف ہو چکے تھے ان میں خدا کے دین کی سربلندی کے لیے کوئی تڑپ اور کوئی بے تابی باقی نہ رہی تھی۔وہ روح جہاد سے خالی ہو چکے تھے یہی وجہ ہے کہ سید صاحب نے سیاسی عظمت وبرتری کو اپنا نصب العین نہ بنایا، صرف احیائے اسلام پر اپنی دعوت کی بنیاد رکھی۔وہ مدعیان اسلام و سچے مسلمان بنانا چاہتے تھے اور ان میں خدمت دین اور تکمیل مقاصد اسلام کی سچی لو لگانے کے خواہاں تھے۔

سیاسی زوال نے صرف اخلاقی اقدار ہی کو مجروح نہیں کیا تھا بلکہ اس نے دینی عقائد کو بھی بری طرح مسخ کیا تھا۔غیر اللہ کی عبادت معمول بن گیا تھا اور پیروں کے عرسوں کا سلسلہ عام تھا، میلاد اور گیارہویں شریف اور اس قسم کی مجالس وتقریبات کے زور وشور کا بھی یہی زمانہ تھا۔ان رسوم اور تقریبات کے متعلق ایک گروہ جواز کا فتویٰ دیتا تھا، ان کو مقدس اور جائز بلکہ ضروری تصور کرتا تھا۔اس زمانے میں ان ہی رسوم پر اکتفا نہ تھا بلکہ بے شمار دوسری رسومات بھی اسلام کا جز وقرار پائیں، حالانکہ اسلام اور اس کی تعلیمات میں ان کا کہیں بھی ذکر نہ تھا لیکن یہ تمام کی تمام ہندوؤں سے میل جول کے باعث مسلمانوں کی زندگی میں داخل ہو گئیں۔بہر حال تو ہم پرستی، جن بھوت اور تعویذ گنڈوں پر اعتقاد عام تھا اور جیسے جیسے قوم کی خود اعتمادی غائب ہوتی جا رہی تھی، ویسے ہی قبر پرستی اور اولیاء سے استعداد کا عقیدہ تقویت پکڑتا جا رہا تھا، کہیں امام کے آنے کا چرچہ ہوتا اور کہیں مہدی کا انتظار ہوتا۔

بہر حال اس قسم کے عقیدے مذہبی طور پر جائز تھے یا نہیں لیکن قومی کردار اور جدوجہد کی صلاحیتوں اور عملی قوتوں پر ان کا اثر بہت مہلک ثابت ہو رہا تھا۔یہ اخلاقی اور دینی حالت پچھلی ایک صدی سے اس برصغیر کا مقدر ہو چکی تھی، اس میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا اور کمی کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی تھی۔حضرت شاہ ولی اللہ، اس اخلاقی پستی اور دینی انحطاط کی حالت کے خلاف مصروف جہاد تھے۔سید احمد نے جب دہلی کا رُخ کیا تو اخلاقی اور دینی انحطاط کے ساتھ ساتھ سیاسی تنزلی بھی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور یہی وہ زمانہ تھا جب ایسٹ انڈیا کمپنی شمالی ہند کی طرف اپنے قدم بڑھا رہی تھی۔

اٹھارہویں صدی کے حالات وعوامل کا اثر یہ ہوا کہ اس روایتی معاشرے کے فرد کے کردار میں بحران پیدا ہوگیا۔ کردار کے اس بحران کی وجہ سے فرد کی زندگی سے وہ توازن جاتا رہا جو خیر وشر کے درمیان امتیاز پیدا کرتا ہے اور مثبت اصول زندگی اور اخلاقی اقدار ستون کا کام کرتے ہیں، جن کے تحفظ کے لیے فرد جدو جہد کرتا ہے، منفی قوتوں کا مقابلہ کرتا ہے اور کردار کی بلندی کو معاشرے میں قائم کر کے اسے زندگی میں اہم مقام دیتا ہے، اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ حکمران طبقے کے اندر قوت عمل مفلوج ہوگئی۔ عیش پرستی، گروہ بندی خود غرضی اور تنگ نظری نے اس کی جگہ لے لی۔ ملک وملت کے اہم اور بنیادی مسائل نظر انداز ہونے لگے، سیاسی فہم اور بصیرت عنقا ہوگئے۔ فرد کو اب کسی ایک چیز پر یقین نہیں آرہا تھا، وہ ملت جو سپاہی پیدا کرتی تھی اب بانکے پیدا کرنے لگی، پیشہ ور سپہ سالار بھی میدانِ جنگ کی طرف پالکیوں میں جانے لگے۔ مذہب کی جگہ اوہام پرستی نے لے لی۔ ملّی اور مذہبی وفاداریاں خود غرضی کا شکار ہونے لگیں۔ صرف ایک سلطنت کو ہی زوال نہیں آرہا تھا بلکہ ایک ملّت اپنے بلند اخلاقی مقام سے گر کر ذلت کے گڑھے میں چلی گئی اور اس نے وہ سب کچھ خاک میں ملا دیا تھا جو اس کی عظمت وقوت کا باعث تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا معاشرہ اندھا، گونگا اور بہرہ ہوگیا ہے، نہ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے اور سچ بولتا ہے۔ اگر اس معاشرے کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ احساسِ اقدار ختم ہوگیا ہے۔ فرد کے طرزِ عمل میں فرض شناسی کے بجائے خود غرضی آ گئی ہے، اوہام پرستی اور ضعیف الاعتقادی نے حقیقی مذہب کی جگہ لے لی ہے۔ عمل کی جگہ جس پر ہر معاشرے کی ترقی کا دارو مدار ہے، خواب، تعویذ گنڈوں اور جھاڑ پھونک نے لے لی ہے، بے یقینی کو فرد کے مزاج کا حصہ بنا دیا ہے، آنے والے کل پر یقین نہیں ہے اس لیے وہ اپنے لیے سب کچھ آج ہی کر لینا چاہتا ہے۔ سارا معاشرہ عدم توازن کی بیماری میں مبتلا ہے جن گروہوں کو معاشرے کی فلاح و بہبود کا محافظ ہونا چاہیے تھا وہ اس کا خون چوسنے لگے۔ جو کچھ وہ صرف کرتے اس کے معاوضے میں کوئی خدمت انجام دینے کے بجائے انھوں نے اپنی حالت اس قدر تباہ کر لی کہ غارت گرانہ استحصال یا محض بیکاری کو اپنا وتیرہ بنا لیا۔ اس بیماری میں جو بھی طبقہ مبتلا تھا وہ حکمران طبقہ تھا جس میں درباری امراء، وزراء، عمائدین اور اعمال شامل تھے، جن کے پاس طاقت بھی تھی اور دولت بھی۔ اس لیے وہ جو کچھ کرتے تھے اس کا اثر معاشرے پر، عوام پر پڑنا لازمی تھا۔ سارا معاشرہ ان سے متاثر ہو رہا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ سارا معاشرہ ویسا ہی ہوگیا جیسے وہ خود تھے۔ اس پوری صدی میں سترہویں صدی کا بوڑھا نظام خیال دم توڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس میں ہر سطح پر وقت کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی ضرورت تھی۔

اٹھارہویں صدی میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ فکر وذہن ایک جگہ ٹھہر گئے ہیں۔ سارا معاشرہ ماضی کے ضابطوں، اصولوں اور قوانین کو بغیر کسی تبدیلی کے قبول کیے ہوئے ہے۔ رسم پرستی اس کا مزاج ہے۔ وہ مستقبل کے بجائے ماضی پر تکیہ کیے ہوئے ہے۔ اور یہ ماضی اس کے حال کو متاثر نہیں کرتا۔ معاشرے کی روح مُردہ ہوگئی ہے، اور باطن میں گھپ اندھیرا ہے۔ مسلمان اس دور میں معیارِ شرافت وتہذیب کے نمائندے تھے، مسلمانوں میں معیارِ شرافت یہ تھا کہ وہ نوکر پیشہ ہو، دربارِ سرکار میں پہنچ رکھتا ہو یا کسی امیر کا مصاحب ہو۔

اس تفصیل سے اٹھارہویں صدی کے مزاج، اس کے طرزِ معاشرت، اس کے اخلاق اور اس کے کردار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بہادری، شجاعت اور عسکریت کے عناصر ضائع ہو چکے ہیں۔ عدم تحفظ کے احساس نے معاشرے کو بے عمل و مفلوج کر دیا ہے۔ اسی لیے یہ معاشرہ وہ راستہ اختیار کرتا ہے جس پر چل کر اس پُر آشوب زمانے کو وقتی طور پر بھلا سکے۔

(۵)

اٹھارہویں صدی اور دینی ادب: آہستہ آہستہ اردو نثر کے اسالیب متعین اور واضح ہونے لگے قرآن مجید کے تراجم، تفاسیر، احادیث، کتب آسمانی، سیرت رسولؐ کے مختلف واقعات، دینی مسئلے اور مسائل اخلاق کی تہذیب اور تفسیر کے لیے جو کتابیں لکھی گئیں وہ تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔ بعض کتابیں فارسی سے ترجمہ یا ان سے ماخوذ ہیں، لیکن اسلوب ان کا بھی سادہ اور عام فہم ہے دوسرے درجے پر وہ کتابیں ہیں جو تصوف و معرفت کے مختلف مضامین و موضوعات سے متعلق ہیں۔ بعض مخطوطات غیر قلمی نسخے ہیں جو شائع نہ ہو سکے۔ ذیل میں مخطوطات اور مطبوعات کی علاحدہ علاحدہ فہرست دی جا رہی ہے۔

نمبر	نام کتاب	مصنف یا مؤلف	سن تصنیف ہجری	عیسوی سن
۱	تفسیرِ تنزیل	نام ندارد	۱۱۴۰ھ	۱۷۲۷ء
۲	خزانۃ الفوائد	عبدالمجید	۱۲۰۲ھ	۱۷۸۷ء
۳	دین دیپک منظوم	محمد علی شاہ الفت	۱۱۹۴ھ	۱۷۸۰ء
۴	فقہ النبین	دکھنی، یقین	۱۱۸۲ھ	۱۷۶۸ء
۵	مسائل شتی منظوم	محمد علی	۱۱۸۳ھ	۱۷۶۹ء
۶	یک صدی مسائل	نام ندارد	۱۲۱۵ھ	۱۸۰۰ء
۷	منتخب الاحکام (منثور و منظوم)	محمد صغیر پیر	۱۱۹۱ھ	۱۷۷۷ء
۸	خزانہ حسنات (ترجمہ مفتاح الصلوٰۃ)	برہانپوری شیخ فتح محمد	۱۱۸۲ھ	۱۷۶۸ء
۹	تہید التقریر (مہدزیات)	مہدی جیون خان	۱۱۸۷ھ	۱۷۷۳ء
۱۰	خزانہ معرفت منظوم	حق نما محمد شاہ	۱۱۸۱ھ	۱۷۶۷ء
۱۱	نزہت العاشقین (تصوف)	ذوقی	۱۱۱۱ھ	۱۶۹۹ء
۱۲	(الف) رسالہ خوش و معما ارشاد۔ نظم (مجموعہ رسائل)	ارشاد خوش	۱۲۰۵ھ	۱۷۹۰ء
	(ب) رسالہ کسب کردن (اسلامیات)	محمود شیخ	ایضاً	ایضاً
	(ج) علم سفینہ فارسی تصوف	ایضاً	ایضاً	ایضاً
	(د) مختصر وجودات (منظوم)	ایضاً	ایضاً	ایضاً

	(ہ) کلام صدرالدین (نظم)	صدرالدین	ایضاً	ایضاً
	(و) سراج الوجود فارسی (تصوف)	شکر گنج فریدالدین شیخ چشتی	سن ندارد	سن ندارد
۱۳	جواہرالاسرار	جیوگام شاہ علی	۱۱۸۷ھ	۱۷۷۳ء
۱۴	قصیدہ بحیرالاسرار فارسی عین القضات قاضی	حافظ محمد	۱۱۸۷ھ	۱۷۷۳ء
	نجات نامہ	ایاض	۱۱۱۲ھ	۱۷۰۰ء
	نصیحت نامہ	اسمٰعیل محمد	سن ندارد	سن ندارد
۱۵	نورنامہ	شاہ عنایت	۱۱۶۲ھ	۱۷۴۸ء
	شہادت نامہ	مسلم فرزندان	سن ندارد	سن ندارد
	نورالہدایہ سکرات نامہ	محمد حیات	سن ندارد	سن ندارد
	حکایات تمثیلی	نام ندارد	۱۱۱۳ھ	۱۷۰۱ء
	مولودنامہ	محمد مختار	سن ندارد	سن ندارد
	محی الدین نامہ	قادری	سن ندارد	سن ندارد
۱۶	وفات نامہ رسول خدا	محمد مختار مختار	سن ندارد	سن ندارد
	کلام مختار	محمد مختار	سن ندارد	سن ندارد
	وصیت نامہ	حمزہ شیخ	سن ندارد	سن ندارد
	نورنامہ	حسن	سن ندارد	سن ندارد
۱۷	زادالعوامل (فقہ منظوم)	ولی محمد سید	۱۱۳۲ھ	۱۷۱۹ء
	قصہ حضرت عیسیٰ	غلام محمد	سن ندارد	سن ندارد
	حضرت مریم	میراں	۱۱۲۳ھ	۱۷۱۱ء
	رسالہ حسین لاابالی	حسین لاابالی	سن ندارد	سن ندارد
۱۸	یوسف زلیخا عشق نامہ	حسین فداالدین	۱۲۱۲ھ	۱۷۹۷ء
۱۹	جنگ نامہ (امیر حمزہ)	حسین قربان میر ناصر محمود	۱۲۱۲ھ	۱۷۹۷ء
۲۰	رسالہ فقہ	اسمٰعیل	۱۱۷۶ھ	سن ندارد
۲۱	وفات نامہ (رسول مقبول ﷺ)	عبدالرسول	۱۱۷۸ھ	۱۷۶۲ء
	وفات نامہ (حضرت بی بی فاطمہؓ)	فتح الدین سید	سن ندارد	سن ندارد

	وفات نامہ (رسول مقبول ﷺ)	ولی	۱۱۸۸ھ	۱۷۴۲ء
	غم نامہ	احمد	سن ندارد	سن ندارد
۲۲	خالق باری	ضیاءالدین حسرو سید محمد یاسین	۱۱۸۷ھ	۱۷۷۳ء
	دلائل خیرات (مع مخطوطات شاہ ولی اللہ)	مکی نخلی شیخ احمد	۱۲۱۴ھ	۱۷۹۹ء
	منتخب الاحکام	صغیری پیر محمد	۱۱۹۱ھ	۱۷۷۷ء
	مراۃ الاسرار	صدرالدین شاہ محمد	۱۱۸۴ھ	۱۸٦۷ء

مطبوعات

نمبر	نام کتاب	مصنف یا مؤلف	سن تصنیف ہجری	عیسوی سن
۱	تفسیر چراغ ابدی	سید عزیز اللہ ہمرنگ اورنگ آبادی	۱۲۲۰ھ	۱۸۰۵ء
۲	تفسیر ہفت پارہ	سید بابا قادری	۱۱۸۴ھ	۱۷۷۰ء
۳	قصص الانبیاء منظوم	مصنف غوثی	۱۲۰۳ھ	۱۷۷۷ء
۴	خزانۃ الفوائد	عبدالمحد	۱۲۰۳ھ	۱۷۸۸ء
۵	جوار اسرار اللہ	شاہ علی محمد جیو گام	۱۱۸۷ھ	۱۷۷۳ء
٦	احوال میت	قاضی محمد شمس الدین	۱۲۰۰ھ	۱۷۸۵ء
۷	رسائل تصوف	ہاشمی مرحوم	۱۱٦۰ھ	۱۷۴۷ء
۸	بوستان خیال	سید شاہ سراج اورنگ آبادی	۱۲۱۲ھ	۱۷۹۷ء
۹	مظہر العجائب	حکیم فخر الدین احمد	۱۱٦۳ھ	۱۷۴۹ء
۱۰	بدر انور	صفی	۱۱٦۰ھ	۱۷۴۷ء
۱۱	دلائل الخیرات	شاہ ولی اللہ	۱۱۸۳ھ	۱۷٦۹ء
۱۲	وجود العاشقین	بندہ نواز گیسو دراز	۱۱۰۴ھ	۱٦۹۳ء
۱۳	عقائد دینیہ	ضیاءالدین	۱۲۰۵ھ	۱۷۹۰ء
۱۴	علوم شریعت وطریقت	میر محمد چشتی	۱۱۰۳ھ	۱٦۹۱ء
۱۵	تحفۃ المجالس	راج کرن	۱۲۰۱ھ	۱۷۸٦ء
۱٦	فیوض العرف	ابوتراب	۱۱۷۴ھ	۱۷٦۰ء

۱۷	کتاب الدعا	محمد بن محمد حرزی (حاجی)	۱۱۸۲ھ	۱۷۶۲ء
۱۸	رسالہ میت	ابوبکر لاہوری	۱۱۸۲ھ	۱۷۶۸ء
۱۹	رسالہ قرات	ابن ابراہیم مصطفیٰ القادری	۱۱۱۰ھ	۱۶۹۸ء
۲۰	کتاب تصوف	عبداللہ انصاری	۱۱۶۳ھ	۱۷۴۹ء
۲۱	طرائق رفاعیہ	غلام رفاعی محمد رفیع	۱۱۶۰ھ	۱۷۴۷ء
۲۲	طریق بیعت	غلام رفاعی محمد رفیع	۱۱۶۰ھ	۱۷۴۷ء
۲۳	طریق حیدری	غلام رفاعی محمد رفیع	۱۱۶۰ھ	۱۷۴۷ء
۲۴	روح الارواح (تفسیر قل ھواللہ)	محمد حیات	۱۱۳۱ھ	۱۷۱۸ء
۲۵	روضۃ الشہداء	حسین الکاشی	۱۱۳۱ھ	۱۸۱۵ء
۲۶	رمقات محمدی	شیخ الزمان عرض محمد	۱۲۰۷ھ	۱۷۹۲ء
۲۷	رسالہ فن	سید ابوالعلیٰ احراری الحسینی	۱۲۰۷ھ	۱۷۹۲ء
۲۸	من موہن	مولوی محمد باقر آگاہ	۱۱۸۶ھ	۱۷۷۲ء
۲۹	رسالہ منظوم	محی الدین قادری مرحوم	۱۱۷۶ھ	۱۷۶۲ء

حواشی:

۱۔ تفصیلی مطالعے کے لیے درج ذیل کتب ملاحظہ کیجیے:

ولیم ایل لینگر، انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم، مترجم غلام رسول مہر، جلد سوم۔
جادو ناتھ سرکار،: تاریخ عالمگیر ثانی بحوالہ دلی سلطنت مغلیہ، جلد دوم، کلکتہ۔
ہاشمی فرید آبادی: تاریخ مسلمان پاک و بھارت، حصہ اول، کراچی، جلد دوم، ۱۹۵۳ء۔
محمد آرسی اور دیگر مصنفین: ہندوستان کی اعلیٰ سطحی تاریخ۔
میڈ وز ٹیلر: ٹھگ اور امیر علی ٹھگ کے تاریخی کارنامے: فکشن ہاؤس، لندن۔
طفیل احمد سید: مسلمانوں کا روشن مستقبل، دہلی۔۱۹۴۵ء۔
تھامس ولیم بیل: مفتاح التواریخ، مطبوعہ نول کشور، کانپور۔
عبدالسلام: تاریخ ہند بعہد برطانیہ، مطبوعہ حیدر آباد دکن، بحوالہ تنویر احمد علوی، لاہور، ۱۹۶۳ء۔
امسپیئر، مغلوں کی شام پر یسول، کیمبرج، ۱۹۵۱ء۔
احمد حبیب، جامع تاریخ ہند، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۴ء۔
ڈی ڈی کوسمبی، قدیم ہندوستان کی ثقافت و تہذیب تاریخی پس منظر میں، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو۔
غوری وقار حسین، برصغیر پاک و ہند کی قدیم تاریخ، کراچی، ۲۰۰۴۔
ساقی محمد المعروف مستعد خان، تاثر عالمگیری، کلکتہ ۱۹۷۰ء۔
جنید محمد خان، عالم عیسائیت تاریخ کے آئینے میں، القلم لاہور۔

ڈیوی رابرٹ ای،فریڈم،دی میکیلین کمپنی لندن،۱۹۷۰ء۔
کرینسٹن ایم،ہیومن رائٹس ٹوڈے،لندن،۱۹۶۴ء۔
لیکنن جی ایم،مترجم اسٹرابونیز جغرافیہکا،اسٹرابو،دی کونسل آف جغرافی،نیویارک،۔
ہیرلڈلیم،صلاح الدین ایوبی،مترجم محمد یوسف عباسی،بک کارنر شوروم،جہلم۔
الاربعی،محمد الحسین،الغزوالفکری،دارالعلوم،دمشق،۱۹۹۹ء۔
گستاؤلی بان،تمدن عرب،مترجم محمد جمیل،ادارۂ فکراسلامی،لاہور۔
اسد،محمد،دی روڈ ٹو مکہ،اسلام لینڈ،آسٹریلیا۔
فرینکلن جان،دی ایسٹ انڈیاان ساؤتھ ایشیا،ترجمہ،ازباحث،دی لائن،لندن،۔
عالم خورشید محمد،واقعات جنگ آزادی اور مسلمان،العلم اکیڈمی،جہلم۔
سرسیداحمد خان،عبداللہ ڈاکٹرسید،سنگ میل پبلیکیشنز،لاہور،۲۰۰۸ء۔
الصدیق الحسینی محمد تنزیل،برصغیر پاک و ہند کے تاریخی حقائق،دارالفکر،کراچی،۲۰۰۵۔
اکرام،شیخ محمد،''موج کوثر''،ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور،۱۹۸۸ء۔
مہر،غلام رسول،۱۸۵۷ء،شیخ غلام علی اینڈ سنز،لاہور،۱۹۷۱ء۔
انڈین انٹیلی جنس ریکارڈز،جلداول۔

۲۔ خلیق احمد نظامی (مرتبہ) تذکرہ شاکر خان: بحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات،مطبوعہ علی گڑھ،ص۱۶۲۔
۳۔ ایضاً۔
۴۔ مناظر احسن گیلانی،تذکرہ شاہ ولی اللہ،مطبوعہ: انٹرنیشنل پریس کراچی،طبع سوم،ص۲۴۹۔
۵۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ،دانش گاہ پنجاب،لاہور،۱۹۷۳ء، جلد۱۲۔ص ۹۳۵۔
۶۔ سرسیداحمد خان،تذکرہ اہل دہلی،انجمن ترقی اردو کراچی،۱۹۵۵ء،ص۵۷۔
۷۔ عبداللہ ملک،بنگالی مسلمانوں کی صدسالہ جدوجہد ۱۷۵۷ءتا ۱۸۵۷ء،مجلس ترقی ادب لاہور،ص۲۰۔
۸۔ ایضاً،ص۳۵۔
۹۔ ایضاً،ص۲۳۔
۱۰۔ ایضاً،ص۳۳۔

فہرستِ اسنادِ محوّلہ:

۱۔ ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ''،جلد۱۲،۱۹۷۳ء،دانش گاہ پنجاب،لاہور۔
۲۔ خان،احمد،سرسید: ۱۹۵۵ء،''تذکرہ اہل دہلی''،انجمن ترقی اردو،کراچی۔
۳۔ گیلانی،مناظر احسن: س ن،''تذکرہ شاہ ولی اللہ''،طبع سوم،انٹرنیشنل پریس کراچی۔
۴۔ ملک،عبداللہ: س ن،''بنگالی مسلمانوں کی صدسالہ جدوجہد ۱۷۵۷ءتا ۱۸۵۷ء''،مجلس ترقی ادب،لاہور۔
۵۔ نظامی،خلیق: ۱۹۵۲ء،(مرتبہ)،''شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات''،مطبوعہ علی گڑھ۔

ABSTRACTS

The Study of letters published in "Funoon".

The literary journal "FUNOON" is included in the most important journals in Urdu. It's vital part, consisting letters from the readers is named as 'Differences and impressions". This portion of the journal is highly valued. This part includes the opinion of the readers. Most of the writers of letters are editors and literary scholars that is why celebrated prose style is reflected in it. Several other notable researchers, scholars and critics have also written and commented on the literary importance of this journal. Invariably all the mainstream writers, critics and poets have contributed to this section of the Journal. These contribution have enriched Urdu Criticism.

محمد افضل جاوید

سیّد جاوید اقبال

مجلّہ ''فنون'' میں شائع ہونے والے قارئین کے خطوط کا مطالعہ

ادبی رسائل و جرائد اور مجلّات کسی بھی زبان کی ادبی، تنقیدی اور تحقیقی تاریخ میں نہ صرف بنیادی کردار ادا کرتے ہیں بلکہ زبان و ادب کے فروغ میں مرکزی کردار ادا بھی۔ رسالہ "فنون" کا شمار ایک ایسے ہی ادبی رسائل میں ہوتا ہے۔ اسے بھی اُردو زبان و ادب کی ترویج کے لیے ۱۹۶۳ء میں جاری کیا گیا اور اب تک اس کا سفر جاری ہے۔

اردو کے رسائل میں قارئین کے خطوط کی اشاعت بھی موجودہ دور میں تو ایک جزو بن چکی ہے۔ عام ادبی رسائل میں یہ حصہ ''قارئین کے خطوط'' کے نام سے شائع ہوتا ہے لیکن ''فنون'' میں شروع سے ہی اس گوشے کا نام ''اختلافات و تاثرات'' ہے۔ غالباً مدیر کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ قارئین کو یہ باور کروایا جائے کہ اُنھیں اپنے تاثرات کے اظہار کی مکمل آزادی ہے۔

کسی بھی شائع ہونے والے فن پارے پر تنقید کرنا تو قاری کا حق ہوتا ہے اگر قاری کسی فن پارے کو پسند کرتا ہے تو اسے اس کی داد دینے کا بھی پورا حق ہے اور اگر کسی فن پارے میں کوئی کمی محسوس کرتا ہے تو بھی اسے حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کر سکے۔ اختلافات و تاثرات کے اس اظہار کو قارئین نے بہت اہمیت دی اور ''فنون'' کے مدیر نے بھی۔ اس طرح یہ سلسلہ مستقل مزاجی سے جاری ہے، قارئین اور مدیر دونوں نے اس مجلّے کا معیار ادبی حوالے سے بلند کیا اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ تنقیدی دبستان

میں تبدیل ہوگیا۔

گوشۂ ''اختلافات وتاثرات کی اہمیت اوراس کی تنقیدی افادیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آصف ثاقب لکھتے ہیں کہ:

> ''میں نے ایک مرتبہ اس وسیلے سے بات کی تھی کہ ''فنون'' کے مطالعے کا یہ حصہ 'سچ پوچھئے' تو ایک مخصوص تنقیدی دبستان کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ یہاں ردوقبول کے باب میں "ذاتی اور غیر ذاتی" دلائل کے مہیا کرنے کا عمل از حد پسندیدہ ہے۔اس "مشغلے" میں نہ تو اتنا شور ہے کہ کان پڑی آواز بھی سنائی نہ دے اور نہ اتنا سہم ہے کہ منہ پر پھپھوندی لگ جائے۔مسائل کے چھیڑنے سے فنی رموز کھلتے ہیں، بات سے بات بڑھتی ہے۔'' [۱]

''اختلافات وتاثرات'' میں ادبی فن پاروں پر ابتدائی طور پر تنقیدی بحث کا آغاز کیا جاتا ہے۔''فنون'' کے ہر آنے والے شمارے میں، گزشتہ شمارے میں شائع ہونے والے بیش تر فن پاروں کے بارے میں قارئین کی آرا کو شامل کیا جاتا ہے۔اس سے جہاں تنقیدی مباحث کا آغاز ہوتا ہے وہیں گذشتہ شمارے کے مندرجات سے بھی آگاہی کا سلسلہ باقی رہتا ہے۔''فنون'' میں لکھنے والوں کی تعداد خاطر خواہ ہے۔جن میں سے بہت سے لکھنے والے پختہ کار اور کہنہ مشق ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے اس کاروانِ قلم میں شمولیت حاصل کرنے کے بعد نام پیدا کیا۔اسی طرح قارئین کے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے، اُن کی رائے کو اہمیت دینے اور اظہار کا موقعہ فراہم کرنے میں ''فنون'' نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

''اختلافات وتاثرات'' میں لکھنے والے بھی اہم لوگ ہیں جن میں سے سب کو احاطۂ تحریر میں لانا مشکل ہے۔لیکن جن افراد نے اس حصے میں تسلسل کے ساتھ حصّہ لیا ہے ان میں سے بھی کچھ اہم افراد کے نام درج ذیل ہیں:

آصف ثاقب، آغا افتخار حسین، اے۔بی۔اشرف، امتیاز علی خان، ارشد نعیم، اسلم کمال، افتخار مغل، اصغر وسیم، اصغر اقبال، انور سدید، اشفاق بخاری، اقبال ناظر، انور جاوید ہاشمی، انوار احمد، الطاف فاطمہ، ام عمارہ، ارجمند رفیق، آفتاب اقبال شمیم، احمد فقیہہ، افشاں زوار، اسو مان بیلن اوزکان، ارشد صدیقی، اظہر کاظمی، ادیب سہیل، اقبال منہاس، امجد الطاف، احمد نواز ملک، امتیاز الحق امتیاز، ارشد جاوید، احمد حسین مجاہد، امجد اسلام امجد، ارشد عروج، اسلم سراج الدین، ارشاد متین، افسر ساجد، ارشاد علی، اشرف عدیل، الیاس عشقی، ارشد محمود ناشاد، بلراج میر، پروین زیدی، پروین شاکر، تسنیم اختر، تاثیر وجدان، تنویر سپرا، جابر علی سید، جمیل یوسف، جمال نقوی، جاوید بسام، جاوید انور، حسین مجاہد، حامد سراج، حسین اختر، حسین شاد، حبیب اسد علی خان، حنیف فوق، خاور نقوی، خواجہ منظور حسین، خالد اقبال یاسر، خالد قیوم تنولی، خورشید بیگ،، خالد احمد، خورشید جاوید، خلیل رام پوری، خیر الدین انصاری، خالد مصطفیٰ، خالد خواجہ، دستگیر شہزاد، رضا ہمدانی، رفعت مرتضیٰ، ریاض حسین چودھری، سید ریاضی حسین، رضیہ فصیح احمد، رحیم انجان، رشیدہ رضویہ، رحمان فراز، رشید ملک، رانا غلام شبیر، زاہد فارانی، زید اللہ فہیم، سیتہ پال آنند، سلیم اختر، سید منیر، سلطان سکون، سلطان فریدی، سید عارف، سجاد بابر، سہیل احمد خان، شہاب صفدر، شہزاد منظر، شریف الدین اشرف، شفیع ضامن، شریف کنجاہی، شاہد جمشید، شاہدہ یوسف، شمیم حنفی، شوکت مہدی، شعیب آفریدی، صوفی عبدالرشید، صابر ظفر، صلاح الدین حیدر، صابر آفاقی، طارق ہاشمی، طاہر تونسوی، طالب انصاری،

ظہیر فتح پوری، ظفر سپل، عامر سہیل، عبدالقیوم، عرفان احمد عرفی، علی عباس جلالپوری، علی تنہا، عبداللہ جاوید، عبدالرحیم انجان، عابد شفیق، عابد ودود، عمیق حنفی، عطاالحق قاسمی، عبدالعزیز خالد، عزیز حامد مدنی، فاروق مونس، فروغ احمد، فہمیدہ ریاض، فوزیہ چودھری، فاروق خالد، قیوم راہی، قیصر تمکین، قاسم جلال، قیصر نجفی، کبیر بسمل، گلزار، گلزار بخاری، مشتاق احمد، منو بھائی، منصورہ احمد، محسن بھوپالی، مشکور حسین یاد، محسن علی سمشی، محمد امین، مصطفیٰ کریم، محمد انیس انصاری، میجر شہزاد نیئر، محمد ارشاد، مظہر محمود شیرانی، مسعود مفتی، محمد فیروز شاہ، محمد سلیم بھٹی، محمد اشفاق، محمد کاظم، ناہید قاسمی، نعیم الرحمٰن، نگہت مرزا، نجیب عمر، ناصر بشیر، ندیم نازی، نور محمد، قادری، ہارون الرشید، یوسف حسن، یوسف علی لائق، اور یٰسین بسمل وغیرہم۔

مذکورہ گوشے میں چوں کہ بعض اہلِ علم کسی علمی و ادبی مسئلے پر اپنے خیالات دیگر قارئین کو پہنچانا چاہتے ہیں تو اُس مسئلے پر وہ کوئی مقالہ یا مضمون نہیں لکھتے بلکہ مدیر کو خط تحریر کرتے ہیں، جسے مدیر شائع کر دیتا ہے اُس کے بعد قارئین اُس خط کے جواب میں اپنی اپنی آراء خط کے ذریعے مدیر کو بھیج دیتے ہیں، اس طرح مکتوباتی مذاکرہ ہو جاتا ہے جو معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ قارئین کے لیے دل چسپی کا باعث بھی ہوتا تھا۔"اختلافات و تاثرات" کی اسی خوبی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے محمد شہزاد نیئر رقم طراز ہیں:

> ''اختلافات و تاثرات کے صفحات بہت سا علمی و ادبی مواد سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔اس بار بھی بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوئیں بالخصوص یوسف حسن، عبدالقیوم فاروق مونس، اے۔بی۔اشرف، ظفر سپل اور عامر سہیل کے مکتوب فکر و نظر کے کئی در وا کر گئے۔''۲

تھوڑے سے صفحات پر مشتمل تجزیاتی تبصرے کو پڑھ کر قاری کے ذوق کی تسکین ہو جاتی ہے اس حوالے سے ارشد جاوید لکھتے ہیں کہ:''فنون کا حصہ اختلافات و تاثرات ایک عطر بیز ماحول کا تاثر پیدا کرتا ہے۔''۳

''فنون'' کے مذکورہ گوشے کی انھیں خوبیوں کی جانب متوجہ کرتے ہوئے خالد قیوم تنولی رقم طراز ہیں کہ:''اختلافات و تاثرات'' (خطوط) کے گوشے میں بیش تر مکتوبات اور تبصرے خاصے کی چیز ہیں۔''۴ قارئین چوں کہ مختلف طبائع کے حامل ہوتے ہیں لہٰذا وہ اپنی اپنی انفرادی سوچ کے مطابق مشورے دیتے ہیں۔مثلاً سہیل احمد خان ''فنون'' میں تنقیدی بصیرت کے حامل مضامین کے حق میں ہوتے ہیں محض نظموں کے انبار لگا دینا کافی نہیں سمجھتے وہ ادبی شعور کو اجاگر کرنے کے لیے تجزیاتی طریقہ کار کے قائل ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ: ''فنون'' کا تازہ شمارہ کچھ بے قابو سا دکھائی دیتا ہے... یوں نظموں کے انبار چھاپتے رہنے سے بات نہیں بنتی۔دراصل ہمارے ہاں چیزوں کے باطن میں چھپے ہوئے اسباب کا تجزیہ کرنے کی بجائے سہل الحصول کی طلب زیادہ ہے۔''۵

اسی طرح وسیم عباس اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اختلافات کا کالم یقیناً بے حد دل چسپ ہوتا ہے اور پڑھنے والا اس کے مطالعے سے بہت کچھ سیکھتا ہے مگر کیا یہ ''اختلافات'' کچھ زیادہ طول نہیں کھینچے جا رہے؟ تازہ شمارے کے سولہ صفحات کے "اختلافات" پر صرف دو اصحاب کا قبضہ، دونوں ہمارے محترم ہیں اور جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ بھی علمی لحاظ سے گراں بہا ہے۔مگر ان کے

مفصل ارشادات نے مجھ جیسے کتنے مختصر نویسوں کی صریح حق تلفی کی ہے۔''[۶]

قارئین کے یہ خطوط نمائشی نہیں ہیں اور نہ ہی اپنی ریٹنگ میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہیں بلکہ سنجیدہ قارئین اس سلسلے سے اس قدر مانوس ہو چکے ہیں کہ نہ تو اس گوشے کے نام کی تبدیلی کو گوارا کرتے ہیں اور نہ ہی ان کی جگہ کی تبدیلی کو اور اگر کبھی اس گوشے کے نام یا رسالے میں جگہ کی تبدیلی کا ذکر ہوتا بھی ہے تو قارئین اس عمل پر احتجاج کرتے ہیں۔ اس ضمن میں افتخار مغل نے نہ صرف ''اختلافات و تاثرات'' کی اہمیت کو نہ صرف قابلِ ستائش ٹھہرایا بلکہ انھوں نے اسے مخالفت اور موافقت کی بنا پر انقلاب کی روح قرار دیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ:

> ''اختلافات کے نام اور ان کی پلیسمنٹ" کی تبدیلی سے ابھی تک کمپرومائز نہیں کیا جا سکا۔ ''اختلافات'' کے نام میں کچھ ایسا سحر ہے کہ اب اس لفظ کے گرد اس کی روایت کے تلازمات کی پوری ایک ''گلیکسی"' گردش کرتی نظر آتی ہے۔ اس لفظ میں اپنی مخصوص کلاسیکیت کے علاوہ بھی شاید ایسا کچھ ضرور ہے کہ اس پر ''اختلافات'' ہی کا نام سجتا ہے۔ ''اختلافات''۔۔۔ جس میں چیلنج بھی ہے اور روح انقلاب بھی، انحراف بھی ہے اور اعتراف بھی، مخالفت بھی ہے اور موافقت بھی ہے۔ ''اختلافات'' کی ایک جہت ''اعترافات'' بھی ہے مختصر یہ کہ اگر ''اختلافات'' میں محض اختلافات ہی ہوں (جو نہیں ہوتے) تب بھی اختلافات میں اعتراف کی ایک جہت تو بہر حال موجود ہے، اس ضمن میں ''فنون'' کی ایک معتبر آواز جناب آصف ثاقب نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ ''اختلافات'' کا عنوان جو نقد معنوی کی ایک حیرت انگیز روایت میں، ڈھل چکا ہے۔ اپنی جگہ تنقیدی قدروں کی جان پہچان ہے۔''[۷]

قارئین کا وہ حلقہ جو ''فنون'' کا تسلسل کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے وہ اس گوشے کی تنقیدی آراء کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ ان کے خیال میں یہ ایک مربوط سلسلۂ تنقید ہے ایسے مدوّن کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ اس کی تدوین سے خاطر خواہ نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

ان تمام آرا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ''فنون'' میں قارئین کے شائع ہونے والے خطوط اپنی اہمیت و افادیت کے اعتبار سے کتنے اہم ہیں۔ اس میں ادبی فن پاروں پر تنقیدی آرا بھی ملتی ہیں اور تفہیم و تجزیہ بھی پایا جاتا ہے۔

ادبی رسائل میں شائع ہونے والے خطوط کئی حوالوں سے اہم ہیں خاص کہ قارئین کے یہ خطوط اظہارِ رائے کے حوالے سے قابل قدر ذخیرہ ہیں اور خاص ادبی حیثیت کے حامل بھی۔ ہر شاعر اور ادیب اپنا ایک خاص اسلوب رکھتا ہے جو اس کی شاعری اور نثر دونوں میں جھلکتا ہے۔ اس کی تحریروں کی خوبیوں کا عکس صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کس فن کار کو اپنے الفاظ پر کتنی گرفت ہے؟ اور وہ اظہار کے لیے لفظوں کا انتخاب کیسے کرتا ہے۔ جملوں کی ساخت، الفاظ کا چناؤ، تراکیب کا استعمال و دیگر لوازماتِ تحریر کو کس فنی چابک دستی سے استعمال کیے گئے ہیں یہ تمام خوبیاں اور خامیاں ان خطوط میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ خاور نقوی جب ''فنون'' میں شائع شدہ چند نظموں کے حوالے سے بحث کرتے ہیں تو نہ صرف نظموں سے آگاہی ہوتی بلکہ افتخار مغل کی تحریروں میں ادبی شعور کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ضیا جالندھری نے اپنی نظم ''شوریدہ'' میں فن کار کے اضطراب کو مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس نظم میں رواں بحر اور قوافی کے استعمال نے نغمگی کی دلاویز فضا کو جنم دیا ہے۔ زہرہ نگار نے نظم ''سنا ہے'' میں اس نکتے کو بڑی عمدگی کے ساتھ واضح کیا ہے کہ جب انسان وحشت اور درندگی پر اترتا ہے تو درندوں کو مات کر دیتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جنگل کے قانون کے نفاذ کی خواہش کتنی بڑی سچائی بن کر سامنے آتی ہے۔ خورشید رضوی نے عمرِ عزیز کی برق رفتاری کو موضوع بنا کو سالگرہ جیسی ظاہری مسرت افزا نمائش کے تناظر میں ایک منفرد زاویہ نگاہ پیش کیا ہے۔''[8]

تحریر شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مسعود مفتی اردو میں ایک ایسے ادیب کے حیثیت سے جانے جاتے ہیں جن کا اسلوب قارئین کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ ان کی شخصیت اپنے اندر ڈھلتی عمر کے ساتھ عجز کے پہلو کو بھی نمایاں کرتی ہے ان کا تحریر کردہ یہ خط بھی اس بات کی غمازی کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''... ''فنون'' کا شمارہ ۱۳۰ ملا۔ شکریہ۔ یہ میرے لیے دو خوشیاں لایا۔ پہلی خوشی اپنی شرکت سے ہوئی۔ چاہے وہ ماضی کی بازگشت ہی تھی اور دوسری خوشی شمارے کی پھبن سے ہوئی کہ ابتدائی لڑکھڑاہٹ کے بعد اب یہ سنبھل گیا ہے۔ اور ان شاء اللہ سابقہ آب و تاب بھی جلد ہی طلوع ہو گی۔ اس کے مندرجات کا مطالعہ تو اسی اطمینان سے کروں گا جس کا یہ حقدار ہے مگر آپ کی محنت اور ہمت کی داد بھی پیش کر رہا ہوں جس کا حصہ نیر حیات قاسمی صاحب بھی ہیں۔ ''فنون'' کے پرانے پرچوں سے میرے مضمون کا اقتباس شائع کرنے کا شکریہ۔ (اب یہ میری کتاب ''لمحے'' میں شامل ہے) مگر اس میں میرے لیے شرمندگی کا یہ پہلو بھی ہے کہ آپ سے وعدے کے باوجود اس شمارے کے لیے تازہ تحریر نہ بھیج سکا۔ وجوہات کئی ہیں۔ کچھ تو نئی کتابوں کی ترتیب کی وجہ سے ہے مگر ہر چیز پر حاوی حقیقت یہ ہے کہ آج کل سو فیصدی زندگی گزارنے کی بجائے اتنی ہی سمیٹتا ہوں جتنی عمر کی بندگی اجازت دیتی ہے۔''[9]

''فنون'' میں شائع ہونے والے قارئین کے خطوط اور ان کا اسلوب، اُن خطوط سے مختلف ہے جو روزمرہ میں لکھے جاتے ہیں اور ان کی خوبی یہ ہے کہ بظاہر تو خطوط ہیں لیکن چوں کہ ادبا اور شعرا کے تحریر کردہ ہیں اس لیے ان خطوط میں ادبی رنگ ملتا ہے۔ مثلاً محمد فیروز شاہ کا تحریر کردہ خط اس حوالے سے اچھی مثال ہے:

''فنون'' ۱۲۲، ملا اور عید کا مزا دوبالا ہو گیا! آپ کے اداریے نے قندِ مکرر کا مزہ دیا۔ شہد جتنا پرانا ہو اتنا ہی لذیز اور مفید ہوتا ہے۔ خلوص اور محبت کے خمیر میں گندھ کر تخلیق ہونے والے ہر لفظ کے ضمیر میں روشنی چمکتی ہے۔ روشن ضمیر لفظوں کی جاگیر سبھی کو نصیب نہیں ہوتی اس کے لیے اخلاص بھری عمروں کے نذرانے وقت کے ادوار میں پیش کرنا پڑتے ہیں تب کہیں جا کر حرفوں میں روشنی آتی ہے اور سطروں کے درمیان میں سے اولین گلاب کی خوشبو نکھار بانٹتی لہر اٹھاتی محسوس پڑتی ہے۔ سر پر بلند تحریر کی توقیر نامعتبر لمحوں کی دھول سے کبھی رفاقت نہیں کرتی... یہ تو راستہ ہی کوئی اور ہے۔ اعتبار اور اعتماد تو صدق و صفا کے معیار کا ہم سفر ہونے سے ملا کرتا ہے۔ اور سچائی محبت کی توانا کمک لے کر

آگے بڑھا کرتی ہے۔ دانش سچے لوگوں کے سینوں اور عملوں میں نور بھرتی رہتی ہے اور لوگ دانائی کا سرور آنے والی نسلوں میں ایک نا قابلِ تسخیر قوت کی طرح ظہور کرتا ہے۔ تو کامران حرفوں کی کہکشائیں تخلیق ہوتی ہیں۔ یہ زمین پر آسمان کی رفعتیں اتر آنے کی ساعتیں ہوتی ہیں جو کسی ایسے قلم کار کی نوائے کاملہ میں رنگ بھرتی ہیں جس نے عمر بھر محبتوں کو رواج دینے کا قرینہ اپنے مزاج کا وتیرہ بنا لیا ہو اور ایسا صرف وہی کر سکتا ہے جسے کشیدگیوں کو کشادگیوں میں بدل دینے کا ہنر ودیعت ہوا ہو۔۔۔ قلم تو محبتوں کا علم ہوتا ہے پھر اسے بے جا تعصّبات کا سفیر بنا کر الم کو رواج کیوں دیا جائے۔'' [۱۰]

ادب کے حوالے سے ممتاز کالم نگار اور ادیب منو بھائی کا ایک خط بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

''عہدِ حاضر کے بدنصیب تو وہ ہیں جو کہ فکر کی پگڈنڈی عبور کرنا چاہتے ہیں اور دھند کے پتھر مٹانے کی سعی لا حاصل میں اپنی زندگی ضائع کر دیتے ہیں۔ خوش نصیب تو کوہِ فکر کا راستہ ہی اختیار نہیں کرتے۔ چنانچہ کسی بھی صدی کے صدر دروازے سے گزرنے کے لیے انھیں اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تو عدالتِ وقت کی سزا سن کر بھی سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔ یا ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتے ہیں۔ جن کی یہ بے نیازی اُس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ "بلیک وارنٹ" نہیں آجاتے کہ اس کے بعد فاصلہ بہت کم رہ جاتا ہے۔'' [۱۱]

اردو ادبا کی فہرست میں سید مشکور حسین یاد کا نام بہت اہم ہے۔ ان کے بہت سے فن پارے ''فنون'' میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے ان فن پاروں کی اشاعت سے قارئین میں پزیرائی حاصل کی بلکہ ''اختلافات وتاثرات'' میں بھی اپنی آرا شامل کرتے رہے ہیں۔ ایک موقعے پر ''بین السطور'' کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''بین السطور بات کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ سوچنے سمجھنے والا آدمی اس پر خصوصیت کے ساتھ غور کرتا ہے۔ بین السطور کا نقصان یہ ہے کہ اگر بات کرنے میں احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو ساری بات ہی چوپٹ ہو کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً ''فنون'' کا تازہ شمارہ نمبر ۱۳۰، جنوری تا جون، ۲۰۱۱ء کے بین السطور میں پہلی دو باتیں کہی گئی ہیں اور واوین، میں مطلب یہ ہے کہ یہ باتیں کسی دوسرے کی ہیں۔ چلیے تو وہ پہلی باتیں یہ نہیں کہ ''جو پائے اچھے ہیں یا دو پائے بُرے ہیں'' دوسری بات ہے ''جھوٹ سچ ہے اور سچ جھوٹ ہیں'' اور یہ لیجیے تیسری بات بھی نکل آئی "جنگ امن ہے اور امن جنگ ہے'' پہلی بات کے حوالے سے آپ آدمی کو دو پایا کہیں گے اور اگر وہ جھک کر پاؤں کے ساتھ اپنے ہاتھ بھی چلانے لگے تو پھر آپ اسے کیا کہیں گے۔ لیکن آدمی دو پایا سے چو پایا بن سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ چو پائے اس طرح دو پائے نہیں بن سکتے۔ مگر آپ تیز و تند قسم کے گھوڑے پر بیٹھیں تو وہ دو ٹانگوں پر بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ چو پائے اور دو پائے دونوں ہی اچھے برے ہو سکتے ہیں۔ اب دوسری بات کی طرف آیئے "اگر جھوٹ سچ ہے اور سچ جھوٹ ہے۔'' تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہاں کوئی سچ ہے اور نہ جھوٹ حالانکہ یہاں سچ ہی سچ ہے جھوٹ تو ہم اسے کہتے ہیں یا اس وقت کہتے ہیں جب سچ ہماری نظروں سے غائب ہو یا ہم میں سچ کو دیکھنے کی صلاحیت نہ رہی ہو۔ لیکن امن اور جنگ والا معاملہ یا تو فساد جھوٹ اور سچ کی طرح کا نہیں ہے۔ جنگ میں آپ کو دوسرے کی پٹائی بھی کرنی پڑتی ہے اور دوسرے سے پٹائی کھانی بھی پڑتی ہے۔ ویسے تضاد کا مطلب اس

کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ آپ زندگی میں غور وفکر سے کام لیں۔غور وفکر کے بغیر آپ کا کسی وقت بھی پڑا ہو سکتا ہے۔ تضاد آپ کا پڑا نہیں کرتا بلکہ تضاد کی تو کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔آپ کی عدم توجہی آپ کا بیڑا غرق کر سکتی ہے اور کر دیتی ہے۔''[۱۲]

ارشد عروج ''اختلافات و تاثرات'' میں مستقل خطوط لکھنے والوں میں سے اور ہیں۔ان کے خطوط تنقیدی لحاظ سے بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔وہ اپنے ایک خط میں کہانی اور افسانے کے فرق کی بابت لکھتے ہیں کہ:

''افسانہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس کی تازہ کاری اور تہہ داری کبھی ختم نہیں ہو سکتی کیوں کہ افسانے کا تعلق زندگی سے ہے۔زندگی کی گوناں گونی اور بوقلمونی کی کوئی حد نہیں اس سلسلے میں لکھنے والوں کو ایک بات علی الخصوص یاد رکھنی چاہیے کہ ہر افسانے میں کہانی موجود ہوتی ہے۔مگر ہر کہانی میں افسانے کا ہونا ضروری نہیں۔کہانی اور افسانے کے فرق کو ہم بھٹہ خشت میں پکی ہوئی اینٹ اور کمہار کے آوے میں پکے ہوئے ظروف کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں دونوں میں مٹی استعمال ہوگی۔اسی طرح افسانہ نگار اپنی تیکنیکی اپچ سے کہانی سے افسانہ تراشتا ہے۔''[۱۳]

قارئین کے خطوط میں بعض مسائل جو ادب کی ترویج میں رکاوٹ بنتے ہیں اور قدغن لگا کر ادب میں رکاوٹ بنتے ہیں ان پر بھی ادبی انداز میں قلم اٹھایا گیا ہے۔یہ مباحث دلائل و براہین کے ذریعے ادبی راہ کو ہموار کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ایسی ہی ایک کاوش جو مسئلے کے سلجھاؤ کے حوالے سے قرار دی جا سکتی ہے۔اس خط کے اقتباس میں ملاحظہ کیجیے:

''ادب میں گروہ بندیوں اور اجارہ داریوں کا عفریت کتنے ہی زرخیز ذہنوں کو نگل چکا ہے اور تخلیق حسن کی کتنی ہی اسیرائیں حریم دیدہ و دل میں اترنے سے پہلے پہلے رزق زمین بن چکی ہیں۔حسد اور منافقت کا زہر نوک قلم میں سرایت کر جائے تو سچے حروف بھی قصر انا کی غلام گردشوں میں سانس کھینچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ایسے میں جذبے مہکنے کا ہنر کہاں سے سیکھیں گے۔معاصرانہ چپقلش اور کاروباری رقابت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔اپنے عہد کی دانش ہی اگر اخلاقی ضابطوں کی تمام حدود پھلانگ جائے تو پھر شریفانہ طرز عمل کی توقع کس سے رکھی جائے گی؟ شاید جاہ طلبی اور ہوس تشہیر ہمیں اپنا اشتہار آپ بننے پر مجبور کرتی ہے۔ہم اس ''اعتماد'' سے جھوٹ بولتے ہیں کہ سچ بیچارا احساس کمتری کا شکار ہو کر منظر نامے ہی سے غائب ہو جاتا ہے۔قتل گاہوں کا قیام کس کے اعمال نامے میں درج ہوگا؟ نیکی اور شرافت کب تک نیلام گھروں کی زینت بنے گی؟''[۱۴]

ادبی گروہ بندیوں اور بے بنیاد سہاروں سے ہٹ کر درست سمت کا تعین اور ایک ایسے معاشرے کی تخلیق جو لفظوں کی سچائی کا امین ہو، جو ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے والوں کا ساتھ دے اور جو اپنے اندر کی روشنی پر اعتماد کرے۔انھیں جذبات کی ترسیل کے حوالے سے ریاض حسین چودھری رقم طراز ہیں کہ:

''فنون'' قدم قدم پر سچائیوں کے آئینے سجا رہا ہے۔کسی کا اپنا چہرہ ہی گرد آلود ہو تو کیا کیا جائے۔ان گروہ بندیوں اور اجارہ داریوں کا طلسم بہر حال ٹوٹنا چاہیے۔آج کا ادیب بھی ان گنت خانوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔وہ گھپ اندھیروں میں جگنوؤں کی تلاش کا تو متمنی ہے۔لیکن اپنے اندر کی روشنی کی تلاش میں بوجوہ نہیں نکلتا۔وہ اپنے لفظ

کی سچائی پر ایماں کیوں نہیں لاتا؟ ضمیر کی آواز پر کان کیوں نہیں دھرتا؟ لوگ بیسا کھیوں کی تلاش میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو کیوں ضائع کر رہے ہیں؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ بیسا کھیوں کی مدد سے تھوڑی دور تک تو چلا جا سکتا ہے، باقاعدہ کسی دوڑ میں شریک نہیں ہوا جا سکتا۔ قوت برداشت سے محروم معاشرہ ہمیں اجتماعی خودکشی کے دہانے تک لے آیا ہے۔ ادیب بھی اسی معاشرے کا ایک حصہ ہے۔ آؤ سچے لفظ تخلیق کرنے کا منصب سنبھالیں۔ اپنے اندر روشنی کی قوت پر اعتماد کرنا سیکھیں اور افق عالم پر دائمی بشارتیں تحریر کر کے تاجدار کائنات حضور رحمت عالمؐ کے حضور گرامیؐ کے درِ عاطفہ سے رشتہ غلامی استوار کیے بغیر نہ تو ذہنوں کا زنگ اڑے گا اور نہ روحوں کا میل ہی دھویا جا سکے گا۔''[۱۵]

''اختلافات وتاثرات'' کے بعض خطوط تنقیدی نوعیت کے ہوتے ہوئے تو بہت سے تقریضی نوعیت کے بھی۔ مثلاً:

''منصورہ کی نظموں میں ایک ایسی نغمگی ہے جو روح کے تاروں پر ساز چھیڑ دیتی ہے۔ حالات ومسائل کی تھکن جو کئی روز سے بدن میں مقیم ہوتی ہے، منصورہ کی نظم پڑھ کر غائب ہو جاتی ہے۔ منصورہ کی نظموں کے لفظ جب روح کی ننگی شاخوں پر آ بیٹھے ہیں تو یہ شاخیں پھولوں سے لد جاتی ہیں۔ خزاں رت میں بہار کے جھونکے سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی۔''[۱۶]

خطوط نویسی کی ادبی روایت کو اگر ملحوظِ خاطر رکھا جائے تو مشاہیر کے خطوط یک جا شائع کیے جاتے ہیں اور ان کی حیثیت متعین بھی کی جاتی ہے اس طرح سے اگر کسی ادیب اور شاعر کے لکھے ہوئے خطوط جو "فنون" میں شائع ہوتے رہے ہیں ان کو بھی یک جا کیا جائے تو بہتر انداز میں نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود متنوع خطوط، بھی مختلف زاویہ ہائے نظر سے دیکھے جا سکتے ہیں اور ان کی ادبی حیثیت متعین کرنے کے لیے مختلف شعرا اور ادبا کے خطوط ایک ہی جگہ رکھ کر مطالعہ کیے جا سکتے ہیں۔

''فنون'' میں شائع ہونے والے قارئین کے خطوط ہمیشہ ''اختلافات وتاثرات'' کے نام سے شائع ہوتے رہے ہیں اور اگر کبھی کسی موقع پر اس کے نام کو تبدیل کرنے کی کوشش بھی کی گئی تو اسے مدیر اور قارئین دونوں نے قبول نہیں کیا بلکہ ان کے نزدیک اس کا سب سے مناسب عنوان ''اختلافات وتاثرات'' ہی قرار دیا۔ دراصل عنوان اپنے اندر خود اتنی معنویت رکھتا ہے کہ جو خود بخود ہماری توجہ تنقید کی جانب گامزن کر دیتا ہے۔ کسی تحریر کو محض پڑھ لینا کافی نہیں ہوتا بلکہ پڑھ کر اسے ہضم کرنا اور پھر اس کے بارے میں اپنی رائے دینا ہر قاری کا کام نہیں ہوتا، اس کام کے لیے منجھے ہوئے قارئین کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے قارئین جن کا مطالعہ وسیع ہو اور وہ فنی و فکری رموز سے آشنا بھی۔ اسے قارئین جب کسی فن پارے کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس فن پارے پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ جہاں تک تاثرات کی بات ہے، اس میں تو ایک فن پارے کو پڑھ کر اس کے بارے میں اس قدر اظہار کر دینا کافی سمجھا جاتا ہے کہ یہ فن پارہ کیسا ہے؟ لیکن جب اختلافات کی بات آتی ہے تو اختلاف کرتے ہوئے قاری کو یہ وضاحت کرنا ہوتی ہے کہ کس وجہ سے اختلاف کیا گیا ہے۔ اگر چہ یہ انداز کس فن کار کو گراں بھی گزر سکتا ہے لیکن اس سے نہ صرف اس فن پارے کا تخلیق کار سیکھتا ہے بلکہ بالواسطہ طریقے سے قارئین اور دیگر فن کار بھی راہ نمائی لیتے ہیں۔ بہر کیف علمی مباحث کا آغاز بھی خط سے ہوتا ہے اور انجام بھی خط پر ہوتا ہے

''اختلافات وتاثرات'' میں شائع ہونے والے خطوط جن اہم فکری اور فنی موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

فکشن: افسانہ، ناول، ڈراما، انشائیہ، سفرنامہ وغیرہم۔

شاعری: نظم، غزل، رباعی، وغیرہم۔

دیگر: اقبالیات، مضامین، مقالات، یادداشتیں، طنز و مزاح، تراجم وغیرہم۔

''اختلافات وتاثرات'' کا بنظرِ غائر جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس گوشے میں فن پارے کا فکری، فنی اور موضاعاتی حوالے سے بھی جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس رسالے میں افسانہ اور نظم کی تعداد دوسری اصنافِ ادب کے مقابلے میں زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ زیادہ جگہ بھی ان ہی کو حاصل ہوتی ہے گویا اس رسالے نے نظم اور افسانے کو پروان چڑھانے اور شعرا و ادبا کو اس جانب گامزن کرنے میں قابلِ ذکر کردار ادا کیا ہے اور ادبی روایت کی آب یاری میں نئے انداز اور پرانے انداز دونوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

''اختلافات وتاثرات'' میں فکشن میں نمایاں مقام افسانے کا ہے۔ دورِ جدید میں جوں جوں انسان عدیم الفرصتی کا شکار ہوتا جا رہا ہے تو وہ ایسی اصناف کی طرف متوجہ ہو رہا ہے جس میں وہ کم وقت میں مطالعے کا شوق پورا کر سکے اور زندگی کے نئے اور اچھوتے تجربات سے آشنا ہو کر تسکین حاصل کرے۔ چنانچہ افسانے نے نہ صرف اردو میں بلکہ دنیا کی بیش تر زبانوں کے ادب میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔

اردو میں افسانے کی روایت کا آغاز تراجم سے ہوا اور پھر اس کی پیروی میں یہ روایت روز افزوں ترقی کی جانب گامزن نظر آتی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس روایت کو پروان چڑھانے میں ''فنون'' کا بھی حصّہ ہے۔

اردو افسانے میں جب علامتی تحریک کا آغاز ہوتا ہے تو بہت سے افسانہ نگار اس رو میں بہتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ معروف افسانہ نگاروں کو جن کے ہاں علامت ایک خاص انداز سے تشکیل پاتی ہے اور ایک خاص مفہوم کی حامل ہے اس کو چھوڑ کر ایسے افسانہ نگار بھی سامنے آئے جن کے ہاں علامت کی تفہیم ایک چیستان بن جاتی ہے۔ عامر سہیل افسانے میں لایعنی علامتوں سے گریز کا مشورہ دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

> ''جدید اردو افسانے میں نت نئے تجربات ہوتے رہتے ہیں اور ہونے بھی چاہییں لیکن اگر ان تجربات کا حاصل زندگی سے دوری ہے تو اس سے بہتر ہے کہ ٹھوس روایت ہی کی پاس داری کی جائے۔ ان دنوں ہمارے ہاں واقعاتی افسانوں میں عسیر الفہم علامتوں میں لکھنے کا رواج عام ہے ایسے افسانے قاری کے ذہن میں چیستاں کی صورت میں گھر تو کر لیتے ہیں لیکن ان کے تفکر کو بیدار کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔''[۱۷]

انتظار حسین اردو افسانے کا سنگِ میل ہیں۔ افسانہ نگاری میں علامتوں کے استعمال میں ان کو ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔ محتاط اندازے کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامتوں کی تخلیق کے سلسلے میں انتظار حسین جیسی عمدگی کسی دوسرے افسانہ نگار کے ہاں نظر نہیں آتی۔ ''اختلافات وتاثرات'' میں ان کے افسانے ''وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے'' پر اقبال منہاس نے تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور ان کی

علامتوں یاجوج، ماجوج کو کام یاب علامت قرار دیا ہے۔ یہ ایسی علامت ہے جو آج کے دور پر چسپاں ہوتی ہے اور معانی کی تہہ داری کی وجہ سے ایک لازوال افسانے کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اقبال منہاس لکھتے ہیں:

> ''انتظار حسین کا افسانہ ''وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے'' انتظار حسین کی یہ علامتی کہانی اسلامی اساطیر کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ یاجوج اور ماجوج کا المیہ یہ تھا کہ وہ ایک ہی ماں کی کوکھ اور ایک ہی باپ کے خون سے جنم لینے کے باوصف اپنی نمائندہ نسلوں کو کرہ ارض پر انسان کی طرح رہنا نہ سکھا سکے۔ وہ لمحے جن کی آغوش میں اس کہانی نے جنم لیا اب وقت کی دہلیز سے پھیل کر قرنوں پرانے ہو چکے ہیں۔ وہ نصیحت آموز اشارے آج بھی زندہ ہیں جن کو بطریق احسن بروئے کار نہ لانے کے جرم کی پاداش میں یاجوج اور ماجوج کو مسلسل عذاب کی اذیتوں میں جھونک دیا گیا۔ انتظار حسین کی کہانی اتفاق اور اتحاد کا درس دیتی ہے۔ خصوصاً ملک کے موجودہ سیاسی حالات کی روشنی میں اس کہانی کی افادیت زیادہ روشن ہو جاتی ہے۔ اور صدیوں پرانے یہ دونوں کردار ہماری ملکی سیاست کے جیتے جاگتے کردار بن جاتے ہیں"۔ ۱۸

ظہیر بابر نے بھی علامتی افسانہ نگاری میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کے افسانے پر تنقید کرتے ہوئے خاور نقوی بتاتے ہیں کہ انھوں نے ایک تاریخی موضوع کو گہری سوچ اور تخلیقی مہارت کی بدولت جدت و انفرادیت سے ہم کنار کیا ہے۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

> "ظہیر بابر نے اپنے افسانے "بت کدہ" میں علامتی انداز میں تیسری دنیا کے عوام کے استحصال خاص طور پر استعماری طاقتوں کے زیر اثر مسلمانوں کے انحطاط کی موثر تصویر کشی کی ہے۔ یہ افسانہ خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں کے حوالے سے اس تاریخی المیہ کو سامنے لاتا ہے کہ کس طرح سات سمندر پار سے تاجروں کے روپ میں آنے والی قوم نے مسلمانوں کی تہذیب، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی کو تاخت و تاراج کیا۔ اور سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اسلاف کی قیمتی میراث کو بھی ان سے چھین لیا۔ گویا ایک طرح سے ان کے آباؤ اجداد کی قیمت لگائی اور انھیں ذلیل و رسوا کیا۔ یوں ظہیر بابر نے ایک تاریخی موضوع کو گہری سوچ اور تخلیقی مہارت کی بدولت جدت اور انفرادیت سے ہم کنار کیا ہے"۔ ۱۹

احمد ندیم قاسمی نے اردو میں افسانہ نگاری کی روایت کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پریم چند کے بعد دیہاتی زندگی کی منظر کشی کے حوالے سے ان کے افسانے بہت اہم ہیں۔ وہ ایک ایسے فن کار ہیں جو زندگی کے جذبات کو سمجھتے ہیں۔ سماج کا کھوکھلا پن اور زندگی کی بے اعتدالیاں اور پیچ رویاں ان کے افسانے میں اتنی خوب صورتی سے دکھائی گئی ہیں کہ کم ہی کسی دوسروں کے ہاں نظر آتی ہے۔ ہارون الرشید نے اپنے خط میں قاسمی کے ایک افسانے ''ہم سفر'' پر تنقید کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''ایک طویل عرصے کے بعد احمد ندیم قاسمی کا افسانہ دیکھا ''ہمسفر'' ان کے مہین تجربے اور کڑی مشقت کا ایک عکس ہے جس میں ہماری سماجی کج ردیاں بے اعتدالیاں اور فریب کی پرچھائیاں جھلکتی ہیں۔ ہمارے ہاں قدم قدم پر جو ایک کھوکھلا پن ہے۔ وہ اس افسانے میں جا بجا دستک دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ پورا افسانہ شروع سے لے کے اختتام تک ایک مسلسل مکالمے کا آہنگ ہے۔'' ۲۰

نچلے طبقے کی زندگی کو افسانے کا موضوع بنانے والے رفعت مرتضٰی نے کس طرح افسانے میں مخصوص زبان کا استعمال اور فنی مہارت سے کام لیا ہے۔ خاور نقوی نے اپنے خط میں ان کے افسانے ''جواب'' پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

''رفعت مرتضٰی کا افسانہ ''جواب'' بنیادی طور پر کردار کی کہانی ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار، شادو کا سسر ''اللہ بیلی'' ہے۔ اس کی بہو شادو، اُس سے چوری چھپے ملنے والے شکورے اور اُس کے صاحب کے کردار، بعد میں ابھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ معاشرے کے نچلے طبقے کی نفسیاتی کیفیت کو اس کے کرداروں کی مخصوص زبان میں فنی مہارت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور یہ افسانہ ایک خاص قسم کے کرداروں کی بھرپور عکاسی کرتا ہے"۔ [۲۱]

قارئین کے خطوط بعض اوقات کسی افسانے کے اس پس منظر سے بحث کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جس میں وہ تخلیق ہوا ہے۔ ہمارے ہاں سیاسی اور اشرافی طاقت کی رسہ کشی جاری رہتی ہے اور دونوں طاقتیں اپنے آپ کو منوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ کرپشن کا ناسور پوری دیانت کے ساتھ دندناتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اُردو افسانوی روایت میں تقسیمِ ہند کا موضوع بہت اہم ہے اس پر افسانے اور ناول قابلِ ذکر تعداد میں لکھے گئے ہیں اور شاید اب بھی لکھے جاتے رہے ہیں۔ ہندو مسلم فسادات اور دونوں طرف کی آبادی کو جن مشکلات سے دو چار ہونا پڑا اس حوالے سے واقعات اُردو افسانے کے موضوع بنے ہیں۔ عامر سہیل نے اسی حوالے سے، لکھے گئے، مرزا حامد بیگ کے افسانے پر تنقید کی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ:

''ڈاکٹر مرزا حامد بیگ فن افسانہ نگاری کے محقق اور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی ایک بڑے افسانہ نگار ہیں۔ ان کا حالیہ افسانہ ''کاتک کا ادھار'' ایک ایسے موضوع پر لکھا گیا ہے جو اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتا ہے۔ تقسیم کے بعد مسلم معاشرے کو جن ناگفتہ بہ حالات سے دوچار ہونا پڑا ان کے بارے میں ہمارے ادیبوں، خصوصاً افسانہ نگاروں نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس ''تقسیم'' کی وجہ سے غیر مسلم لوگوں کو سماجی اعتبار سے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کی عکاسی کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی گئی۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ افسانہ اسی تناظر میں ایک وقیع کاوش ہے۔ اس میں افسانے کے لیے نیا اور اچھوتا موضوع ڈھونڈ نکالنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ مرزا حامد بیگ نے جس باریک بینی سے ''تقسیم'' پر از سرِ نو نگاہ ڈال کر اپنے لیے ایک جیتا جاگتا موضوع تلاشا ہے اس کے لیے وہ یقیناً مبارک باد کے حق دار ہیں ان کا یہ افسانہ موضوع کی ندرت اور جاذبیت کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے۔'' [۲۲]

''فنون'' کے اس گوشے میں محض خوبیاں ہی بیان نہیں کی جاتیں بلکہ جہاں اختلافات کی گنجائش ہوتی ہے وہاں بے لاگ تنقید بھی کی جاتی ہے اور قارئین کسی بھی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے۔ مسعود مفتی کے افسانے ''ٹائم ایکسپریس'' کو بعض ناقدین ایک علامتی افسانہ قرار دیتے ہیں لیکن ایسے بھی قارئین ہیں جو اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ مثلاً ارشد عروج لکھتے ہیں:

''فنون'' میں شامل چند افسانے ایسے بھی تھے جو جمالیاتی اصول اور فنی مقتضیات پر پورا نہیں اترتے۔ مسعود مفتی کا افسانہ ''ٹائم ایکسپریس'' افسانہ کم اور تمثیل زیادہ ہے۔ بہت سے احباب کا خیال ہوگا کہ یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔ علامت اور تمثیل کے فرق کو واضح رہنا چاہیے۔ اس قصبے میں ماضی قریب کی تاریخ کو ''ٹائم ایکسپریس'' کی

تمثیل سے پیش کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ ہم قصہ پڑھتے جاتے ہیں اور سب کچھ ہماری سمجھ میں آ جاتا ہے۔ قصے کے انجام پر پہنچ کر ہم بہت کچھ سوچنے پر مجبور نہیں ہوتے کیوں کہ اس قصے کے مصنف نے افسانے کے فنی مقتضیات کو اپنے قصے میں نہیں برتا۔ اس کے باوجود ہمیں مصنف نے تاریخ اور تاریخیت سے گہری دل چسپی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔''[۲۳]

''فنون'' میں افسانے کے بعد جس صنف پر زیادہ توجہ دی گئی وہ نظم ہے۔ جن شعرا کی نظمیں شائع کی گئیں ان پر قارئین نے اظہار خیال کیا ہے۔ ''فنون'' میں نظم نگاری کی اس روایت نے نہ صرف نظم کو ایک کشادہ راہ پر گامزن کیا بلکہ اس کی آب یاری کے لیے بھی کوششیں کیں۔ مختلف شعرا کی نظمیں شاملِ اشاعت کی گئیں اور بعض اوقات شعرا کے نظموں کے انتخاب بھی شامل کیے گئے جس سے نظموں کے رجحانات کو سمجھنے میں آسانی ہوئی۔ افتخار مغل نظموں کی اشاعت کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''فنون'' ۴۲، ۴۳ میں شامل نظموں کو دیکھ کر احساس ہوا کہ ہمارے شعراء میں ان عصری مسائل کے تخلیقی ادراک کا حوالہ مستحکم سے مستحکم تر ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس شمارے میں ماحول کے حوالے سے کئی نظمیں شامل کی گئیں۔ ان میں گلزار کی نظم ''درختوں کا نوحہ''، محمود علی محمود کی نظم ''شہرِ بے صدا''، اسلم طارق کی نظم ''ہمیں سورج کا رستہ صاف رکھنا ہے'' اور خاقان خاور کی نظم ''دھرتی اور اس کے بیٹے'' ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ ماحولیات اور آلودگی کے حوالے سے محض موضوعاتی نظمیں ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ ان میں اکیسویں صدی کے اس سب سے زیادہ ''چیلنجنگ'' موضوع کی تخلیقی حسیت کسی نہ کسی صورت اجاگر ہوتی ہے۔ شاید یہ ماحولیاتی حسیت کا نتیجہ ہی ہے کہ اب ''ہوا'' ہماری شاعری کا ایک بلیغ استعارہ بنتی جا رہی ہے۔''[۲۴]

قیصر نجفی نے آفتاب اقبال شمیم اور گلزار کی نظم پر بحث کے دوران نئی ڈکشن کے حوالے سے بات کی ہے۔ زندگی میں سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی نئی علامتیں اور استعارے وجود میں آ رہے ہیں اور ان کا اظہار بھی نظموں میں ہو رہا ہے۔ اس حوالے سے قیصر نجفی لکھتے ہیں کہ:

''آفتاب اقبال شمیم کی مختصر نظم ''آنکھ کے روبرو'' ایسے لوگوں کی عظمت کا پردہ چاک کرتی ہے جو فرض کر لیتے ہیں کہ وہ بڑے لوگ ہیں۔ گلزار کی نظم ''رن وے'' اکیسویں صدی کی نظم ہے اور سفر حیات کی سائنسی لفظیات اور تلازموں میں تشریح و تعبیر کرتی ہے۔ ان کے استعارے، علامتیں، تلازمے، امیجری غرض تمام تر شعری تشکیلات اس عہد کی سب سے بڑی حقیقت سائنس کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں، بلکہ سائنس اور ادب میں ایک نوع کا تعلق قائم کرتی ہیں۔''[۲۵]

احمد ندیم قاسمی افسانیکے ساتھ نظم میں بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی نظمیں بھی اس فنون کی زینت بنتی ہیں اور ان پر بھی اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔ ارشد عروج کی قاسمی کی نظم پر تنقید، اصل میں ایک تاثراتی تنقید کا نمونہ محسوس ہوتی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ:

''جناب احمد ندیم قاسمی کی نظم ''یاد کا روزن'' بلا مبالغہ ۹۵ء کی بہترین نظموں میں سے ایک قرار پائے گی۔ اس نظم میں ایک کہانی مقید ہے۔ کہانی کا دھارا، فراز کوہ سے وادی کے نشیب کی طرف بہہ رہا ہے۔ اس نظم میں تختی پر پھیلتی

ہوئی گا چنی مٹی اور پھر اس گا چنی مٹی کے بطون سے حرف صوت کے پھیلتے ہوئے سفر کو (جس کا تعلق صرف شاعر کی ذات سے ہے) ساری کائنات پر پھیلتا بکھرتا دکھایا گیا ہے۔ دراصل یہی وہ عمل ہے جو جمود کو مستر د کرتا ہے اور تسخیرِ کائنات کا باعث بنتا ہے۔ دوسری طرف روحانی ترفع کی سطح پر ایک امی کو ورفعنا لک ذکرک کی منزل پر پہنچا تا ہے۔''۲٦

احمد ندیم قاسمی کے ہاں نظم کا فنی سفر آگے بڑھتا ہی رہا ہے۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ وہ انسان کے فطری جذبوں کو خوب صورتی اور سچائی سے نظم کے قالب میں اتار دیتے ہیں۔ خاور نقوی ان کی نظم ''حواس خمسہ'' کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

''احمد ندیم قاسمی نے نظم ''حواس خمسہ'' میں انسان کے فطری جذبوں کو حقیقت پسندی اور سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ندیم صاحب کی ہر نئی تخلیق کو پڑھ کر ایک خوش گوار حیرت ہوتی ہے اور ان کے فن نے کسی منزل کو آخر نہیں سمجھا۔''۲۷

تہذیب، اقدار اور وطن کی مٹی سے محبت جمیل ملک کی نظم ''پیوستگی'' میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ یہ نظم اگرچہ آغاز میں بہت عمدہ ہے لیکن نظم کا مجموعی تاثر آخر میں دھیما پڑ جاتا ہے۔ ہارون الرشید، اس نظم پر اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ:

''جمیل ملک کی نظم ''پیوستگی'' اس کلاس کی کہانی ہے جسے اپنے بزرگوں، تہذیب و تمدن، روایات اور مٹی سے گہرا انس ہے۔ یہ وہ کلاس ہے جو کسی بھی قیمت پر اپنی جڑوں اور شناخت سے کنارا نہیں کرتی۔ نظم کا آغاز نہایت گہری محبت سے ہوتا ہے لیکن کلائمیکس کی طرف پہنچتے ہوئے نظم کا عمومی تاثر دھیما پڑنے لگتا ہے۔''۲۸

منصورہ احمد کی بہت سی نظمیں ''فنون'' کی زینت بنی ہیں اور ان کی نظموں پر لکھا بھی گیا ہے۔ منصورہ دیگر خواتین شعرا کی بہ نسبت احمد ندیم قاسمی کے زیادہ نزدیک تھیں لہٰذا انھیں شاعری کے فنی رموز کی تخلیق پر قابلِ ذکر دست رس حاصل تھی اسی وجہ سے اُنھیں معیاری شاعری تخلیق کرنے کا موقع ملا۔ ہارون الرشید ان کی نظم ''ہم سب خواب میں زندہ ہیں'' پر یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ:

''منصورہ احمد کی نظم ''ہم سب خواب میں زندہ ہیں'' بھی زندگی کا وہ صحرا ہے جس کے ایک کونے سے لے کر آخری کونے تک کچھ بھی نظر نہیں آتا ہر طرف دھند اور اندھیروں کے بادل لہراتے ہوئے ملتے ہیں۔ لیکن اس کے اندر انھوں نے ایک امید کا در بھی کھلا رکھا ہے۔ جس سے نظم کا مجموعی تاثر ایک ٹھنڈے جھونکے کی طرح دل سے لپٹ جاتا ہے۔''۲۹

منصورہ کی ایک اور نظم ''مجھے میرا ملی تھی'' کے بارے میں شاہد یوسف نے اپنے خیالات لکھتے ہیں کہ:

''فنون'' ۱۱۰ میں منصورہ کی نظم ''مجھے میرا ملی تھی'' انسان کے ازلی اور ابدی دکھ کی بے مثال شعری تمثیل ہے۔ نسل انسانی کی بلا جواز مغائرتوں اور منافرتوں کی کرب انگیز صورت حال کا اپنے جذبہ و احساس اور سوزِ قلب کے لمس سے انھوں نے اس شعری واردات کو ایک معجزے میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ نظم ہر حساس اور ذہین انسان کے ذاتی المیے کی آئینہ دار تو ہے ہی لیکن منصورہ نے اپنی TREATMENT سے اس میں آفاقی اقدار کا عمق اور گہرائی پیدا کر دی ہے۔''۳۰

منصورہ احمد کی نظم نگاری سے متعلق افتخار مغل نے ذرا وضاحت کے ساتھ بات کی ہے۔ نظم کی اس شاعرہ کی بابت وہ لکھتے ہیں کہ:

''منصورہ احمد کی نظم پر بات ہونی چاہیے۔اس شاعرہ کے ساتھ میرا تنقیدی رشتہ عجیب دھوپ چھاؤں کا سا رہا ہے۔ مجھے کبھی اس پر غصہ آتا ہے اور کبھی فخر محسوس ہوتا ہے۔میں حیران تھا کہ یہ کیوں ہے، اس بار جناب یوسف حسن کے ایک جملے نے میری اس الجھن کو دور کر دیا۔انھوں نے لکھا ہے کہ ''فی الحال جو کچھ محسوس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انھوں (منصورہ) نے اپنا سفر وہاں سے آغاز کیا ہے جہاں پروین شاکر کی سہل اور سہانی مسافت ختم ہو رہی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ منصورہ سے ہم نے امیدیں ہی بہت زیادہ کی ہیں۔''۳۱

''فنون'' نے اردو نظم کی ترویج کے ساتھ شاعری میں دوسری جس صنف کو زیادہ اہمیت دی وہ غزل ہے۔غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو ہمیشہ سے شاد و آباد ہے اگرچہ بعض نقادوں نے اس کے بارے میں بڑے سخت جملے کہے ہیں لیکن غزل اپنے مزاج کے اعتبار سے ہر دل عزیز صنف ہے۔صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابہ گل بھی۔ بالکل اسی طرح غزل کی صورت حال ہے۔''فنون''میں اس دور کے بیش تر غزل گو کا کلام شائع ہوتا رہا ہے اور ''اختلافات وتاثرات''میں ان غزلوں پر بھی تنقیدی بحث ہوتی رہی ہے اور شعرا کی فکر پر بھی۔

''غزل ہماری تہذیب کی سادہ و پرکار تصویر بھی ہے اور غزل ہمارے اجتماعی لاشعور اور ہمارے باطن کی سرگوشی بھی ...اس میں عصری حسیت اور لمحے کی چاپ بڑی واضح سنائی دیتی ہے۔''۳۲

اس گوشے میں غزلوں پر جو بحث ملتی ہے۔وہ لمبے چوڑے مقالے کی صورت میں نہیں بلکہ اجمالی جائزے کے طور پر ہے۔ لیکن اس کے باوجود تنقیدی بصیرت کی جھلک اس میں بہت واضح طور پر ملتی ہے۔خاور نقوی نے ضیاء جالندھری کی غزل پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"''ضیاء جالندھری کی موجودہ دور کی غزلیں نظم کے تسلسل کے وصف کے ساتھ فکر وفن کی بلندیوں کو چھوتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی غزل میں حیات و کائنات کے مسائل اور روحانیت گہرے شعور کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔''۳۳

اردو شاعری میں قتیل شفائی غزل گو شعرا میں اہم مقام رکھتے ہیں اور ان کی غزلیں بھی "فنون" میں جلوہ گر ہوتی رہی ہیں۔ان کی غزلوں میں تغزل اور نغمیت کی جو موجودگی ہے وہ اعلیٰ درجے کی ہے۔ان کی غزل پر بحث کرتے ہوئے آصف ثاقب اپنے خط میں لکھتے ہیں:۔

''گستاخی پر محمول نہ ہو تو کہوں کہ زمانے کے بعد قتیل کی اچھی غزلیں پڑھیں۔تغزل اور نغمیت کا حسین امتزاج پیدا کرنا قتیل پر ختم ہے۔صد شکر کہ یہ مفروضہ باطل ہوا کہ قتیل کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا۔قتیل اردو غزل کا سرمایہ افتخار رہے غزل کی تاریخ میں اس کا شمار گنے چنے شعرا میں ہوگا۔''۳۴

قتیل شفائی کی غزل مسلسل بحث کا موضوع رہی ہے اور ان کی غزلوں کو ہمیشہ پذیرائی حاصل ہوئی ہے اس کے باوجود آصف ثاقب، قتیل کی غزل کو موضوع بناتے ہیں اور ان کے ایک بڑے غزل گو ہونے کے ساتھ اس کی غزل کی فنی وفکری جہتوں پر

اظہار خیال کرتے ہیں:

''قتیل شفائی کی غزل کی تشکیلات میں زمانوں کے فکری ارتقا اور اختلافات کی صورت گری رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں نظام شعر میں ترجیحات اور التزامات کا جو اخلاص قتیل شفائی کے ہاں آموجود ہوا ہے اس کی مثال آسانی سے نہیں مل سکتی۔ اس عہد کے ہر بڑے شاعر نے کوئی نہ کوئی نئی عظمت رواج دی ہے۔ مگر قتیل شفائی کا اسٹائل اسے فن شعر کی ایک بڑائی عطا کر رہا ہے... قتیل شفائی کو ہر بحر کے جذباتی پس منظر کو تفہیم کا پیش منظر بنا رکھنے کا ملکہ حاصل ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ کڑی سے کڑی بحر کو قتیل نے شیرینی نغمہ کا مقتول بنا کے رکھ دیا ہے۔''۳۵

غزل گو شعرا میں احمد مشتاق نے بہت کم لکھا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی غزل بہت معیاری اور اعلیٰ پائے کی ہے۔ جابر علی سید نے اس کی غزل پر اپنے خط میں جو رائے دی ہے وہ یہ کہ مشتاق کے ہاں انفرادیت ہے وہ جذباتی شاعر نہیں بلکہ اس کے ہاں ایک خاص قسم کی جدت ہے۔ جب کہ خالد خواجہ کی غزل رسمی اسلوب کی انفرادیت لیے ہوئے ہے ان کی شاعری پر عامر سہیل نے اپنے خط میں اظہار خیال کیا ہے کہ:

''خالد خواجہ کا مجموعہ کلام ''شہرِ تمنا'' صوری اور معنوی اعتبار سے خوب صورت اور لائق مطالعہ ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک خاص قسم کا تکنیکی تنوع ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جو روایتی اسلوب اور رسمی اظہار و بیان سے پاک ہے۔ فکر و نظر کا بلند شگفتہ اسلوب، صوری جمال او ادب عالیہ کے گہرے مطالعے نے ان کی غزل کو زندگی کا بلیغ استعارہ بنا دیا ہے۔ خالد خواجہ جیسے کہنہ مشق اور حساس شاعر شعر و سخن کی جادو نگری میں اپنا جادو جگاتے ہیں۔ ان کا یہ شعر تو زبان زد عام ہو چکا ہے۔

ے ہم ٹوٹ کے کرتے ہیں مری جان محبت
یہ کام کبھی حسبِ ضرورت نہیں کرتے''۳۶

احمد فراز کے غزلیں بھی ''فنون'' میں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ آصف ثاقب اُن کی غزل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''احمد فراز آج کے مقبول شاعروں میں سے ہیں۔ فراز نے اختراع میں حسنِ شعار، ذوق سلیم اور تصرف حسنہ کا مضمون پیدا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل پڑھ کر غزلیت کی ہمہ گیری محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ علامتوں کی ''ایجاز'' میں حسنِ روایت اور جمالِ جدت کا بہت بڑا آدمی ہے۔''۳۷

شہاب صفدر نے بھی اپنے خط میں ''فنون'' میں شائع ہونے والی غزلوں کے متعلق اپنی رائے بھیجی ہیں۔ وہ ''فنون'' کی زینت بننے والے شعرا میں سے چند کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ:

''غزل کے پہلے حصے سے ندیم کے گوہر پارے چننے کے بعد سلطان سکون، خورشید رضوی، حلیم قریشی، شوکت فہمی نصیر احمد ناصر اور دوسرے حصے سے احمد حسین مجاہد، رانا سعید دوشی، شاہین عباسی، حسن عباسی، ناصر حجازی، عادل حیات اور کرن اجالا کے ہاں گہری تخلیقی جرات نظر آئی، اب اپنے اپنے مزاج کی بات ہے ''فنون'' میں شامل غزلیں غیر معیاری تو نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کوئی تخلیق کم سے کم معیار تک آتی ہے تو درج ہوتی ہے۔ اعلی معیار پسند کا

تو پھر اپنا اپنا پیمانہ ہے۔'' ۳۸ؔ

''فنون'' میں غزل گو شعرا کی شمولیت اور ''اختلافات و تاثرات'' میں شائع شدہ غزلوں پر تاثرات اور اختلافات کم و بیش سبھی شماروں میں نظر آتے ہیں۔ غزل کا ہر شعر مکمل اکائی ہوتا ہے لہٰذا ہر غزل کے ایک ایک شعر پر محدود اوراق میں بحث نہیں کی جا سکتی غزل گو شعرا کے عمومی مزاج اور بعض خوبیوں کی طرف اشارے ہی کیے جا سکتے ہیں اور ان کے بارے میں چند تنقیدی اشارے ہی مناسب معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ خطوط بہر حال ان مضامین کی مانند نہیں ہوتے۔ تاہم غزل کی روایت کو آگے بڑھانے اور معیار کی بہتری کے لیے ''فنون'' کی یہ کاوش قابلِ قدر معلوم ہوتی ہے۔

گوشۂ ''اختلافات و تاثرات'' میں مزاح نگاری پر بھی قارئین نے اپنے خیالات بھیجے ہیں ان میں انور مسعود کا نام بہت اہم ہے۔ اردو شاعری میں اگرچہ مزاح نگاری کی روایت بہت مستحکم اور پرانی ہے۔ واعظ سے چھیڑ چھاڑ کا انداز ہو یا مزاحیہ کرداروں کی تشکیل مزاحیہ انداز نرالا معلوم ہوتا ہے۔ انور مسعود نے مزاح کے روایتی اسلوب کو نہیں اپنایا۔ انھوں نے مزاحیہ شاعری میں اپنا ایک خاص رنگ اور منفرد انداز متعارف کرایا ہے۔ خاص طور پر وہ ہماری معاشرتی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کو خوب صورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔ انور مسعود کے قطعات کے بارے میں محمد سلیم لکھتے ہیں:

> ''انور مسعود کے قطعات میں جہاں مزاح سے رنگا رنگ پھلجھڑیاں چھوٹتی ہیں وہاں ظاہر داری سے انسانی زندگی میں پیدا ہونے والے ذہنی انتشار، سماجی اونچ نیچ، معاشرتی افتراق اور احساساتی گھٹن، تہذیبی بحران، پرانی اور نئی اقدار کے تصادم کے محرکات کی طرف بھی روشن اشارے ہیں''۔ ۳۹ؔ

''رباعیاتِ فراق'' کے بارے میں قارئین نے اپنی رائے سے مستفید کیا اور قارئین نے اُن کی رباعیات کے ساتھ غزلیات کا تقابل بھی کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ فراق کی رباعیات سے حظ حاصل کرنے کے لیے ہندوستان کی ثقافتی اور ادبی روایت سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ ان کا مجموعہ ''روپ'' شائع ہوا تو انھیں بہت شہرت حاصل ہوئی۔ اس سلسلے میں عامر سہیل لکھتے ہیں:

> ''فراق گورکھپوری کا مجموعۂ رباعیات ۱۹۴۶ء میں ''روپ'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ان رباعیات کی جمالیاتی تہذیبی اور ثقافتی خوبیوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا تھا۔ ''روپ'' کی رباعیوں میں عشق و محبت کے تجربات، مشاہدات، کیفیات اور جنسی رموز پر اردو ادب کے بلند پایہ ادیبوں اور نقادوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ جو غیر معمولی شہرت فراق کی غزل کو ملی کم و بیش رباعیاتِ فراق کے حصے میں اتنی ہی شہرت آئی۔ فراق کی رباعیات سے حظ اٹھانے اور راست فہم حاصل کرنے کے لیے ہندوستان کی ثقافتی اور ادبی روایت سے واقف ہونا ضروری ہے۔ جب تک اس تناظر میں فراق کی رباعیات کا مطالعہ نہیں ہوگا یہ رباعیات اپنا مفہوم آشکار نہیں کریں گی''۔ ۴۰ؔ

آصف ثاقب نے رباعی کی تکنیک اور فن کے حوالے سے محمد ارشاد کے مقالے کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ اس سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں کہ:

> ''محمد ارشاد کا مقالہ: رباعی، تکنیک اور فن''، فنِ رباعی کی تکنیک پر سرمایہ مطالعہ ہے۔ اس میں غزلیت اور رباعیت کی

تفریق خوب آئینہ ہوئی ہے۔ یہ مضمون رباعیت کا تصویر نما ہے۔اس میں علمیت کے دلربا قرینے باب تفہیم کھولتے ہیں۔فن رباعی کی ضرورت یہ بھی ہے کہ متعلقہ ارکان کی نشست اس سلیقے سے ہو کہ اگر پہلے رکن کے آخر میں سبب دوحرفی ہے تو لازمی طور پر اس کے بعد آنے والے رکن کے شروع میں سبب موجود ہو اسی طرح اگر وتد (سہ حرفی) آخر پر ہے تو اگلے رکن کے شروع میں وتد ہو۔'' ۴۱

متفرق اصناف ادب پر اظہار خیال بھی قارئین کے خطوط میں موجود ہیں۔سفر نامہ نگاری اور چند سفر نامہ نگاروں کے حوالے سے اس گوشے میں اظہار رائے کا انداز سرسری ہے:

''سلمیٰ اعوان ابتدا سے سفر نامے لکھ رہی ہیں۔دیگر ادبی رسائل میں بھی ان کی سیر بینی سے محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔اب تو ان پر جہاں گشت ہونے کا یقین ہونے لگا ہے۔بہرحال سادہ بیانیہ انداز میں، کسی تصنع کے بغیر ان کی تحریر کا اپنا لطف ہے۔ان دیکھی دنیا کا حال سننا یوں انسان کا پرانا مشغلہ ہے اور اگر اسے داستان کے طلسم کاری بھی میسر آجائے تو کیف تحیر بڑھتا جاتا ہے۔۴۲

محمد کاظم، مستنصر حسین تارڑ، عطاالحق قاسمی، ڈاکٹر اجمل اور مسعود اشعر کے سفر نامے بھی ''فنون'' کے اوراق کی زینت بنتے رہے ہیں ان پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے شریف الدین اشرف لکھتے ہیں:

''پھر وہ سفر نامے میں جو ''فنون'' کی خصوصیت بن گئے ہیں۔ان تین شماروں میں محمد کاظم، مستنصر حسین تارڑ، اور عطاالحق قاسمی کے علاوہ ڈاکٹر اجمل اور مسعود اشعر کے سفر نامے بھی شامل ہیں اور یہ پانچوں سفر نامے اپنے اپنے رنگ میں بے مثال ہیں۔صرف ڈاکٹر اجمل کا سفر نامہ کہیں کہیں ''اسپیشلسٹانہ'' سا ہو گیا ہے مگر یہ ان کی مجبوری ہے آخر وہ نفسیات کے اتنے بڑے عالم ہیں، اگر ایک عالم نفسیات اپنے سفر نامے میں نفسیات کے موضوع پر نہیں لکھے گا تو کیا عطاالحق قاسمی کی طرح ان کونوں کھدروں میں جا بیٹھے گا جہاں عالم انسانیت اپنے سارے پردے اتار کر اپنی ابتدا کی طرف رجعت کرنا نظر آتا ہے؟ عطاالحق قاسمی کا مطالعہ کتنا شدید حد تک گہرا ہے، بعض مقامات پر تو میں کانپ کانپ گیا اور پھر اس کا دلربا انداز نگارش۔مستنصر حسین تارڑ تو خیر ایک منجھا ہوا سفر نامہ نگار تو ہے ہی اس کی تحریر میں اتنی جاذبیت ہے اور اس کا انسانی فطرت کا مطالعہ اتنا گہرا اور قریبی ہے کہ اس کا سفر نامہ شروع کرنے سے پہلے میں سارے ضروری کام نبٹا لیتا ہوں کہ ایک بار پڑھنا شروع کر دیا تو پھر مستنصر مجھ غریب کو کہاں جانے دے گا۔محمد کاظم کے سفر نامے میں جو باوقار متانت اور عمیق مخلصانہ مشاہدہ ہے۔اس کا جواب نہیں۔اگست کے شمارے میں ان کے سفر نامے کی قسط پڑھ کر یوں محسوس ہوا جیسے منہ بند کلی چٹک کا غنچہ بن چلا ہے۔مسعود اشعر صاحب سفر نامہ نگاری میں اوراضافہ ثابت ہوئے ہیں۔اتنی شگفتگی اور خوش مزاجی اس سے پہلے مجھے صرف عطاالحق قاسمی کے ہاں نظر آئی تھی یا پھر برسوں پہلے محمد خالد اختر کے سفر ناموں میں''۔۴۳

مقالات اور مضامین جو ''فنون'' میں شائع ہوتے رہے ہیں ان میں بعض اہل قلم کی فکری کاوشوں کی داد دینی پڑتی ہے۔علی عباس جلال پوری۔محمد کاظم، محمد ارشاد، افتخار مغل، آصف ثاقب، ہارون الرشید، جابر علی سید، ظفر سپل اور عامر سہیل وغیرہ ہم کے مقالات اعلیٰ پائے کے ہیں۔ان مقالات پر ''اختلافات وتاثرات'' میں تنقیدی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔اوراس کے مختلف شماروں

میں سوالات بھی اٹھائے گئے ہیں بلکہ بعض تنقیدی مضامین بھی لکھے گئے ہیں گویا باقاعدہ بحث کی شکل اختیار کر لی اور کئی شمارے ایسی بحث لیے ہوئے ہیں۔

محمد ارشاد کے مقالے ''مجذوب فرنگی'' میں عامر سہیل نے کچھ اعتراضات کیے تو ان کے جواب محمد ارشاد نے دیے۔ یہاں ''مجذوب فرنگی'' سے مراد نیطشے ہے'' اور عامر سہیل نیطشے کے بارے میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس کافر میں ایک وحدت کا رشتہ تلاش کیا جا سکتا ہے جب کہ محمد ارشاد کا خیال یہ ہے کہ نیطشے کو سمجھنا نہایت دشوار ہے۔ اس سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں:

''عامر سہیل صاحب کو تو واقعی دقت پیش نہیں آتی کہ وہ ارواح کو حاضر کرنے کا علم ''جانتے'' ہیں اور نیطشے کی روح تو مستقل طور پر انھیں کے آستانے پر حاضر رہتی ہے اس لیے نیطشے کے بارے میں ان کا علم براہ راست ہے جب جو چاہتے ہیں پوچھ لیتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کا انحصار نیطشے کے متون پر ہے وہ نیطشے کے افکار میں وحدت کے فقدان اور ان کے عدیم الفہم ہونے کی شکایت کرتے ہیں۔ جب کہ بجا طور پر عامر سہیل کا ''نیطشے کے افکار میں وحدت تلاش کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ لیکن وہ یہ بھی تو سوچیں کہ تثلیث کے پجاری نیطشے کے افکار میں ''وحدت کا رشتہ'' تلاش کر بھی کیسے سکتے ہیں نیطشے کے افکار میں ''وحدت کا رشتہ'' تو عامر سہیل سا موحد ہی تلاش کر سکتا ہے'' ۴۴

عامر سہیل نے محمد ارشاد کے مقالے، رباعی، تکنیک اور فن، پر ''اختلافات وتاثرات'' میں بحث کی ہے۔ انھوں نے خط میں محمد ارشاد کی بعض کمزوریوں کی طرف قارئین کو متوجہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اپنے مقالے ۱۲۲ میں تلوک چند محروم کی رباعی کو کمزور کہہ کر اس پر اصلاح دے ڈالی ہے اور ''فراق گورکھپوری کی تقریباً رباعیوں میں رباعیت مفقود'' اس بیان سے صرف یہ پتا چلتا ہے کہ انھوں نے فراق کی تقریباً سبھی رباعیاں پڑھ کر پھر یہ حکم لگایا ہے۔ میری طرح اور احباب بھی حیرت زدہ ہوں گے کہ اتنے اعلیٰ ذوق کا انسان اتنا ''مفقود الرباعیت'' رباعیوں کا انبار کیسے پڑھ گیا۔ محمد ارشاد صاحب لکھتے ہیں ''فراق کی کوئی سی چار ہم قافیہ رباعیاں لے کر ان میں سے ایک ایک مصرع لے کر چاروں مصرعوں کو چار مختلف ترتیبوں سے رباعی کی صورت دی جا سکتی ہے'' اور پھر انھوں نے کمال مہارت سے رباعی بنا کر دکھا دی ہے۔ اس نوح کی تبدیلی کم وبیش ہر رباعی گو کی رباعی میں کی جا سکتی ہے۔ غزل، قصیدہ اور مثنوی میں کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑ کے مصداق جو چاہیں بنائیں۔ ان مضحکہ خیز امکانات کی موجودگی سے کون انکار کر سکتا ہے۔'' ۴۵

تنقید کی روایت کو پروان چڑھانے میں رسائل کا کردار بہت اہم رہا ہے اور خاص طور پر ''فنون'' نے ''اختلافات و تاثرات'' کے ذریعے صلائے عام دی ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قارئین نے بہت آزادی کے ساتھ فکری، فنی موضوعاتی اور تنقیدی حوالوں سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ایک موقعے پر اشفاق بخاری نے مدرسانہ تنقید کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''برٹینڈ رسل نے یونیورسٹی اساتذہ کے بارے میں رقم کیا ہے کہ استاد کے ذہن میں ''مدرسیت'' کے آنے سے تخلیقی سرچشمے خشک ہو جاتے ہیں۔ ن۔ م راشد نے ڈاکٹر عبداللہ کے نام ایک خط میں بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے، اور اردو کے استاد نقادوں کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ ان کا تنقیدی شعور اورینٹل کالج سے آگے نہیں

بڑھا۔ آپ کسی بھی استاد سے میر، غالب، مومن، ذوق کے بارے میں بات کریں وہ سب تقریباً وہی اشعار سنائیں گے جو ڈاکٹر عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنی کتابوں میں رقم کیے ہیں۔'' [۴۶]

''فنون'' کا یہ گوشہ اس لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل ہیں کہ ان میں لکھنے والے تمام افراد کا تعلق کسی نہ کسی طرح ادبی دھارے سے ہے اور وہ مختلف اصناف سے ایک خاص دل چسپی رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں ایک خاص علمیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً تحقیقی معاونت کے اعتبار سے دیکھیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کون سے شاعر یا ادیب نے کون سا فن پارہ کب تخلیق کیا یا وہ پہلی بار کب اشاعت پذیر ہوا اسی طرح بہت سی کتابوں کے بارے میں بھی پتا چلتا ہے کہ وہ کب زیور طباعت سے آراستہ ہوئیں۔ بہت سے لوگوں کی وفیات کا ذکر بھی انھیں صفحات میں موجود ہے جو تحقیقی معاون کے طور پر ایک اہم ذریعہ ہے۔ اسی طرح خالص علمی و تحقیقی معلومات بھی اس گوشے میں موجود ہیں۔ شاعری کے فنی و فکری رموز پر بھی اظہار خیال جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ بعض مفکرین کے بارے میں بھی تحقیقی معلومات کا ذخیرہ انھی صفحات میں فراہم ہوتا ہے۔

لفظی تحقیق کے حوالے سے بھی بہت سی مثالیں بکھری ہوئی ہیں۔ آصف ثاقب نے شعیب آفریدی کی لفظی تحقیق جو ''قدمچہ'' سے متعلق تھی پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ:

> ''تازہ ''فنون'' کے اختلافات میں شعیب آفریدی نے لفظ ''قدمچہ'' سے بحث کی ہے۔ انھوں نے لفظ کے حصوں ''قدم اور چہ'' کو الگ الگ لیا ہے۔ اس ضمن میں مزید وضاحت یہ ہے کہ ''قدمچہ'' اسم تصغیر ہے اور ''چہ'' علامت اسم تصغیر باغیچہ اور صندوقچہ بھی اسی قبیل میں آتے ہیں ''چہ'' پر امالہ'' بھی وارد ہوتا ہے۔ مثلاً! وہ شخص باغیچے میں بیٹھا ہے۔ اس صندوقچے میں کیا ہے۔۔ پچھلے صحن میں چند قدمچے لگے ہوئے ہیں۔ تصغیر مزید کے طور پر انھیں باغچی اور صندوقچی اور قدمچی بھی کہا اور لکھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے علامت اسم تصغیر ''چہ'' میں اور شعیب آفریدی والے ''چہ'' میں نمایاں فرق ہے۔ قدمچہ کی ساخت میں عربی اور فارسی حصے آئے ہیں۔ مگر اس کا استعمال یکسر ہندی ہے۔ لفظ گلاب، گل اور آب سے بنا ہے دونوں حصے فارسی ہیں۔ گلاب کا استعمال ہندی ہے فارسی میں گلاب کے پھول کو گل کہتے ہیں اس وجہ سے بعض اہل فن گلاب کے ساتھ فارسی ترکیب روا نہیں رکھتے اس کے ساتھ فارسی ترکیب لانے والے لفظ کی ساخت کو سامنے رکھتے ہیں۔ ایسے الفاظ اور بھی کئی ہیں جن کی تشکیل یا تو فارسی ہے یا عربی مگر معنوی اعتبار سے ان کا استعمال ہندی ہے۔'' [۴۷]

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے بھی لفظی تحقیق کے حوالے سے امجد اسلام امجد کے ''مصحفی'' پر لکھے گئے مضمون کے حوالے سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ امجد کو مصحفی کے بعض الفاظ سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ امجد کے نزدیک وہ الفاظ انگریزی کے ہیں جب کہ ڈاکٹر شیرانی نے اس حوالے سے اُن الفاظ کا استعمال اور ان کے مصادر کا ذکر کر کے تحقیقی رویے کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ''اختلافات و تاثرات'' میں لکھتے ہیں۔

> ''...منظومات کے علاوہ محترم امجد اسلام امجد کا مضمون ''مصحفی کے تین دیوان'' دیکھ سکا ہوں۔ اس مضمون میں انھیں ایک چھوٹی سی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' [۴۸]

اسی طرح ''فنون'' میں شائع ہونے والی پروین شاکر کی ایک نظم کے ایک مصرعے کے بارے یہ ابہام پیدا ہو گیا کہ کیا یہ مصرعہ شریف کنجاہی کا ہے یا پروین شاکر کا۔ نظم کے شائع ہونے کے بعد خالد احمد نے اس پر اظہارِ خیال کیا جس پر پروین شاکر اور شریف کنجاہی نے وضاحت کی جس سے وہ غلط فہمی دور ہو گئی ہے۔ پروین شاکر لکھتی ہیں:

''تازہ شمارے میں جناب خالد احمد نے لکھا ہے کہ میری گزشتہ ماہ کی نظم کا پہلا مصرعہ، شریف کنجاہی صاحب کے لافانی مصرعوں میں سے ایک ہے۔ شریف کنجاہی صاحب اور خالد احمد صاحب میری اس نظم کو میری علمی کم مائیگی کا شاخسانہ سمجھ لیں۔ میں نے کنجاہی صاحب کی وہ نظم یا غزل واقعتاً نہیں پڑھی۔ بہر کیف میں خالد احمد صاحب کی ممنون ہوں کہ انھوں نے میری نظم کو اس کی اصل روح کے ساتھ سمجھا اور مجھے ایک حیرت آمیز توارد سے روشناس کیا۔''۴۹؎

شریف کنجاہی اسی سلسلے میں مزید وضاحت کرتے ہیں کہ:

''فنون'' کے تازے شمارے میں خالد احمد کا وہ جملہ غلط فہمی کا باعث بن سکتا ہے جس میں پروین شاکر کی نظم کے عنوان ''آج کی شب تو کسی طور گزر جائے گی'' کا ذکر کرتے ہوئے اسے میرے ایک مصرعے کے ساتھ توارد کی مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مجھے اس ضمن میں اسی قدر وضاحت کرنا ہے کہ چوں کہ وہ غزل آج تک کہیں چھپی ہی نہیں اور اس کا علم چند عزیزوں کو ہے اس لیے اس سے یہ گمان نہیں گزرنا چاہیے کہ وہ مصرعہ پروین شاکر نے کہیں پہلے پڑھا یا سنا ہوگا۔''۵۰؎

درج بالا دونوں اقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ توارد کی بنا پر دو شعراء کے ہاں ایک ہی طرح کا مصرع تخلیق پا سکتا ہے۔ لیکن تحقیقی طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ یہ توارد ہے نہ کہ سرقہ اور اس سچائی تک پہنچنے میں ہمیں ''اختلافات و تاثرات'' نے معاونت فراہم کی۔

مسلم دانش وروں اور فلاسفے کے حوالے سے بھی ''فنون'' کے صفحات میں تحقیقی مواد موجود ہے جس سے علم ہوتا ہے کہ کن مصنفین نے اس موضوع پر کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ تحرکات اور افکار و نظریات کی بابت بھی معلومات ملتی ہے جس سے وہ عظیم لوگ وابستہ رہے۔ خاور نقوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''مسلم فلاسفہ کے علم و دانش اور اس کے اثرات سے کوئی ذی شعور انکار نہیں کر سکتا۔ ان کی خرد افروزی کی بدولت یورپ نے اپنی جہالت کی تاریکیوں کو علم و حکمت کی روشنیوں میں تبدیل کیا۔ ''اخوان الصفا''، تحقیق و تدقیق اور معرفت و حکمت کی ایک ایسی ہی کڑی کا نام ہے۔ ڈاکٹر آغا افتخار حسین نے اپنی تصنیف ''قوموں کی شکست زوال کا مطالعہ'' میں اس کی طرف بلیغ اشارے کیے ہیں۔ محمد کاظم نے اس تنظیم کے افکار نظریات کو اپنے وقیع مضمون ''اخوان الصفا۔ عباسی دور میں مسلم اہل فکر کی ایک خفیہ تنظیم'' میں تحقیقی بصیرت کے ساتھ بیان کیا ہے۔''۵۱؎

مجموعی طور پر قارئین کے خطوط پر مشتمل ''اختلافات و تاثرات'' کا یہ حصہ جس میں بے حد معلومات افزا ہے اور ادبی تاریخ کا ایک اہم ماخذ بھی۔ احمد ندیم قاسمی کے بعد ناہید قاسمی اور نیّر حیات قاسمی نے جس انداز سے ''فنون'' کو زندہ رکھا وہ بلاشبہ قابلِ تحسین ہے لیکن یہ صرف ان کی ذمہ داری نہیں بلکہ تمام اہل قلم کی بھی ہے۔ زندہ قومیں اپنی اعلیٰ روایات کو زندہ رکھتی ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ذمہ داری ادیبوں/شاعروں کی ہی ہیں وہی علم و ادب کے پاسبان ہیں۔

حواشی:

۱۔ ''فنون''، لاہور، شمارہ:۱۱۳، مئی، دسمبر ۲۰۰۰ء، ص۲۹۰۔
۲۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۷، اپریل، اگست ۲۰۰۲ء، ص۳۲۰۔
۳۔ ایضاً، ص۳۱۶۔
۴۔ ایضاً، شمارہ ۱۳۴، اپریل، ستمبر ۲۰۱۳ء، ص۳۲۷۔
۵۔ ایضاً، شمارہ ۶، ۷، اپریل، مئی ۱۹۷۱ء، ص۱۲۳۔
۶۔ ایضاً، شمارہ ۳۴، اکتوبر دسمبر ۱۹۹۱ء، ص۳۴۱۔
۷۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۳، مئی دسمبر ۲۰۰۰ء، ص۲۸۷۔
۸۔ ایضاً، شمارہ ۴۶، جنوری، اپریل ۱۹۹۶ء، ص۳۱۰۔
۹۔ ایضاً، شمارہ ۱۳۱، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص۳۹۸۔
۱۰۔ ایضاً، شمارہ ۱۲۳، ستمبر، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص۳۱۸۔
۱۱۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۳، مئی دسمبر ۲۰۰۰ء، ص۳۱۶۔
۱۲۔ ایضاً، شمارہ ۱۳۱، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص۴۰۴۔
۱۳۔ ایضاً، شمارہ ۴۶، جنوری، اپریل ۱۹۹۶ء، ص۳۲۰۔
۱۴۔ ایضاً، شمارہ ۱۲۳، ستمبر، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص۳۰۲۔
۱۵۔ ایضاً، ص۳۰۲۔
۱۶۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۳، مئی، دسمبر ۲۰۰۰ء، ص۲۹۵۔
۱۷۔ ایضاً، شمارہ ۴۴، نومبر، دسمبر ۱۹۹۴ء، ص۲۵۳۔
۱۸۔ ایضاً، شمارہ ۱، ۲ مئی، جون ۱۹۷۰ء، ص۱۹۸۔
۱۹۔ ایضاً، شمارہ ۴۶، جنوری اپریل ۱۹۹۶ء، ص۳۱۱۔
۲۰۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۲، جنوری تا جون ۲۰۰۰ء، ص۳۲۰۔
۲۱۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۲، مئی دسمبر ۲۰۰۰ء، ص۳۲۸۔
۲۲۔ ایضاً، شمارہ ۴۴، نومبر، دسمبر ۱۹۹۴ء، ص۲۵۲۔
۲۳۔ ایضاً، شمارہ ۴۶، جنوری اپریل ۱۹۹۶ء، ص۳۲۱۔
۲۴۔ ایضاً، شمارہ ۴۴، نومبر دسمبر ۱۹۹۴ء، ص۲۵۰۔
۲۵۔ ایضاً، شمارہ ۱۲۳، ستمبر دسمبر ۲۰۰۴ء، ص۳۱۴۔
۲۶۔ ایضاً، شمارہ ۴۶، جنوری اپریل ۱۹۹۶ء، ص۳۲۰۔
۲۷۔ ایضاً، شمارہ ۴۶، جنوری اپریل ۱۹۹۶ء، ص۳۱۱۔
۲۸۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۲، جنوری، جون ۲۰۰۰ء، ص۳۲۰۔
۲۹۔ ایضاً، ص۳۲۱۔
۳۰۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۷، اپریل اگست ۲۰۰۲ء، ص۳۲۶۔
۳۱۔ ایضاً، شمارہ ۴۴، نومبر، دسمبر ۱۹۹۴ء، ص ۳۵۰ء۔
۳۲۔ ایضاً، شمارہ ۴۶، جنوری اپریل ۱۹۹۷ء، ص۳۲۰۔
۳۳۔ ایضاً، ص۳۱۱۔
۳۴۔ ایضاً، شمارہ ۵، ۶، اپریل، مئی ۱۹۷۵ء، ص۱۷۷۔
۳۵۔ ایضاً، شمارہ ۴۴، نومبر، دسمبر ۱۹۹۴ء، ص۲۵۶۔
۲۶۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۷، اپریل اگست ۲۰۰۲ء، ص۳۳۳۔
۳۷۔ ایضاً، شمارہ ۵، ۶، اپریل مئی ۱۹۷۵ء، ص۱۷۷۔
۳۸۔ ایضاً، شمارہ ۱۳۶، جولائی ۱۴ء مارچ ۲۰۱۵ء، ص۵۱۳۔
۳۹۔ ایضاً، شمارہ ۵، ۶، اپریل، مئی، ۱۹۷۵ء، ص۱۷۹۔
۴۰۔ ایضاً، شمارہ ۱۲۳، ستمبر، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص۳۰۰۔
۴۱۔ ایضاً، ص۳۱۷۔
۴۲۔ ایضاً، شمارہ ۱۳۱، جولائی، ستمبر ۲۰۱۱ء، ص۴۰۵۔
۴۳۔ ایضاً، شمارہ ۵، ۶، اپریل مئی ۱۹۷۵ء، ص۱۰۱۔
۴۴۔ ایضاً، شمارہ ۴۶، جنوری اپریل ۱۹۹۶ء، ص۳۰۸۔
۴۵۔ ایضاً، شمارہ ۱۲۳، ستمبر، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص۲۹۸۔
۴۶۔ ایضاً، شمارہ ۳۴، اکتوبر دسمبر ۱۹۹۱ء، ص۳۴۲۔
۴۷۔ ایضاً، شمارہ ۴۷، ۴۸، مئی دسمبر ۱۹۹۶ء، ص۳۱۶۔
۴۸۔ ایضاً، شمارہ ۱۳۱، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص۳۹۷۔
۴۹۔ ایضاً، شمارہ ۳، اگست ۱۹۷۴ء، ص۱۲۰۔
۵۰۔ ایضاً، ص۱۲۰۔
۵۱۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۳، مئی دسمبر ۲۰۰۰ء، ص۳۲۶۔

فہرستِ اسنادِ محوّلہ:

فنون: مئی تا جون ۱۹۷۰ء، اپریل تا مئی ۱۹۷۱ء، اگست ۱۹۷۴ء، اپریل تا مئی ۱۹۷۵ء، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۱ء، نومبر تا دسمبر ۱۹۹۴ء، جنوری تا اپریل ۲۰۰۰ء، مئی تا دسمبر ۲۰۰۰ء، اپریل تا اگست ۲۰۰۰ء، ستمبر تا اگست ۲۰۰۴ء، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۳ء، جولائی تا مارچ ۲۰۱۵ء۔

ABSTRACTS

The Literary contribution of Molaai Sheedai.

Rahim Daad Khan alias "Molaai Shaeedai" is a famous scholar of Sindhi language. He has done remarkable research works for the literary history of Sindh and religion. He was not only a literary figure but also an outstanding historian. His personality is very important specially for the Sindh. The list of his research work is very long. This article will have a look at his scholarly contributions .

ڈاکٹر نصر اللہ کابورو

مولائی شیدائی کی ادبی خدمات

سرزمین سندھ انسانی تاریخ وتہذیب میں قدیم روایت کی امین رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند پر لکھی جانے والی تاریخی کتب میں سندھ کے تاریخی تشخص کو اجاگر کیا گیا ہے۔ظہور اسلام کے بعد خالصتاً اسلامی علوم جیسے فقہ، فتاویٰ، تفاسیر اور تاریخ نگاری کے ضمن میں گراں قدر خدمات انجام دی گئیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔بیسویں صدی عیسوی میں یہاں متعدد علما و ادبا پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے اپنے میدانوں میں قابل ذکر کارنامے سرانجام دیے۔ان میں علامہ شبلی نعمانی، ہاشم علی خان، سید سلیمان ندوی، میر شیر علی، قانع ٹھٹھوی، میر معصوم شاہ بکھری، پیر حسام الدین شاہ راشدی اور رحیم داد خان المعروف مولائی شیدائی وغیرہم ممتاز اہمیت کے حامل ہیں۔اوّل الذکر تین شخصیات کا تعلق ہند سے جب کہ آخر الذکر تین کا تعلق سندھ سے ہے جو اب پاکستان میں شامل ہے۔ اس مقالے میں رحیم داد خان المعروف مولائی شیدائی کی فنی تاریخ نگاری کے حوالے سے خدمات کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

مولائی شیدائی بیسویں صدی کی جلیل القدر عظیم المرتبت شخصیات میں شامل ہیں۔آپ اپنے وقت کے فاضل و ادیب تھے۔ مولائی شیدائی کی سوانح پر لکھا تو بہت کچھ گیا ہے تاہم یہ مواد بکھرا ہوا ہے۔جس کی وجہ سے اہل علم حضرات بھی آپ کے علم و مرتبے سے کماحقہ آگاہ نہیں ہیں۔دوسری طرف آپ کے علمی کارناموں پر ایسی کوئی تحریر موجود نہیں ہے جس سے آپ کے علمی مقام کا تعین کیا جا سکے۔لہٰذا ضرورت اس امر کی تھی کہ مولائی شیدائی کی شخصیت و علمی و ادبی خدمات پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا جائے جس کے ذریعے ان

کے کارناموں کو منظرِ عام پر لایا جاسکے اور لوگ اس سے استفادہ بھی کرسکیں۔ مقالے کے پہلے حصے میں مولائی شیدائی کا تعارف جب کہ دوسرے حصے میں تصنیف ''جنت السندھ'' کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جائے گا۔

اللھنو ربروہی، مولائی شیدائی کے تعارف میں لکھتے ہیں کہ:

> ''رحیم داد خان بن شیر محمد خان بن میر رحیم داد حان بن میر محمد جمعہ خان اصل میں بلوچستان کے ایک گوٹھ کے رہنے والے تھے۔ آپ کے دادا میر رحیم داد خان سندھ میں تشریف لے آئے پہلے سہون میں اس کے بعد کوٹری میں آ کر سکونت اختیار کی جہاں آپ کے والد میر شیر محمد خان کی پیدائش ہوئی۔۱۸۴۳ء میں انگریزوں نے سندھ فتح کیا، میر رحیم داد خان انگریزی فوج میں بھرتی ہوئے اور حوالدار کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اس دور میں ریلوے لائن کوئٹہ تک بچھائی گئی تھی تب مولائی شیدائی کے والد شیر محمد خان محکمۂ ریلوے میں بھرتی ہوکر سکھر آ گئے، یہاں ۱۸۹۴ء کو مولائی شیدائی کی پیدائش ہوئی۔ رحیم داد مولائی شیدائی برصغیر پاک و ہند کے ایک مشہور بلند پایہ محقق اور مؤرخ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کی شخصیت خاص طور پر سرزمین سندھ کے لیے فخر کا باعث ہے، سندھی زبان، ادب اور تاریخ ان کے علمی اور ادبی کاوشوں پر جتنا ناز کرے، کم ہے مولائی شیدائی کا کہنا ہے کہ: ''اگر کوئی سمجھدار ہوتا ہے، تب وہ ایک طرف آدم شاہ کا ٹکڑا تو دوسری طرف میر معصوم شاہ کا مینارہ نظر آتا ہے ابتدا میں انھیں دو تاریخی جگہوں نے مجھ میں علم تاریخ کا شوق پیدا کیا۔''[۱]

مولائی شیدائی نے ابتدا میں ہندوستان پر مقالہ جات تحریر کیے۔ علی محمد راشدی کا کہنا ہے کہ سندھ کی تاریخ پر کام کرنے کی ضرورت تھی اس لیے آپ نے سندھ کی تاریخ لکھی ہے۔[۲] اس کے بعد مولائی شیدائی نے سندھ اور بلوچستان کی تاریخ کے بارے میں لکھنا شروع کیا۔[۳] مولائی شیدائی نے اپنی تحقیقی خدمات کی وجہ سے ملک بھر میں خوب شہرت حاصل کی اور اپنے ہم عصر علما اور مؤرخین میں نمایاں مقام حاصل کرلیا۔

(۱)

مولائی شیدائی نے سندھی ادب کے فروغ میں قابل ذکر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۳۵ء میں ملازمت کے دوران ''انجمن الاسلام'' میں ممبرشپ حاصل کی، میاں رحیم بخش اور پیر حسام الدین راشدی جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے۔ غلام نبی، پیر کرم علی شاہ اور مولائی شیدائی خاص معاون مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں سکھر میونسپل کارپوریشن نے شہر کے لیے براڈ کاسٹنگ اسٹیشن میونسپلٹی آفس کے ایک کمرے میں کھولا، جس کے اعزازی سیکریٹری مہر الٰہی شیر ہوئے، عبدالرزاق اور مولائی شیدائی اس کے اعزازی ممبر منتخب ہوئے۔[۴] ۹؍جولائی ۱۹۵۴ء میں سکھر میں سچل سرمست کے سالانہ عرس کے موقع پر ''جوہر پارک'' سکھر میں مولائی شیدائی کی زیرِ صدارت ادبی کانفرنس کا انعقاد ہوا، جس میں مختلف مقالات پڑھے گئے اور خیر پور ڈویژن کے فن کاروں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ ۱۹۵۹ء میں پاکستان رائٹر گلڈ قائم ہوا اور لطیف اکیڈمی ختم ہوگئی۔ سکھر رائٹر گلڈ کے سیکریٹری آفتاب صدیقی مقرر ہوئے۔ شیخ ایاز، شیخ راز، رشید بھٹی، سید محسن شاہ، حمید عظیم آبادی،

حسن حمید اور مولائی شیدائی اس کے ممبر منتخب ہوئے۔

مولائی شیدائی نے تاریخی لحاظ سے سندھی زبان کی بے پناہ خدمت کی ہے۔ جو کسی تعارف کی محتاج نہیں بلکہ یہ سندھی ادب کے لیے ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ عام تاثر یہ ہے کہ تاریخ نویس زیادہ تر بادشاہوں، امیروں و رئیسوں کی مداح کرتے ہیں، لیکن مولائی شیدائی نے ہمیشہ حق اور سچ لکھا، کبھی بھی اپنے قلم کو کسی کی خوشامد کے لیے استعمال نہیں کیا۔[۵] اور سندھی ادب کی خاطر اپنی سرکاری نوکری کو بھی خیر باد کہا۔ ۲۴ گھنٹوں میں ۱۴ گھنٹے لکھنے پڑھنے کا کام کیا کرتے تھے۔ اُن کے پاس جو لوگ آتے تھے وہ ان کے تاریخی کام میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے، ان میں خاص طور پر رشید بھٹی، مقبول صدیقی، پروفیسر رحمت فرخ مجادی، اللہ جڑیو انصاری، ایاز قادری، اسلم مودودی لاہوری، عبدالکریم گدائی، غلام محمد گرامی، برکت علی آزاد، عطا محمد حامی، فیض بخشاپوری، میمن عبدالمجید سندھی اور دیگر اہل قلم اور اہل ذوق حضرات شامل ہیں۔[۶] مشہور و معروف جرمن اسکالر اور ماہر اقبالیات این میری شمل نے بھی ۱۹۷۰ء کی دہائی میں پورا دن مولائی شیدائی کے ساتھ سندھی زبان و ادب، سندھ کی تاریخ سے متعلق گفتگو میں گزارا۔ ۱۹/اگست ۱۹۷۴ء کی شب پاکستان ٹیلی وژن، کراچی نے مولائی شیدائی کے بارے میں ایک نہایت اہم پروگرام نشر کیا جس میں وہ انٹرویو بھی شامل تھا، جو کہ شیدائی منزل میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔[۷]

مولائی شیدائی نے سندھ اور بلوچستان کی تاریخ پر بہت کام کیا، بے شمار مقالات لکھے ہیں، جو سندھی اور اردو کے بہت سے اخبارات اور رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ یہ مقالات اور دیگر تصنیفات سندھ کی تاریخ، ثقافت، علما اور صوفیا و بزرگان دین کے حالات زندگی کے تذکروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ صحیح معنوں میں سندھ کے تاریخ دان اور ترجمان تھے، آپ نے سندھ کے قدیم ادوار کی عوامی زندگی کی حالت، سماجی اور معاشرتی باتوں کا ذکر اپنے تحقیقی مقالات اور تاریخی کتب میں جا بجا کیا ہے۔ ان کی نظر میں تاریخ کا علم دوسرے علوم سے زیادہ دل چسپ اور منافع بخش ہے۔ مولائی شیدائی کے تاریخی مقالات اور ان کی تصنیفات کے دل چسپ جائزے سے پہلے تاریخ کے علم اور فن پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بات اچھی طرح ثابت کی جائے گی کہ مولائی شیدائی تاریخ پر مقرر کی ہوئی مان اور ماپ پر کس نمونے سے کاربند رہے تھے نیز تاریخ کے مروجہ اصولوں کو کس طرح استعمال کیا گیا ہے؟

تاریخ، تہذیب اور تمدن کا آئینہ ہے، جس میں انسانیت کے خدوخال اپنی تمام خوبیوں، خامیوں اور وضاحت کے ساتھ دیکھنے میں آتے ہیں۔ انسانی تہذیب جب اپنے قدم ارتقائی منزل کی طرف بڑھاتی ہے اور اسے کن دشوار گزار مراحل سے گزرنا ہوتا ہے، یہ تمام روداد جب لفظوں کی شکل اختیار کرتی ہے تو تاریخ کا جنم ہوتا ہے۔ دراصل تاریخ ایک ایسا موضوع ہے جس کے ذریعے انسان اپنے گھر میں بیٹھے بیٹھے دنیا اور ملکوں کے حالات کا جائزہ لے سکتا ہے اور ان تجربات سے بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ قوموں کے عروج و زوال، زندگی اور موت کا تعلق تاریخ کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور سچ پوچھیں تو تاریخ ہزاروں سال کے انسانی تجربات کا ایک مجموعہ ہے۔ فنِ تاریخ نگاری اگر ایجاد نہ ہوتا تو ہزاروں سالوں کی انسانی جدوجہد، کارناموں کا احوال اور ان کا انجام وغیرہ کا کچھ اتا پتا نہ ہوتا۔ فنِ تاریخ سے ہر دور میں اقوام اور لوگوں کو خاص دل چسپی رہی ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ انسان کو

اپنے ماضی کے ساتھ انتہائی گہرا اور دلی لگاؤ ہوتا ہے یوں تاریخ ماضی کے احوال کا مطالعہ کرنے کے ساتھ حال کو سمجھنے اور مستقبل کو سنوارنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ تاریخ یہ بات بھی واضح کرتی ہے کہ بدلتے حالات انسانی زندگی کے معاملات کتنا زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں، لہٰذا تاریخ سے باخبر ہونا ہر باشعور شہری کے لیے بھی بہت ضروری ہے تاکہ اس کی نگاہ میں وسعت اور ذہن میں کشادگی پیدا ہو جائے۔ ایک شہری اور علمِ تاریخ کے درمیان طالب علم اور استاد والا رشتہ قائم ہونا چاہیے۔

سندھ کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس وقت تک کوئی بھی جامع مستند اور مرتب کتاب نہیں لکھی گئی۔ اردو، سندھی، عربی، فارسی اور انگریزی میں جو بھی تاریخیں ملتی ہیں ان میں صرف حکمرانوں کی مرضی سے لکھوائی ہوئی باتیں یا کوئی خاص دور کا مختصر احوال دیا گیا ہے، جو کہ فنِ تاریخ کے اصولوں کے سراسر خلاف ہے۔ ایسی تاریخوں میں صرف غیر ضروری اور بے سود باتیں، کرامتیں اور بدعتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اسی بددیانتی کو دور کرنے کے لیے مولائی شیدائی نے قلم اٹھایا اور اس مقصد میں کافی حد تک کام یاب بھی ہوئے۔

(۲)

ہمارے پاس سندھ کی جو بھی تاریخیں دست یاب ہیں، وہ ۴۵۰ء سے شروع ہوتی ہیں، ان تاریخوں میں تمدنِ سندھ کو تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا ہے۔ جدید تحقیق کرنے والے آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے ثابت کر دکھایا ہے کہ سندھ کا تمدن پانچ ہزار سال قبل مسیح قدیم ہے، اس تاریخی مغالطے کو دور کرنے کے لیے مولائی شیدائی نے کتاب ''جنت السندھ'' تصنیف کی۔ جس میں سندھی زبان کو محدود اور مختصر ادب کے ساتھ منسلک کرنے کے عمل کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس تاثر کو بھی زائل کرنے کی کوشش کی ہے کہ سندھ کی تمدنی تاریخ یہاں کے سیاسی پس منظر میں گم ہوگئی ہے۔ مولائی شیدائی نے مذکورہ کتاب کی تیاری میں جن دیگر کتابوں سے مدد لی ہے ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔ نیز کتاب کے مطالعے کو قابلِ فہم بنانے کے لیے نقشہ جات اور تصاویر سے بھی مدد لی گئی ہے جب کہ ماخذ و مصادر کی فہرست اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ مذکورہ معلومات کو طوالت کے پیشِ نظر اس مقالے میں شامل نہیں کیا جا رہا ہے۔

صوبۂ سندھ حقیقت میں ایشیا و برصغیر اور موجودہ پاکستان کا ایک بڑا تہذیبی صوبہ ہے۔ کچھ مؤرخین نے سیاسی اور مذہبی تعصب کی وجہ سے سندھ دھرتی کو جو کہ تاریخی لحاظ سے بہت اہمیت کی حامل ہے، میں صرف لڑائی جھگڑوں اور فساد کا ذکر کیا ہے، گویا اُن کے نزدیک اسلامی دور محض جاہلیت کا دور تھا۔ بعض انگریز تاریخ دان اس خوش نصیب صوبۂ سندھ کو ناخوش اور بدنصیب وادی کے نام سے پکارتے ہیں، حالانکہ سندھ پورے ایشیا بھر میں ایک زرخیز ملک ہے اور اسے پاکستان میں ریڑھ کی ہڈی جیسی حیثیت حاصل ہے اسی اہمیت کے پیشِ نظر کتاب کا نام ''جنت السندھ'' رکھا۔ ایک جلد پر مشتمل ''جنت السندھ'' کو سندھی پڑھنے والوں کے حلقے میں بے مثل پذیرائی ملی۔ یہ پہلے ۱۹۵۸ء میں سندھی ادبی بورڈ کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی۔ مصنف نے اس میں بادشاہوں، درباریوں چوہدریوں کے قصوں کے بجائے حقائق کو پیش کیا ہے۔ جو نہ صرف آپ کے علمی ذوق کا پتا دیتی ہے بلکہ اس کے ذریعے فنِ تاریخ نگاری کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ حوالہ جات شامل کرنے کے لیے موجودہ اصول و ضوابط اس وقت لازمی نہ تھے بس مصنف کے پیشِ نظر یہ ہوتا تھا کہ کسی طرح بھی اپنی تحریروں کو عوامی بنایا جائے۔ مولائی شیدائی نے ''جنت السندھ'' میں سندھ کے مختلف ادوار کے تمدنی، معاشرتی اور ادبی

محرکات کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ تصنیف سے نہ صرف عام قاری بلکہ تاریخ سے شغف رکھنے والے بھی پانچ ہزار سال قبل مسیح سے ۱۸۴۳ء تک کے سندھ میں وقوع پذیر ہونے والے حالات کا بخوبی مطالعہ کر سکتے ہیں۔

آٹھ سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب مختلف تاریخی ادوار کے لحاظ سے آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جسے شمس العلما ڈاکٹر عمر بن داؤد پوتہ کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔[۹] پہلے باب میں سندھ کی قدیم حدود، نام، سندھ میں رہنے والی قدیم اقوام، قدیم تاریخ سندھ پر باہر کی اقوام کا قبضہ، سندھ پر مجوسیت کا اثر گپت خاندان، ہوش کی حکومت، بدھ درہم قوم کا زوال، راجپوت ریاست، سندھ کے بت خانے ہنگلاج وغیرہ کو پیش نظر رکھا گیا ہے جب کہ دوسرے باب میں جو ۶۷ صفحات پر مشتمل رائے گھرانے، سندھ کے شہر، برہمن خاندان، راجہ داھر، پارسیوں کا سندھ اور گجرات میں پہنچنا، عربوں کا ہندوستان پر قبضہ، سندھ کے راجہ کی اسلامی سلطنت سے چھیڑ چھاڑ، عربوں کا سندھ پر قبضہ کرنا، بنوامیہ کا سندھ میں گورنر ہونا (۹ گورنر کا تذکرہ)، عباسی خلافت کا زمانہ، گورنر سندھ پر طاہریوں، ہباریوں اور بند کندہ والے کا قبضہ، سندھ کی عربی ریاستوں، عربی دور میں سندھ کی تہذیب، صنعت وحرفت کا تذکرہ شامل ہے۔کتاب کے تیسرے باب میں جو کہ ۳۱۳ صفحات پر مشتمل ہے، میں ان خارجی فرامطی اور غزنوی خاندان حکومت، ان کی فتوحات اور علم پروری کا، نظام پر قبضہ کا احوال، کے علاوہ سندھ میں اردو کی ابتدا، عربی سندھ قبیلہ، سماٹ قبیلہ اور عربوں کے دور میں ہندو ریاستوں کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے۔آخر میں تغلق، غلام خاندان کا دورِ حکمرانی اور مغلوں کے دورِ حکومت میں تمدن اور تہذیبی مراکز کا ذکر ہے۔ باب نمبر چہارم ۳۵۵ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں سومرو خاندان، حکومت، اس دور کی عشقیہ داستانیں اور آخر میں متعلقہ دور کے بزرگان اور مشائخ عظام کا تذکرہ موجود ہے۔کتاب کے باب پنجم میں ارغون اور ترخان گھرانے کی حکومت اور اس کے ساتھ اس دور کے تمدن اثرات کا بیان ہوا ہے۔باب ششم، بلوچ اور مغلوں کے ذکر سے شروع ہوتا ہے، اسی باب میں کلہوڑا خاندان کے آغازِ حکومت، ان کے حاکموں اور اس دور کی سیاسی حالت پر تبصرہ موجود ہے۔اسی باب میں تالپوروں کے شجرۂ نسب، بلوچ خاندان کے شجرہ، سندھ میں مغربی سیاحوں کی آمد، اس دور کے معاشی حالات اور نظامِ حکمرانی پر مفصل بحث موجود ہے۔باب ہفتم میں تالپوروں کی حکومت، پر اظہارِ خیال اور حکمرانوں کی فہرست دی گئی ہے۔اس باب میں میروں کا مختلف قبائل کا تذکرہ بھی موجود ہے۔اس کے علاوہ انگریزوں کی سندھ میں آمد، شاہ شجاع کی کاہ، خالصوں اور انگریزوں کے جارحانہ اقدامات، انگریزوں کے عہد نامے اور کھوسہ قبائل کی تھر میں مقبولیت کا بیان اور آخر میں میر مراد علی خان کی وفات کے تذکرے پر باب کا اختتام ہوتا ہے۔آخری باب ہشتم میں انگریزوں کا جنوبی ایشیا پر قبضے کا تذکرہ، میروں کی شکست سے متعلق مفصل بحث اور آخر میں میروں کے دورِ حکومت کی ثقافتی خدمات کو اجاگر کیا گیا ہے اور اسی پر اس کتاب کا اختتام ہوتا ہے۔

آٹھ ابواب پر مشتمل یہ کتاب نہایت کارآمد اور مفید معلومات کا مجموعہ ہے جو سندھ کے اہل ذوق اور مورخین کے لیے بھی کسی خزانے سے کم نہیں یقیناً یہ کتاب آنے والے محقق کے لیے اہم قرار پائے گی۔[۱۰]

کتاب ''جنت السندھ'' تاریخ کے موضوع پر ایک شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے، جو کہ سندھ میں رہنے والے لوگوں کے لیے ایک تاریخی مادہ ہے۔[۱۱] مولائی شیدائی جو کہ اپنے حلقۂ احباب میں ایک نہایت ہر دل عزیز اور پسندیدہ شخصیت کے طور پر جانے جاتے تھے، آپ کے علمی مقام کی اہمیت کے پیش نظر پیر حسام الدین راشدی جو کہ خود بھی سندھ کے مشہور محقق رہے ہیں، نے اپنی تمام تحقیقی وعلمی خدمات کو

مولائی شیدائی کے نام سے موسوم کیا ہے۔[۱۲]

الغرض یہ مقالہ مولائی شیدائی کے تعارف پر مشتمل ہے جس میں ان کی تصنیف ''جنت السندھ'' کی روشنی میں ان کے علمی وادبی کردار کو پیش کیا گیا ہے۔ جس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اردو داں طبقے سے آپ کو متعارف کرایا جائے تا کہ وہ سندھ کی اس عظیم علمی شخصیت کے کاموں سے آگاہ ہوسکیں۔ اس حوالے سے یہ پہلا قدم ہے جس سے تحقیق کی مزید راہیں کھلیں گی اور بکھرا ہوا مواد گردش زمانہ کی نذر ہونے سے محفوظ ہو سکے گا۔

حواشی:

۱۔ بروہی، اللھنو ر، ''سکھر کے ہندو مسلمان بزرگ اور مولائی شیدائی حیات''، مولائی شیدائی اکیڈمی، سکھر، ۲۰۰۷ء، ص ۶۵۔
۲۔ عبدالمجید میمن سندھی، ''مولائی شیدائی ایک زندہ دل دوست اور عظیم مؤرخ'' سوانح حیات رحیم دادخان مولائی شیدائی، مصنف اللھنو ر بروہی، ۲۰۰۷ء، ص ۴۳۔
۳۔ مولائی شیدائی، دیباچہ ''تاریخ تمدن''، انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی، سندھ یونیورسٹی، جام شورو۔
۴۔ شوکت خواجائی، ''رحیم دادخان مولا شیدائی''، مصنف ماہانہ السندھ، شمارہ ۱۰۳، مارچ۔جون ۲۰۰۵ء، ص ۵۲۔
۵۔ اللھنو ر بروہی، ''سوانح حیات رحیم دادخان مولائی شیدائی'' مولانا شیدائی اکیڈمی، سکھر، ۲۰۰۷ء، ص ۳۰۔
۶۔ شوکت خواجائی، ''رحیم دادخان مولا شیدائی''، مصنف ماہانہ السندھ، شمارہ ۱۰۳، مارچ۔جون ۲۰۰۵ء، ص ۵۲۔
۷۔ اللھنو ر بروہی، ''سکھر کے ہندو مسلمان بزرگ اور مولائی شیدائی کی سوانح حیات''، مولائی شیدائی اکیڈمی، سکھر، ۲۰۰۷ء، ص ۲۷۔
۸۔ مولائی شیدائی، دیباچہ ''جنت السندھ''، سندھیکا اکیڈمی، کراچی۔ ۲۰۰۸ء، ص ۶۔
۹۔ ڈاکٹر انور فگار ہکڑو، علامہ قاسمی کے ہم عصر علما و مورخین، علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی چیئر، سندھ یونیورسٹی، جام شورو۔ ۲۰۰۸ء، ص ۲۰۱۔
۱۰۔ مولانا غلام محمد گرامی، تبصرہ ''جنت السندھ''، سہ ماہی مہران، شمارہ ۱، ۱۹۸۵ء، ص ۲۰۰۔
۱۱۔ علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی، ''ایسا شان وشعور''، علامہ غلام مصطفیٰ کے الرحیم میں لکھے ہوئے ایڈیٹوریل، علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی چیئر، سندھ یونیورسٹی، جام شورو، ۲۰۰۵ء، ص ۱۲۹۔
۱۲۔ سید حسام الدین راشدی، ''وہ......دن وہ'' جی ایم سید اکیڈمی، ساہٹت گھر، حیدرآباد، ۲۰۰۵ء، ص ۳۵۔

فہرستِ اسنادِ محوّلہ:

۱۔ بروہی، اللھنو ر: ۲۰۰۷ء، ''سکھر کے ہندو مسلمان بزرگ اور مولائی شیدائی کی سوانح حیات''، مولائی شیدائی اکیڈمی، سکھر۔
۲۔ بروہی اللھنو ر: ۲۰۰۷ء ''سوانح حیات رحیم دادخان مولائی شیدائی'' مولانا شیدائی اکیڈمی، سکھر۔
۳۔ خواجائی، شوکت: ۲۰۰۵ء ''رحیم دادخان مولا شیدائی''، مصنف ماہانہ السندھ، شمارہ ۱۰۳۔
۴۔ راشدی، حسام الدین، سید: ۲۰۰۵ء ''وہ......دن وہ'' جی ایم سید اکیڈمی، ساہٹت گھر، حیدرآباد۔
۵۔ شوکت خواجائی، ''رحیم دادخان مولا شیدائی''، مصنف ماہانہ السندھ، شمارہ ۱۰۳۔
۶۔ شیدائی، مولائی: س ن، دیباچہ ''تاریخ تمدن''، انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی، سندھ یونیورسٹی، جام شورو۔
۷۔ ______: ۲۰۰۸ء، دیباچہ ''جنت السندھ''، سندھیکا اکیڈمی، کراچی۔
۸۔ قاسمی، غلام مصطفیٰ، علامہ: ۲۰۰۵ء ''ایسا شان وشعور''، علامہ غلام مصطفیٰ کے الرحیم میں لکھے ہوئے ایڈیٹوریل، علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی چیئر، سندھ یونیورسٹی، جام شورو۔
۹۔ گرامی، غلام محمد، مولانا: ۱۹۸۵ء، تبصرہ ''جنت السندھ''، سہ ماہی مہران، شمارہ ۱۔
۱۰۔ ہکڑو، انور فگار، ڈاکٹر: ۲۰۰۸ء ''رحیم داد مولائی شیدائی''، علامہ قاسمی کے ہم عصر علما و مورخین، علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی چیئر، سندھ یونیورسٹی، جام شورو۔

رفتارِ تحقیق

[شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، برائے سال جولائی تا دسمبر ۲۰۱۷ء]

☆ درج ذیل اسکالروں کا موضوع ایم فل کے لیے منظور ہو گیا ہے۔

نگرانِ مقالہ: ڈاکٹر رفیق احمد خان

۱۔ **فضل کریم**

لیکچرر اُردو۔

مقالہ بعنوان: ''بلوچی افسانوں کے اردو تراجم: فنی اور لسانی مطالعہ''

تاریخ: ۲۶ر ستمبر ۲۰۱۷ء۔

۲۔ **اللہ دتہ کھوسو**

لیکچرر اُردو۔

مقالہ بعنوان: ''اردو ادب میں دبستانِ وارثی: کراچی کی ردیفی نعتیہ خدمات''

تاریخ: ۲۶ر ستمبر ۲۰۱۷ء۔

۳۔ **محمد احمد**

لیکچرر اُردو، گورنمنٹ ڈگری بوائز کالج، کیماڑی، کراچی۔

مقالہ بعنوان: ''مجلّہ ''الزبیر میں شائع ہونے والے قارئین کے خطوط: تدوین، تحقیق، حواشی و تعلیقات''

تاریخ: ۲۰ر اکتوبر ۲۰۱۷ء۔

۴۔ **آنسہ فلک**

مقالہ بعنوان: ''رسالہ ''معارف'' میں سرمایۂ مکتوبات کا تجزیاتی مطالعہ'' (۱۹۱۶ء تا ۱۹۶۶ء)

تاریخ: ۱۳ر نومبر ۲۰۱۷ء۔

۵۔ **آنسہ شبنم**

مقالہ بعنوان: رسالہ ''معارف'' میں سرمایۂ مکتوبات کا تجزیاتی مطالعہ'' (۱۹۶۷ء تا ۲۰۱۶ء)

تاریخ: ۱۳؍نومبر ۲۰۱۷ء۔

نگرانِ مقالہ: ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال

۶۔ **نیر امین**

لیکچرار اردو، گورنمنٹ ڈگری بوائز کالج، کوہسار، لطیف آباد، حیدر آباد

مقالہ بعنوان: ''فرہنگ موضح القرآن کی تشکیل: تحقیق، حواشی و تعلیقات''

تاریخ: ۱۰؍اکتوبر ۲۰۱۷ء۔

۷۔ **صفدر علی**

مقالہ بعنوان: ''باغ و بہار کی فرہنگ: تشکیل، تحقیق، حواشی و تعلیقات''

تاریخ: ۱۰؍اکتوبر ۲۰۱۷ء۔

۸۔ **سائرہ خان**

آرمی پبلک اسکول اینڈ کالج سسٹم، کینٹ حیدر آباد۔

مقالہ بعنوان: ''ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی اردو خدمات: تحقیقی مطالعہ''

تاریخ: ۱۰؍اکتوبر ۲۰۱۷ء۔

۹۔ **آنسہ نسیم عالم**

لیکچرار اُردو، ورکرز انٹرمیڈیٹ گرلز کالج (کوٹری) جام شورو، سندھ۔

مقالہ بعنوان: ''ڈاکٹر غلام مصطفے خان کی اردو نثر نگاری کا تجزیاتی مطالعہ''

تاریخ: ۲۰؍اکتوبر ۲۰۱۷ء۔

۱۰۔ **عظمیٰ سعید**

ہیڈ مسٹریس گورنمنٹ پرائمری اسکول، لطیف آباد نمبر ۶، حیدر آباد۔

مقالہ بعنوان: ''فرہنگ مراثیِ جوشؔ: تشکیل، تحقیق، حواشی و تعلیقات''

تاریخ: ۲۰؍اکتوبر ۲۰۱۷ء۔

۱۱۔ **محمد ارشاد**

لیکچرر اُردو، پریسٹن بوائز کالج، جی او آر، حیدر آباد۔

مقالہ بعنوان: ''فرہنگِ قطب مشتری: تشکیل، تحقیق، حواشی و تعلیقات''

تاریخ: ۲۰را کتوبر ۲۰۱۷ء۔

۱۲۔ **آنسہ شفقت آرا**

گورنمنٹ گرلز ہائر سیکنڈری اسکول، شاہ پور چاکر، سانگھڑ۔

مقالہ بعنوان: ذخیرۂ ''نقوش میں رفیق احمد مارہروی کے نام جگر بریلوی کے غیر مطبوعہ خطوط: تدوین، حواشی اور تعلیقات

تاریخ: ۱۳رنومبر ۲۰۱۷ء۔

۱۳۔ **ایاز علی جراح**

لیکچرر انگریزی، شہید بے نظیر بھٹو یونیورسٹی، نواب شاہ۔

مقالہ بعنوان: ''ذخیرۂ نقوش' میں محمد طفیل کے نام شاہد احمد دہلوی کے غیر مطبوعہ خطوط: تدوین، حواشی اور تعلیقات''

تاریخ: ۱۳رنومبر ۲۰۱۷ء۔

۱۴۔ **شہزاد عالم**

لیکچرر اُردو، گورنمنٹ ڈگری کالج اینڈ پوسٹ گریجویٹ سینٹر، لطیف آباد نمبر ۱۱، حیدر آباد۔

مقالہ بعنوان: ''فرہنگِ صنم خانۂ عشق: تشکیل، تحقیق، حواشی اور تعلیقات''

تاریخ: ۱۳رنومبر ۲۰۱۷ء۔

تعارف اور تبصرے

(۱)

نام مجلّہ : ''اُردونامہ''، خصوصی شمارہ (شان الحق حقی) جشن صد سالہ

مدیرِ اعلیٰ : سیّد عقیل عباس جعفری

ضخامت : ۶۴ صفحات

قیمت : ۱۰۰ روپے

ناشر : اُردو لغت بورڈ، کراچی

مبصر : ڈاکٹر شاہ انجم، ایسوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، حیدر آباد

زیرِ تبصرہ مجلّہ ''اُردونامہ''، اُردو لغت بورڈ (ترقی اُردو بورڈ) کا سہ ماہی جریدہ تھا۔ مدیرِ مجلّہ کے مطابق اس کا پہلا شمارہ اگست ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا، جو اپریل ۱۹۷۷ء تک جاری رہا۔ اسے شان الحق حقی نے جاری کیا تھا، جو آپ کے رخصت ہوتے ہی بند ہو گیا۔ اس جریدے کے سترہ سال کے ۵۴ شماروں کا اشاریہ ۱۹۷۷ء میں شائع کیا گیا تھا۔ ۲۰۱۷ء میں جب شان الحق حقی کی پیدائش کا جشن صد سالہ منایا جا رہا ہے تو اُردونامے کا دوبارہ اجرا کیا گیا ہے۔ اس شمارے کو گزشتہ دور کا تسلسل سمجھتے ہوئے شمارہ: ۵۵ کا نام دیا گیا ہے۔

زیرِ تبصرہ شمارے میں درج ذیل اہم مضامین شریک اشاعت ہیں:

- ☆ شان الحق حقی اور اُردو لغت بورڈ — ڈاکٹر عرفان شاہ
- ☆ اردو لغات کا تذکرہ — ڈاکٹر مولوی عبدالحق
- ☆ دانش گاہ فکر و قلم — جوش ملیح آبادی
- ☆ قاموس الہند — ڈاکٹر رؤف پاریکھ
- ☆ اردو لغات میں اِملا کی وضاحت — ڈاکٹر نذیر آزاد (بھارت)

یوں تو زیرِ نظر شمارے میں شریک تمام مضامین اہم ہیں مگر ڈاکٹر رؤف پاریکھ صاحب کا مقالہ لغات سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے بہت ہی اہم اور حیران کن معلومات پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالے ''قاموس الہند، پچپن جلدوں پر محیط اردو کا نادر لغت، تعارف اور چند مغالطّوں کا ازالہ'' کے عنوان سے بتایا ہے کہ '' یہ ایک بسیط اور کثیر جلدی اردو بہ اردو لغت ہے، لیکن اس کے مؤلف راجا راجیسور راؤ اصغر کے دنیا سے جانے کے طویل عرصے بعد بھی غیر مطبوعہ ہے۔ پچپن جلدوں پر محیط اس کا واحد قلمی نسخہ کراچی یونی ورسٹی کے مرکزی کتب خانے میں موجود ہے۔''

ڈاکٹر رؤف پاریکھ صاحب نے اس لغت کا اور صاحبِ لغت کا بڑے جامع انداز میں تعارف پیش کیا ہے۔ آپ نے اس کے بابت پائی جانے والی چند غلط فہمیوں کا صرف تذکرہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کا ازالہ بھی فرمایا ہے۔ علاوہ ازیں اس بات کی بھی تحقیق فرمائی ہے کہ یہ جہازی قامت کی پچپن جلدیں ہندوستان سے پاکستان کب اور کیسے پہنچیں؟ اور کون صاحب انھیں یہاں لائے اور یہ جامعہ کراچی کے کتب خانے میں کس طرح پہنچی؟ آخر میں ''قاموس الہند: ایک مختصر تنقیدی جائزہ کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب نے اجمالاً مگر جامع انداز میں اس لغت کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اس کے اندراجات کی کیفیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

دیگر تحریروں میں ڈاکٹر عرفان شاہ کا مقالہ بھی اہم ہے۔ جو دراصل ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا ایک باب ہے۔

جوش ملیح آبادی کا نادر مضمون بھی بہت اہم اور تاریخی نوعیت کا حامل ہے۔ یہ پہلے اردو نامہ کے شمارہ:۳ میں شائع ہوا تھا، اب اسے مکرر چھاپا گیا ہے۔

بابائے اردو کا مقالہ: ''اردو لغات کا تذکرہ'' نہایت اہم ہے۔ یہ بھی ماہانہ ''نگار'' ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں شریک ہو چکا ہے۔ اب مکرر شائع کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر نذیر آزاد کا مقالہ ''اردو لغات میں املا کی وضاحت'' بھی خوب ہے جو ان کی کتاب ''اردو لغت نگاری کا تنقیدی جائزہ'' سے نقل کیا گیا ہے۔

آخر میں سیّد عقیل عباس جعفری اور ان کے تمام رفقائے اردو لغت بورڈ کو اس اہم مجلّے کے دوبارہ اجرا پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے امید رکھتے ہیں کہ یہ اپنے روشن ماضی کی طرح مستقبل میں بھی نمایاں خدمات انجام دے گا۔

(۲)

نام مجلّہ : صحیفہ (مکاتیب نمبر حصّہ دوم) شمارہ ۲۲۸۔۲۲۹، جنوری تا جون ۲۰۱۷ء

مدیر : افضل حق قریشی۔

ضخامت : ۶۲۰ صفحات۔

قیمت : ۵۸۰ روپے۔

ناشر : مجلس ترقی ادب، ۲۔ کلب روڈ، لاہور۔

''صحیفہ'' کا زیر تبصرہ شمارہ ۲۲۸۔۲۲۹، مکاتیب نمبر حصّہ دوم کے عنوان سے ترتیب دیا گیا ہے۔ پہلے شمارے کی طرح اس میں بھی نہایت قیمتی مکاتیب جمع کیے گئے ہیں۔ مشاہیر کے ۴۵۸ مکتوبات (ایک خط مکرر شائع ہو گیا ہے) کے توسط سے بیش قیمت

تاریخی، تہذیبی، مذہبی اور علمی و ادبی معلومات نذر قارئین کی گئی ہیں۔ یہاں مثالاً چند نام درج کیے جاتے ہیں تا کہ قارئین کو ان خطوط کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

امیر مینائی بنام مرزا داغ دہلوی، رتن ناتھ سرشار، ریاض خیر آبادی، ڈاکٹر مختار الدین احمد بنام محمد اقبال مجددی۔ مشفق خواجہ بنام یونس جاید، ڈاکٹر حمید اللہ بنام پروفیسر خورشید احمد، حکیم محمود احمد برکاتی بنام ضیاء الدین لاہوری، مولانا حامد علی خان بنام محمد احسن خان، مولانا امتیاز علی عرشی بنام مولانا حامد علی خاں، عبدالعزیز خالد بنام ارشد محمود ناشاد، وارث سرہندی بنام سلیم الرحمٰن، عبدالمجید قریشی بنام سیّد کشفی شاہ نظامی وغیرہم۔

یوں تو تمام مکاتیب ہی بہت اہمیت کے حامل ہیں مگر عبدالمجید قریشی کے خطوط کا مجموعہ اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ محمد ارشد صاحب نے جس جامع اور تحقیقی انداز سے طرفین کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان خطوط کو نذر قارئین کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ آپ کے تحریر کردہ تعارف سے چند سطور اقتباس کی جاتی ہیں جس سے پیش کردہ مواد کی اہمیت بخوبی اُجاگر ہوتی ہے:

> ''بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں مسلمانان پاک و ہند نے ہندو انتہا پسند تنظیموں سنگھٹن اور شدھی کے مقابلے اور اپنے دینی وملی تشخص کے تحفظ و بقا کے لیے جو تحریکیں برپا کیں ان میں۰۰۰عبدالمجید قریشی وکشفی شاہ نظامی کی سیرت کمیٹی بطور خاص قابل ذکر ہے۔''

مقالہ نگار نے بتایا ہے کہ سید محمد اشرف کشفی شاہ نظامی (۱۸۹۷ء۔ ۱۹۷۶ء) خواجہ حسن نظامی کے مرید اور برما کی جماعت نظامیہ کے امیر تھے۔ ان خطوط کے تعارف سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ سیرت کمیٹی کے پروگرام اور سرگرمیوں سے علامہ اقبال نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے بلکہ ''اسے اسلامیانِ ہند کے لیے بہت مبارک خیال کرتے تھے۔ سیّد سلیمان ندوی، سیّد ابوالحسن علی ندوی اور ڈاکٹر حمید اللہ جیسے مشاہیر علماء نے سیرت کمیٹی کی خدمات کی دل کھول کر تحسین کی اور تحریک سیرت کو برعظیم پاکستان و ہند کی ایک اہم دینی تحریک قرار دیا۔''

الغرض عالمی یوم میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس تحریک نے بیس برس تک وحدت ملی کے قیام کے لیے جو مخلصانہ اور قائدانہ سعی پیہم انجام دی اس کی تاریخی رُوداد ان رقعات میں محفوظ ہیں۔

علاوہ ازیں مولانا غلام رسول مہر کے نام ڈاکٹر جاوید اقبال کے چودہ اہم خطوط بھی مولانا کے صاحب زادے جناب امجد سلیم علوی نے اپنے قیمتی حواشی کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ زیادہ تر خطوط تو ڈاکٹر جاوید اقبال کے قیام کیمبرج کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں جب وہ اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ بہ عنوان: ''ہندو پاکستان میں اسلامی فلسفۂ سیاست کا ارتقاء'' (The development of Muslim Political Philosophy in indo-Pakistan) مرتب کر رہے تھے۔ ان خطوط سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ کس طرح قدم قدم پر ڈاکٹر جاوید اقبال مولانا مہر سے رہنمائی کے طالب ہیں۔ کبھی تحقیقی مواد کے لیے

فرمائش کرتے ہیں اور کبھی بحث و تجزیے کے سلسلے میں مشورے کے طالب دکھائی دیتے ہیں اس سلسلے میں کہیں ان سے اختلاف بھی کرتے نظر آتے ہیں مثلاً ڈاکٹر جاوید لکھتے ہیں: ''آپ فرماتے ہیں کہ سیّد صاحب کی تحریکِ جہاد اصل میں انگریزوں کے خلاف تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ صرف سکھوں کے خلاف تھی۰۰۰ اگر آپ کے پاس اس قسم کے تحریری ثبوت موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیّد صاحب کی تحریک جہاد اصل میں انگریزوں کے خلاف تھی تو مہربانی کر کے انھیں نقل کرا کے مجھے ارسال کیجیے گا تا کہ یہ غلط فہمی دور ہو جائے۔''

الغرض ان خطوط کے مطالعے سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ مولانا مہر بہ پاس خاطر علامہ اقبال ان کے فرزند گرامی سے نہ صرف یہ کہ حد درجہ شفقت و رافت سے پیش آتے بلکہ عملی تعاون کرتے ہوئے ان کے مطالبات بھی پورے کرتے نظر آتے ہیں۔

صحیفہ کی اس مفید اشاعت پر مجلس ترقی ادب اور اس کے تمام اراکین و معاونین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ پروف کے حوالے سے چند مقامات کے سوا شکایت نہیں ملتی۔ دو ایک مثالیں پیش کرتا چلوں مثلاً جگت موہن لال رواں کے مکتوب میں مقام کا نام غلط لکھا ہے۔''اُوناؤ'' بجائے اُناؤ کے۔ اسی طرح صفحہ ۳۹ پر ''محبوب'' بجائے ''مجوب'' کے درج ہے۔ یگانہ چنگیزی کا ایک خط ۱۷ر ستمبر ۱۹۲۸ء مکرر شائع ہو گیا ہے۔ لیکن اتنے بڑے کام میں ایسے چند سہوِ کتابت کا رہ جانا کچھ اچنبھے کی بات نہیں۔

آخر میں کتابوں پر تبصرے ہیں اور پھر کچھ نادر و نایاب خطوط کے عکس بھی طبع کیے گئے ہیں۔ جس کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ بعض مشاہیر کے خطوط ان کی لکھائی یا انداز تحریر میں بھی محفوظ ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ شمارہ علمی و ادبی دنیا کے لیے واقعی ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔